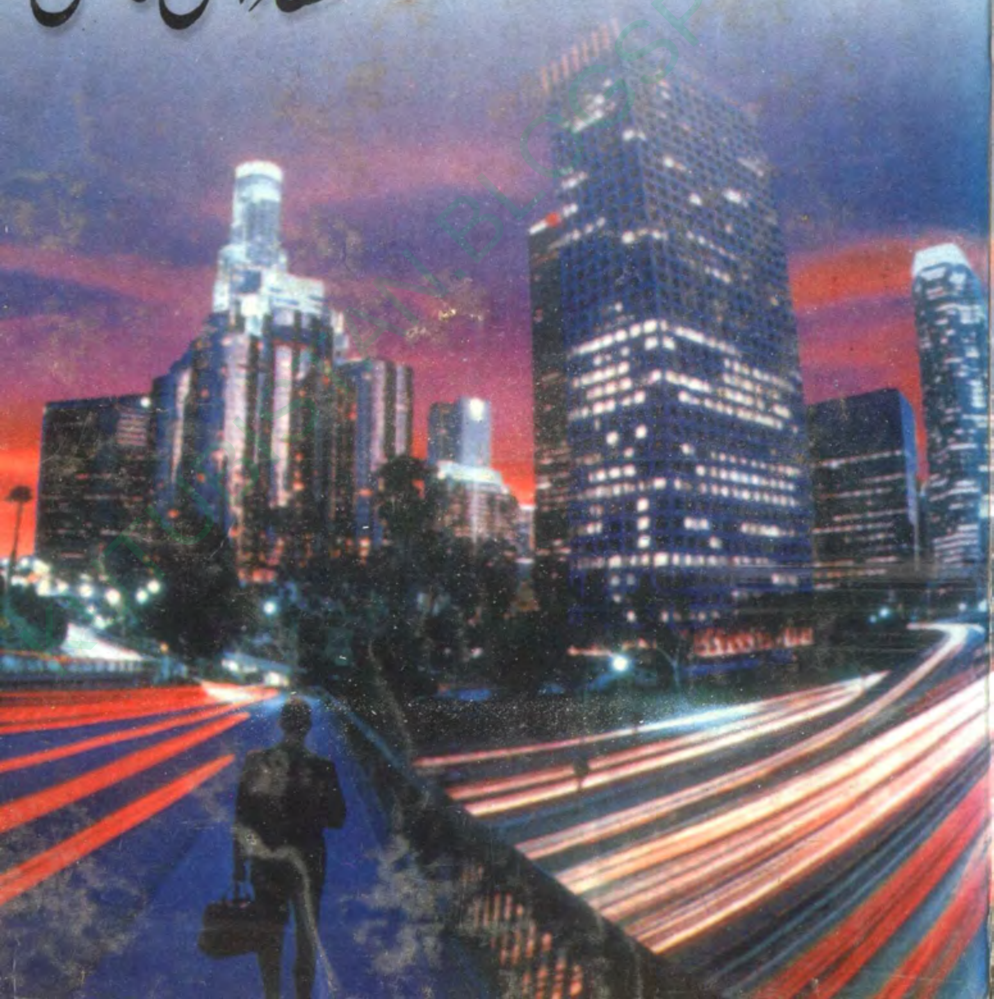
# شوقِ آوارگی

عطاء الحق قاسمی



# فہرست

# میں اور شوقِ آوارگی

## (تازہ اڈیشن)

اگر آپ سچی بات پوچھیں تو سفر میں بہت مزہ ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ سفر بے سر و سامانی کے عالم میں کیا جائے یعنی اس میں انگریزی والا Suffer بھی شامل ہو۔ میں جب ۱۹۷۰ء میں عازم امریکا ہوا تو میری جیب میں کل سات ہزار روپے تھے اور یہ جیب خرچ کے طور پر نہیں تھے بلکہ اس میں نہ صرف یہ کہ کرائے کے اخراجات بھی شامل تھے بلکہ امریکہ پہنچنے کے بعد تین چار مہینے کا خرچہ بھی انہی پیسوں سے چلانا تھا۔

اس کے علاوہ دورانِ سفر پیسوں کی حفاظت بھی بہت ضروری تھی چنانچہ میں نے ایک چمڑے کی بیلٹ تیار کرائی جس کی جیب میں رقم اور پاسپورٹ وغیرہ رکھ کر یہ بیلٹ پینٹ کے نیچے باندھتا تھا تاکہ چور سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالے' اتنی احتیاط کے باوجود' میں کسی خضر صورت بزرگ کو دیکھتا تو ہاتھ فوراً بیلٹ پر جا پڑتا کیونکہ مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ ترکی کے کسی گاؤں میں زمین پر کپڑا بچھا کر بیٹھ جاؤں اور آوازیں لگانا شروع کر دوں کہ میرے مسلمان بھائیو! میں مسافر ہوں۔ اور اس کے جواب میں بقول فاروق قیصر کسی ستم ظریف سے یہ سننا پڑے کہ میں کیا کروں اگر تم مسافر ہو' میں کوئی بس تو نہیں ہوں!

میں نے سفر کے لیے بے سر و سامانی کی جو شرط عائد کی ہے' اس کی ایک شق یہ بھی ہے کہ انسان غیر شادی شدہ ہو چنانچہ جب میں سفر پر روانگی کی تیاریوں میں مصروف تھا' والدِ ماجد نے مجھے ایک دن اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ میں تمہارے امریکا جانے کے حق میں نہیں ہوں' لیکن اگر تم شادی کرا لو تو پھر ٹھیک ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس صورت میں' میں امریکا جانے کے حق میں نہیں ہوں۔ میری ضد مان لی گئی' چنانچہ میرا سفر بہت خوشگوار گزرا کہ اس صورت میں سیاح کو نہ بیوی یاد آتی ہے نہ بچے یاد آتے ہیں۔ وہ سفر کی دھن میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا' سفر میں اگر پیچھے مڑ کر دیکھا جائے تو انسان پتھر کا ہو کر رہ جاتا ہے!

ایک اور چیز جو سیاحت کے کباب میں ہڈی بنتی ہے وہ سیاح کا رستوں اور مقامات

سے بہت زیادہ باخبر ہوتا ہے۔ میں جب امریکہ کے لیے روانہ ہوا اس سے پہلے میں نے صرف ایک سفر تنہا کیا تھا اور وہ بابو ٹرین میں لاہور سے وزیر آباد تک کا تھا اور اس کے لیے بھی مجھے ایک ہفتے تک ہدایات دی گئیں کہ رستے میں کسی اسٹیشن پر نہیں اترنا' دروازے میں کھڑے نہیں ہونا' کھڑکی میں سے سر باہر نہیں نکالنا' کسی مسافر سے کوئی چیز لے کر نہیں کھانی اور زنانہ ڈبے کی طرف تو ہرگز نہیں جانا' مگر امریکا تک کے سفر میں مجھے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا' میرے لیے تو اس رستے میں نظر آنے والی تمام چیزیں بالکل نئی تھیں چنانچہ میں حیرت سے ہر چیز کو تکتا تھا۔ بہت سی نامانوس زبانوں والے ملکوں سے گزرتا' رستے بھول جاتا' کھانے پینے تک کی پرابلم ہوتی مگر یہی تو ایک سیاح کی شان ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ میں نے واپسی کا سفر بھی بائی روڈ کیا' اس حیرت' سرخوشی اور سرمستی کے ساتھ جس کے بغیر سیاحت کسی جہلم میں شرکت کے لیے اختیار کیے جانے والے سفر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

متذکرہ سیاحت کی جو کہانیاں آپ مجھ سے سننا چاہتے ہیں۔ وہ میں نے "شوقِ آوارگی" میں جمع کر دی ہیں' کچھ نہیں بھی کیں' اس کے لیے شائقین مجھ سے ٹائم لے کر علاحدگی میں ملیں۔ ویسے میرے نزدیک اس کائنات کی مرکزی شخصیت انسان ہے' اور ظاہر ہے جب میں انسان کہتا ہوں تو اس میں خواتین بھی شامل ہوتی ہیں' چنانچہ میرے سیاحت نامے کا مرکزی کردار بھی انسان ہے' خواہ وہ میونخ کا ہنس مکھ سرمایہ دار اووے نجمن ہو' نیویارک کا منشیات فروش جارج ہو' ٹائم سکائر کا امرد پرست ہو' ومن لبریشن کی حامی یونی ورسٹی کی لڑکی ہو' بابے دی ہائم کا پرویز ہو' استنبول کا محنت کش ہو' یونان کی میریلین اور پیرس کی زولا ہو اور اولڈ پیپلز ہوم میں اپنی موت کا انتظار کرتے ہوئے وہ بوڑھے والدین ہوں جنہیں ان کے مصروف بچے ان اداروں میں جمع کرا کے خود مشینوں کے پہیے بن گئے ہیں۔ چنانچہ میں نے تو اس دنیا کو اس دنیا میں بسنے والوں کے حوالے سے دیکھا ہے' لہٰذا اگر آپ کو "شوقِ آوارگی" میں عمارتوں کا احوال نہ ملے' تاریخ اور جغرافیہ نظر نہ آئے تو میرے سیاحت نامے کے کرداروں سے مل لیں' ممکن ہے وہ آپ کو یہ سب معلومات زیادہ بہتر طریقے سے فراہم کر دیں!

میں امریکہ جاتے ہوئے لاہور سے کابل بذریعہ جہاز' کابل سے لکسمبرگ تک بائی روڈ اور لکسمبرگ سے سینٹ لوئیس تک بذریعہ جہاز گیا تھا۔ واپسی پر میں روٹ تبدیل کر کے



زاہدان کے راستے پاکستان آیا تھا۔ یہ دونوں سفر میں نے کیے بھی مختلف موسموں میں تھے اور یوں ان سب راستوں اور سب موسموں سے میری دوستی ہو گئی۔ میں نے اس دوستی کی روداد اپنے سفر نامے میں بیان کی ہے' بس اتنا ہے کہ بعض مقامات پر کاتب دوست نے کچھ نام الٹ پلٹ کر دیئے ہیں' یعنی کہیں پرویز کو مسعود اور کہیں مسعود کو پرویز کر دیا ہے اور ایک جگہ تین چار لائنیں پیسٹ ہونے سے رہ گئی ہیں جس کے نتیجے میں' میں ڈائریکٹ امریکا پہنچ گیا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی کتاب میں کچھ "مقاماتِ آہ و فغاں" ہیں اور اس میں کاتب یا پیسٹر کا کوئی قصور نہیں۔ میرا بھی کوئی قصور نہیں کیونکہ میں اس وقت ۲۷ سال کا صحت مند نوجوان تھا۔ اورینٹل کالج کے زمانے میں میرا ایک دوست بہت صالح شخصیت کا مالک تھا' مخلوط تعلیم کے اس ادارے میں وہ ہمیشہ نظریں جھکا کر چلتا' بس جس سے ٹکرانا ہوتا' اس سے جا ٹکراتا۔ میں بھی اس زمانے میں بہت صالح نوجوان تھا چنانچہ سفر نامے میں چار پانچ مقامات ایسے آئے جہاں میں بھی نظریں جھکا کر چلتا ہوں اور یہ سوچ کر چلتا ہوں کہ اگے تیرے بھاگ لچھیے!

اور آخر میں ایک ضروری بات' جس دور میں میرا یہ سفر نامہ جناب احمد ندیم قاسمی کے "فنون" میں شائع ہوا وہ میرے صحافتی دور کا آغاز تھا' چنانچہ یہ میری پہلی ادبی تحریر تھی جو میں نے قاسمی صاحب کی شفقت اور ان کی مسلسل حوصلہ افزائی کے نتیجے میں مکمل کی۔ اس زمانے میں ابھی سفر ناموں کی "وبا" بھی نہیں پھیلی تھی چنانچہ قارئین اور نقادوں کے حلقے میں واہ واہ بھی بہت ہوئی مگر جب سفر نامہ وائرس کی طرح پھیلا تو میں نے دیکھا کہ لوگ سفر نامے پڑھتے ہیں اور اس کے بعد اپنے وطن میں ان کا دل ہی نہیں لگتا اور وہ ویزوں کے حصول کے لیے کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل جانا شروع ہو جاتے ہیں' اس خواہش کے پیچھے ہمارا غیر منصفانہ معاشی نظام' کونوینٹ' کیتھڈرل' ایچی سن کالج' امریکن سکولز' طبقاتی اونچ نیچ' خود غرض رویے اور "مور اوور" کے طور پر سفر ناموں کی ترغیب بھی شامل ہے۔ چنانچہ ہوتا یوں کہ یار لوگ "مسلح جدوجہد" کے بعد امیگرنٹ ویزا حاصل کرتے ہیں اور پھر امریکہ یا یورپ میں جا آباد ہوتے ہیں' ہنی مون پیریڈ یعنی ابتدائی زمانہ تو بہت اچھا گزرتا ہے مگر پھر ایک دن یوں ہوتا ہے کہ گھر سے والد یا والدہ کی وفات کی اطلاع ملتی ہے جس نے بیٹے کی شکل دیکھنے کے لیے آخری وقت تک اپنی آنکھیں کھلی رکھیں مگر وہ جنازے کو کاندھا دینے بھی نہ پہنچ سکا۔ اسی طرح ایک دن وہ اپنی بیٹی کے کمرے کا ناک کرتا ہے اور اندر سے آواز آتی ہے "ڈونٹ

ڈسٹرب می پاپا' آئی ایم ود مائی بوائے فرینڈ" پھر ایک دن اسے اپنا کلچر یاد آتا ہے۔ اپنی گلیاں کوچے یاد آتے ہیں' بہن بھائیوں کی شکلیں اور دوستوں کی محفلیں یاد آنے لگتی ہیں۔ اپنے موسم یاد آتے ہیں' اپنے وطن کی ہوائیں یاد آتی ہیں' اپنی زبان کے چسکے یاد آتے ہیں' مگر اس وقت تک صنعتی معاشرے میں اس کی حیثیت موبل آئل سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ خود کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا چنانچہ اسے ہارٹ اٹیک ہوتا ہے اور پھر وہ گوروں کے قبرستان میں یا اس قبرستان میں مسلمانوں کے لیے مخصوص کسی گوشے میں زمین اوڑھ کر سو جاتا ہے۔ میں نے صرف سیاحت نہیں کی۔ میں اس دیکھنے میں خوبصورت مگر اندر سے ہولناک معاشرے میں ڈیڑھ سال رہا بھی ہوں چنانچہ میں اپنے سفرناموں میں یہ عفریت دکھاتا رہتا ہوں کہ میری خواہش ہے ہم اسی معاشرے کو خوبصورت بنائیں جس میں ہم نے اور ہماری آئندہ نسلوں نے اپنی ثقافت اور اپنی روحانی قدروں کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ چنانچہ بہت سے دوسرے سفرناموں کی طرح میرے سفرناموں میں بھی یہ پہلو اوجھل نہیں ہوا۔

میں ۱۹۷۱ء میں سبز کارڈ ہی نہیں سبز آنکھیں بھی اداس چھوڑ کر وطن واپس آگیا تھا کہ مجھے وہاں کے خوبصورت گورے قبرستان میں کسی امریکی بوڑھے کے پہلو میں دفن ہونا پسند نہیں تھا۔ میں تو ماڈل ٹاؤن کے گندے مندے قبرستان میں اپنے والد اور اپنی والدہ کے پہلو میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔ میرے لیے میری مٹی سب کچھ ہے! مجھے اس میں سے درود و سلام کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔

عطاء الحق قاسمی
۴۵۲۔ جہانزیب بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور



# لاہور...... جنوری 70ء

15 جنوری 1970ء کی ٹھٹھرتی ہوئی صبح کو مجھے اور مسعود کو، امریکہ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ میں نے اور مسعود نے سفر کے تمام انتظامات کر لیے تھے۔ گھر میں اباجی تھے اور باجی ابھی سے اداس ہو گئے تھے اور وہ آخری لمحے تک روکنے کی کوشش کرتے رہے، مگر میں اپنی ہٹ پر اڑا رہا، مسعود پر بھی بہت پریشر پڑ رہا تھا۔ اسے یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ ایک مہینے کے اندر اندر تمہیں پسند کی نوکری دلا دی جائے گی۔ گو اس کا کہنا تھا کہ اب وہ اس جھانسے میں نہیں آئے گا۔ مگر اس کا رویہ ہمیشہ کی طرح ابھی ڈھلمل تھا۔ تاہم میں نے اس کی طرف جانا ترک کر دیا تھا۔ اور وہ میری طرف نہیں آتا تھا کیونکہ دونوں کے والدین اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے بیٹے کو "خراب" کرنے والا دوسرا فریق ہے۔ چنانچہ ہم دونوں باہر کہیں ملتے اور پھر ہمیشہ کی طرح گھنٹوں اداس رستوں پر بلا مقصد گھومتے رہتے۔ میں نے اپنا ہونڈا فروخت کر دیا تھا۔ حیدر آباد جا کر ضیاء بھائی جان سے بھی مل آیا تھا اور کچھ رقم بھی ان سے بٹور لی تھی۔ اباجی نے بھی آخری وقت میں اپنی ساری پونجی میرے حوالے کر دی تھی اور اب صرف کوچ کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا، مگر سب کچھ ہو جانے کے باوجود دل کو یقین نہیں آتا تھا کہ ان دیکھے رستوں کا سفر قریب آگیا ہے!

دو روز پیشتر میں نے مسعود کو فون کیا کہ میں برف خانے کے چوک میں ہمشیرہ سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔ سو وہ گاڑی لے کر ماڈل ٹاؤن پوسٹ آفس کے قریب پہنچ جائے۔ بیس پچیس منٹ میں وہ اپنی سفید فیٹ میں وہاں موجود تھا۔ میں نے اگلا دروازہ

کھولا اور نرم نرم سیٹ میں دھنس گیا- مسعود نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور ماڈل ٹاؤن میں بس سٹاپ، پاکستانی چوک اور "جے" بلاک سے ہوتے ہوئے فیروز پور روڈ کی طرف ہو لیا- اچھرے کے قریب پہنچتے پہنچتے ٹریفک کی بے اعتدالیوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا اور ہر بار مسعود کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑتا مگر مجھے آج نہ جانے یہ سب کچھ کیوں برا نہیں لگ رہا تھا- میں بچوں کی طرح کھڑکی سے گردن باہر نکالے ریڑھیوں، تانگوں، گدھوں، سائیکلوں، سکوٹروں، بھینسوں اور انسانوں کے بھنور کو محویت سے دیکھنے میں مصروف تھا- نفسا نفسی کا وہ عالم تھا کہ لگتا تھا روز محشر کی ریہرسل ہو رہی ہے- دیواریں اشتہاروں اور تحریروں سے پُر تھیں- قوت مردمی کی بحالی کے لئے، سوزاک اور آتشک کے علاج کے لئے، خارش دور کرنے کے لئے اور قسمت کا حال وغیرہ جاننے کے لئے بے شمار پتے درج تھے- اکثر جگہوں پر لکھا تھا "دیکھو گدھا پیشاب کر رہا ہے" یہاں جلسوں کے اعلانات تھے- جلسوں کی اپیل تھی، آمریت مردہ باد تھا، عرس تھے اور منٹو پارک میں شاہی دنگل کا اعلان درج تھا- ایک برات گزر رہی تھی، دولہا چہرے پر سہرا سجائے گھوڑے پر بیٹھا تھا اور ایک ننھا منا شہ بالا اسے پیچھے سے تھامے ہوئے تھا- آگے آگے باجے والے تھے اور پیچھے براتی گلوں میں موتیے کے ہار پہنے چلے جا رہے تھے- شمع سینما والی سڑک سے دس بارہ دیہاتی مردوں اور عورتوں کا ایک جلوس آتا دکھائی دیا- وہ سب ننگے پاؤں تھے- ان کے آگے ڈھول والا تھا اور وہ ڈھول کی تال پر دیوانہ وار رقص کر رہے تھے- غالباً ان کی منت پوری ہوئی تھی اور اب وہ شکرانے کے اظہار کیلئے داتا دربار جا رہے تھے-

اب ہم مزنگ چونگی اور ہسپتال سے ہوتے ہوئے گوالمنڈی میں داخل ہو گئے تھے- جہاں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور ریڑھیوں اور چھابڑیوں کی بہتات تھی- "ایروز" سینما کے دروازے پر گامی چھولوں والا اپنی پرات انگھیٹی پر دھرے بیٹھا تھا اور اس کے



گرد گاہکوں کی بھیڑ لگی تھی- بیچ کے باؤجی، گنڈیری پیڑے، کڑکڑ بولدیاں مکھڑے کھولدیاں ریوڑیاں، پیٹھی والے لڈو گرم، اور ایسی بہت سی صدائیں گڈمڈ ہو کر سنائی دے رہی تھیں، ایک پہلوان نما شخص دھوتی کو "منی سکرٹ" بنائے بکرے کو ہانکے چلا جا رہا تھا جسے اس نے گوٹے کناری والے رنگین دوپٹے سے ڈھانپا ہوا تھا- ایک کٹی ہوئی پتنگ فضا میں ڈول رہی تھی اور اسے لوٹنے کے لئے بچے اور کئی بڑے دکانوں سے نکل نکل کر عین سڑک کے بیچ میں جمع ہو گئے تھے- حلوائی کی دکان پر رنگ برنگی مٹھائیاں نیچے سے اوپر کی طرف تھالوں میں سجی ہوئی تھیں اور وہ چوکی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا- برابر والی دکان قصاب کی تھی- ایک کنڈے کے ساتھ ایک بکرا لٹکا ہوا تھا اور قصائی اپنے گندے پاؤں اور بڑھے ہوئے ناخنوں والی انگلیوں میں چھری پھنسائے گاہکوں کے لئے گوشت کاٹ رہا تھا- امرتسری باقرخانیوں اور کلچوں کی دکان پر ایک بڑے سارے کڑاہے میں ایک لڑکا کھڑا اچھل اچھل کر پاؤں سے میدہ گوندھ رہا تھا- ایک ریڑھے میں اناج سے بھری ہوئی بوریاں لدی ہوئی تھیں اور ایک فاقہ زدہ شخص اس میں جتا کھینچے لئے جا رہا تھا-

مسعود نے میری رہنمائی پر برف خانے کے چوک سے دائیں جانب گاڑی موڑلی اور میں اسے نرالے کی دکان کے قریب کھڑا ہونے کا کہہ کر برابر والی تنگ گلی میں چلا گیا- نکڑ پر ایک بوڑھا شخص سگریٹ بیچ رہا تھا اور گاہک سے وصول شدہ سکوں کو ایک آنکھ میچ کر دوسری سے بغور دیکھنے میں مصروف تھا- ایک تھڑے پر دھوتی میں ملبوس ایک شخص بیٹھا تھا اور اس کا ایک ہاتھ خارش کے لئے نہایت قابل اعتراض حالت میں متحرک تھا- ذرا آگے ایک سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا بڑے پیار سے اپنے بوڑھے باپ کے سر میں تیل لگا رہا تھا- کھڑکیوں کے دریچے کھلتے اور بند ہوتے تھے اور ان میں "گلاب کے پھول" ذرا سی جھلک دکھا کر اوجھل ہو جاتے تھے- سامنے سے تیکھے نقوش اور متناسب جسم والی ایک مہترانی ناک پر پٹکا باندھے اور سر پر گندگی کی ٹوکری اٹھائے چلی آ رہی تھی- پاس سے

گزرتے ہوئے نوجوان نے اسے دیکھ کر ایک آنکھ میچی اور بے سری آواز میں ایک فلمی گیت کے بول دہرانے لگا-ایک مکان کے باہر سراج "کھسرا" سر پر اوڑھنی لئے اور مصنوعی جوبن پر تنگ چولی چڑھائے پاؤں میں گھنگرو باندھ رہا تھا-اس کے ساتھ ایک طبلچی اور ہارمونیم والا تھا-ابھی وہ سُر تال ٹھیک کر ہی رہے تھے کہ اوپر سے کسی نے کھڑکی کھولی اور گردن باہر نکال کر افسردہ لہجے میں کہا"اللہ کے بندو، لڑکا نہیں، لڑکی ہوئی ہے"اور اس کے ساتھ ہی اس نے کھڑکی بند کر دی- سراج نے گھنگرو اتار دیے اور "اللہ اس کے نصیب اچھے کرے"کی دعا دیتے ہوئے سر جھکا کر چپکے سے آگے بڑھ گیا-میں غلام حسن رفوگر کی دکان سے ساتھ والی گلی میں مڑ گیا- آپی کے مکان کا دروازہ کھلا تھا، میں اندر داخل ہوا تو انہوں نے بڑھ کر گلے لگا لیا-

"تو تم واقعی جا رہے ہو؟"ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں-

"ہاں"

"مگر آخر کیوں؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا-"

"مگر یہ تو سوچو، ابا جی تمہارے غم میں ہلکان ہو جائیں گے"-

"یہاں میں ان کے لئے کیا کرتا ہوں؟ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے ہیں، میں چاہتا ہوں ایسا نہ ہو، مگر میرے لئے انہیں مکمل طور پر خوش رکھنا ممکن نہیں-شاید باہر رہ کر ان کے بڑھاپے کو زیادہ بہتر طور پر سہارا دے سکوں"-

"اچھا ایک وعدہ کرو"آپی نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا-

"کیا؟"

"تم وہاں کسی میم سے شادی نہیں کرو گے"-

"اچھا نہیں کروں گا"



"اگر تم نے وہاں شادی کر لی تو ہمارے سارے چاؤ دل ہی میں رہ جائیں گے- بہنوں نے تمہیں دولہا بنانا ہے، تمہارے سر پر سہرے دیکھنے ہیں، تم سے"باگ پڑھائی"لینی ہے، ڈھولک بجانے ہیں اور چاند جیسی دلہن گھر میں لانی ہے"آپی جذباتی ہو گئیں-

"اچھا بابا! نہیں کروں گا شادی"! میں نے پیار سے انہیں تھپکی دیتے ہوئے کہا-

اس اثناء میں بھانجے بھانجیاں میرے گرد اکٹھے ہو گئے تھے- مظہر باہر گلی سے بھاگتا ہوا آیا-اور "شہزادہ ماموں" کہہ کر میری ٹانگوں سے لپٹ گیا-اس ایک کمرے کے مکان کے ایک کونے میں چولہا جل رہا تھا اور یہی کونہ باورچی خانہ بھی تھا-میں نے سب بچوں کو باری باری گلے لگا کر پیار کیا اور آپی سے نظریں ملائے بغیر نکل گیا، انہوں نے دوپٹے کا پلو آنکھوں پر رکھا ہوا تھا اور رو رہی تھیں!

---------

ائرپورٹ پر سارے رشتہ دار دوست جمع تھے، گلزار وفا نے ایک بڑی وین کا بندوبست کیا تھا اور ان سب کو یہاں لے کر آیا تھا-ادریس جلو اور باقی کچھ دوست اپنی اپنی کاروں میں آئے تھے-میں کبھی دوستوں اور کبھی عزیزوں کے پاس جا کھڑا ہوتا- تاہم مجھے مسعود کا بڑی شدت سے انتظار تھا، جو ابھی تک نہیں پہنچا تھا- ہم دونوں نے اسی فلائٹ میں امریکہ کیلئے روانہ ہونا تھا-اس کے دوستوں یا رشتہ داروں میں سے بھی کوئی یہاں موجود نہ تھا- اتنے میں وہ مجمع میں دکھائی دیا وہ اکیلا تھا، اس کے ہاتھ خالی تھے اور وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میری طرف آرہا تھا-

"یار! فی الحال نہیں جا سکتا- دو ایک مہینے بعد آؤں گا"-اس نے بجھے ہوئے انداز میں کہا-"مگر کیوں-؟ حیرت سے میری آنکھیں باہر کو نکل آئیں-

"ممّی کہتی ہے، کچھ دیر اور انتظار کر لو، اگر ملازمت کا بندوبست نہ ہو تو پھر بیشک چلے جانا-"!

"تمہاری مرضی!" میں نے بوجھل دل سے کہا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا- اباجی ایک کونے میں افسردہ کھڑے تھے- میں چوروں کی طرح ان کے پاس گیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا- تمام بہنیں برقعے میں لپٹی ان کے پہلو میں موجود تھیں- مائک سے جہاز کی روانگی کا اعلان ہو رہا تھا اور مسافروں سے اپیل کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی اپنی نشستوں پر پہنچ جائیں- اباجی نے آگے بڑھ کر اپنے نحیف ہاتھوں سے مجھے گلے لگا لیا اور اس کے ساتھ ہی وہ آبدیدہ ہو گئے- میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا جہاز کی جانب لے جانے والے گیٹ کی طرف بڑھا- بہنیں آدھا نقاب اٹھا اٹھا کر مجھے دیکھ رہی تھیں- ان کے ہونٹ دعا کے لئے ہل رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں برسات تھی-

اگلے روز میرا جہاز امریکہ کی میسوری سٹیٹ کے صنعتی شہر سینٹ لوئیس پر لینڈ کرنے کیلئے پر تول رہا تھا- میں نے بیگ میں سے عبداللطیف اختر کی تحفتہً دی ہوئی ڈائری نکالی، جس پر لکھا تھا:

"عطاء قاسمی کے لئے، جس کی روح مومن اور جسم کافر ہے"-



# بیک ٹو دی پیو پلین

اور یہ اگست 1971ء کی ایک سہ پہر کا قصہ ہے- سینٹ لوئیس ائر پورٹ پر مالک، اکی، مسعود، خالد اور طارق مجھے الوداع کہنے کے لئے جمع ہیں- میں ہمیشہ کے لئے اپنے وطن پاکستان واپس جا رہا ہوں- میرے یہ بچپن کے دوست لاہور میں بھی میرا قیمتی سرمایہ تھے اور امریکہ میں بھی انہوں نے دوستی کے بندھن پوری طرح نبھائے تھے- میں نے ایک روز بیٹھے بٹھائے فیصلہ کیا کہ مجھے واپس اپنے وطن جانا ہے- میرے یہ دوست میرے اس فیصلے پر بہت بری طرح مضطرب تھے، مگر بالآخر انہوں نے میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے البتہ اس مشورے پر اصرار کیا کہ اگر کبھی واپس امریکہ آنا پڑے تو اسے اپنی انا کا مسئلہ نہ بنانا- میرا پاکستان واپسی کا فیصلہ اتنا اچانک تھا کہ اپنا غیر ضروری سامان صحیح طور پر ڈسپوز آف بھی نہیں کر سکا تھا، چنانچہ میں نے اپنا ٹیلیویژن کوڑے کے ڈبے میں پھینکا، ڈھیر سارے کپڑوں کے دو بڑے بڑے بنڈل "گڈول" کے ڈرم میں ڈالے جہاں سے یہ غریب ملکوں کو بھیج دیے جاتے ہیں اور واپس پاکستان پہنچ کر اپنے مقامی دوستوں کو خبردار کیا کہ وہ کم از کم چھ مہینے تک لنڈے سے کوئی کپڑا نہ خریدیں کیونکہ میں اپنے کپڑوں کو پہچانتا ہوں- کار کی چابی میں نے خالد کو دی کہ جب کار بک جائے تو پیسے مجھے بھجوا دینا- دو مہینے کے بعد اس کا خط آیا کہ پولیس والے یہ کار ایک دن "ٹو" کر کے لے گئے کہ یہ خواہ مخواہ ہر وقت تمہارے گھر کے باہر کھڑی رہتی تھی- اس کے علاوہ کچھ "چیزیں" ایسی بھی تھیں، جنہیں "ڈسپوز آف" کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا- ان میں سے

ایک تو میرے نزدیک بہت...... قیمتی تھی مگر زندگی میں جو بڑے فیصلے کیے جاتے ہیں، ان کی قیمت بہرحال ادا کرنی پڑتی ہے!

مجھے یہاں سے لکسمبرگ تک بائی ائر اور پھر پاکستان تک بائی روڈ جانا ہے تاکہ شوق سیاحت میں کوئی کمی نہ رہ جائے- میں امریکہ کے بیشتر شہروں میں گھوم آیا تھا، مگر یہ عجیب اتفاق تھا کہ نیویارک جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، صرف آتے ہوئے اِس کے لگاڈیہ ائرپورٹ پر کچھ دیر کیلئے رکا تھا، چنانچہ میں نے اپنا سامان اگرچہ لکسمبرگ تک کے لئے بک کر دیا ہے مگر مجھے ایک رات نیویارک میں قیام کرنا ہے اور یہ قیام ائر لائن کے ذمے نہیں کہ یہ خاصی فقری ائر لائن ہے!

میری فلائٹ اناؤنس ہو چکی ہے- میں دوستوں سے معانقہ کر کے ڈیپارچر لاؤنج سے جہاز کی طرف جانے لگتا ہوں تو مالک کی آواز آتی ہے- "طاؤو (عطا) اب بھی واپس آجاؤ، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا!" مگر میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں پتھر کا نہ ہو جاؤں! اب جہاز سینٹ لوئیس کی فضا میں پرواز کر رہا ہے اور میں اس شہر کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوں جہاں میں نے اپنی زندگی کے خوب صورت دن گزارے ہیں!

-------



# نیویارک، نیویارک!

بقول شخصے نیویارک اتنا بڑا ہے کہ لکھتے وقت دو دفعہ نیویارک نیویارک لکھنا پڑتا ہے اس وقت کوئی اور "شخصے" ذہن میں نہیں آرہا بقول جس کے نہ صرف یہ کہ سر بفلک عمارتوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے دستار تھامنا پڑتی ہو بلکہ ان معنوں میں بھی دستار تھامنا ضروری ہو جن معنوں میں اپنے دہلی والے میرؔ صاحب نے اسے ضروری قرار دیا ہے-

سینٹ لوئیس سے روانہ ہوتے وقت میں نے اپنا تمام سامان لکسمبرگ تک کے لئے چیک کروا لیا تھا، سو ہاتھ میں صرف ایک بیگ اور ایک کیمرہ تھا البتہ ذہن پر بہت سے بوجھ تھے- کینیڈی ائرپورٹ پر اترتے ہی پیشتر اس کے کہ میں اس کی وسعتوں میں گم ہو جاتا، ایک مرد نیک میری طرف بڑھا- قریب آکر جھک گیا اور بالآخر میرے پاؤں پکڑ لئے- میں نے یہ جانا کہ اس شخص کو میری پیرزادگی کی نسبت کا کہیں سے علم ہو گیا ہے سو چپ ہو رہا کہ اسے ثواب کمانے دو- مگر جب اس نے جوتے کے تسمے کھولنے شروع کئے تو اس کی دیدہ دلیری پر غصہ آیا اور کہا کہ اے گنہگار مخلوق! تو نے پاؤں پکڑ لئے- اب اپنی راہ پکڑ- تس پر اس گستاخ نے نیلی پیلی آنکھیں دکھائیں اور کہا "لگتا ہے تو نے اتنا عمدہ سوٹ خریدا نہیں اٹھایا ہے یا کسی سے مانگ کر پہنا ہے ورنہ جوتوں کی یہ حالت نہ ہوتی- ایک ڈالر کے پیچھے تیرا دم نہیں نکل جائے گا- مجھے دے ایسے چمکا کے دوں گا کہ تجھے اس میں اپنی شکل نظر آئے- اگرچہ راقم الحروف نے آئینے میں اپنی شکل دیکھنے سے حتی

المقدور گریز کیا ہے، مگر یہ سوچ کر اسے جوتے پالش کرنے کی اجازت دے دی کہ اپنے ہم وطنوں کو یہ بتا سکوں کہ میرے جوتے پالش کرنے کے لئے امریکی قوم کے ایک فرد کو کتنی تگ ودو کرنا پڑی!

اس وقت دوپہر کے چار پانچ بجے تھے۔اب مسئلہ یہ تھا کہ رات کو سر چھپانے کی کوئی جگہ تلاش کی جائے مگر جگہ ایسی ہو کہ کھولنے والے نے اسے کاروبار کی نیت سے نہیں بلکہ محض خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر کھولا ہو۔یعنی کرایہ بس برائے نام سا ہی ہو۔سو اتنے میں نظر ایک نہایت شرعی قسم کی وضع قطع کے حامل نوجوان پر پڑی کہ چہرے پر لمبی داڑھی اور سر پر گھنی زلفیں تھیں۔چہرے مہرے سے جمعیت علمائے اسلام کی مجلس شوریٰ کے رکن لگتے تھے۔مگر گلے میں (+) دیکھ کر وہیں ماتھا ٹھنکا اور احساس ہوا کہ یہ تو ناکارہ خلائق ہپی ہے۔سو اس سے مشورہ طلب کیا اور اس نے مشورہ مفت دیا کہ کتابوں کی کسی دوکان میں گھس جاؤ۔وہاں ایک کتاب پڑی ملے گی کہ نام اس کا "پانچ ڈالر یومیہ کا نیویارک ہے۔اس میں ایسی تمام جگہوں کے نام اور پتے دیئے گئے ہیں جہاں پانچ ڈالر یومیہ میں کمرہ کرایہ پر مل سکتا ہے اور ایسے رستورانوں کا پتہ بھی بتایا گیا ہے جہاں آٹا روٹی اور دال مفت والا معاملہ ہے۔اس مرد دانا نے یہ لطیف نکتہ بھی سمجھایا کہ وہاں کھڑے کھڑے کتاب کے ورق الٹو اور ذہن میں ایسے تمام مقامات کے نام اور پتے یاد رکھنے کی کوشش کرو مگر یہ کام برق رفتاری سے ہونا چاہئے ورنہ اس اثنا میں سیلز مین تم تک پہنچ جائے گا اور کتاب تمہارے سر منڈھ دی جائیگی۔انکار کی صورت میں دکان سے کھڑے کھڑے نکال دیئے جاؤ گے۔راقم الحروف نے یہ بات پلے باندھی اور اس کام سے فارغ ہو کر بس سٹاپ پر پہنچا اور کوئنز کے لئے بس پکڑی۔جہاں سے ففتھ ایونیو کو روانہ ہو سکوں اور کوئنز پہنچتے ہی میں "زیر زمین" چلا گیا۔

بہتر ہوگا اگر میں زیر زمین چلے جانے کی ابھی سے وضاحت کر دوں کہ یہاں چند



بڑے شہروں میں بڑھتے ہوئے ٹریفک اور شور کے مسئلہ پر قابو پانے کے ضمن میں ایک تدبیر یہ بھی اختیار کی گئی ہے کہ زیر زمین ٹرینیں چلادی گئی ہیں۔سو ففتھ ایونیو جانے کے لئے راقم الحروف نے تیس سینٹ کا زر کثیر صرف کر کے ٹکٹ خریدا اور زیر زمین ٹرین میں بیٹھ گیا۔زندگی میں اگر خستہ حالی کی کچھ منہ بولتی تصویریں دیکھی ہیں تو اپنے عوام کے بعد یہ ٹرینیں ہیں۔میرے ساتھ والی سیٹ پر بمبئی کے ایک ہندو کہ نام ان کا ویاس تھا اور امریکہ میں پہلا دن، براجمان تھے پلیٹ فارم پر ہی ان سے تعارف ہوا تھا۔اصل تعارف ان کا اس وقت ہوا جب انہوں نے بغیر پلک جھپکائے سامنے بیٹھی ہوئی خاتون کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا۔اس اثناء میں میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ابھی سگریٹ سلگانے ہی کو تھا کہ اس خاتون نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا کہ ٹرین میں سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔میں نے نہایت سعادت مندی سے پیکٹ واپس جیب میں ڈال لیا۔خاتون سے اس ایک لمحہ کی یک طرفہ گفتگو کے دوران میں نے محسوس کیا کہ سامنے بیٹھے ہوئے لالہ ویاس جی نے دو تین دفعہ آنکھیں جھپکائی ہیں، پھر ملی ہیں اور پھر میں نے انہیں بے چینی سے اپنی سیٹ پر پہلو بدلتے دیکھا۔بالآخر تھوڑی دیر بعد انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا اور چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ لا کر سرگوشی کے عالم میں گویا ہوئے "کیا بولتی ہے؟" سوچا ایک عرصے سے "دل بدست آور کہ حج اکبر است" والا مقولہ سنتے آئے ہیں آج اس پر عمل بھی کر دکھاؤ سو کہا "دیوی جی آپ کا پوچھتی تھیں کہ یہ خوبصورت نوجوان کہاں کا ہے؟" یہ سن کر لالہ جی کی باچھیں کھل گئیں۔اگلے سٹیشن پر مجھے اور لالہ جی دونوں کو اترنا تھا۔میں اتر گیا مگر وہ وہیں بیٹھے رہے۔شاید کوئی کام یاد آ گیا ہو، بلاشبہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے عوام کے مسائل ایک ہی جیسے ہیں۔

یہ ففتھ ایونیو تھا۔شام ہو چکی تھی۔مختلف رنگوں کے نیون سائن اور روشنیوں سے

منظر کچھ اس طرح کا ترتیب پاتا تھا- جیسے فضا میں ہولی کھیلی جارہی ہو- لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ادھر سے ادھر کو جاتے تھے- تھوڑی دور چلنے کے بعد نظر ہلٹن ہوٹل کے سائن بورڈ پر پڑی- سوچا اگرچہ مسلمہ طور پر مہنگی جگہ ہے مگر کرایہ چیک کر لینے میں کیا حرج ہے اور کچھ نہیں تو شاید کوئی ہم وطن شناسا ہمیں اندر داخل ہوتے یا باہر نکلتے ہوئے دیکھ لے اور یوں امارت سے مرعوب ہو کر رات کے کھانے پر مدعو کر بیٹھے- بہر حال ڈیسک کلرک ایک یونانی صاحب تھے- یہ امر تحقیق طلب ہے کہ آیا انہوں نے ہمارے چہرے سے افلاس ٹپکتے دیکھا یا وطن عزیز کا حوالہ ہی ان کا دل پسیجنے کے لئے کافی تھا- فرمانے لگے میں تمہیں ایک سستا کمرہ 27 ڈالر میں دے سکتا ہوں- میں نے کہا اے جان ارسطو تو نے جہاں اتنی مہربانی کی وہاں ایک کرم یہ بھی کر کہ مجھے باہر کا راستہ دکھا اور اس کے ساتھ ساتھ کسی ایسے ہوٹل کا پتہ بتا جو میرے شایان شان ہو- سو شخص مذکور نے قلم پکڑا اور کاغذ پر ایک پتہ لکھ کر اپنی جان بخشی کروائی- تھوڑی دیر بعد میں ہوٹل منیجر کے سامنے کھڑا تھا- ہوٹل کے منیجر کا خطاب محض نیویارک سے تعلق رکھنے کے وسیلے سے دیا ہے، ورنہ جیسا حلیہ تھا- اپنے ملک میں ہوتے تو منشی یا زیادہ سے زیادہ منشی جی کہلاتے- بہر حال کرایہ انہوں نے ساڑھے پندرہ ڈالر یومیہ بتایا- ہم نے فوراً دس سے ضرب دے کر اسے پاکستانی روپے میں ڈھالا تو قریباً ایک سو ساٹھ روپے رات کے بنے جبکہ ہوٹل کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی اوقات پانچ ڈالر سے زیادہ نہیں مگر منشی جی المعروف منیجر صاحب نے ہمارے چہرے سے اجنبیت، تھکاوٹ اور جھنجھلاہٹ کے آثار پڑھ لئے تھے سو وہ اسے کم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے- مرتا کیا نہ کرتا، ساڑھے پندرہ ڈالر ان کی ہتھیلی پر رکھے اور ہدایت کی کہ دودھ پی لیویں- بعد ازاں چابی لے کر اپنے کمرے کا رخ کیا- بیگ کو ایک کمرے میں رکھا اور پھر برش، شیو اور غسل کے بعد شوق آوارگی نیو یارک کی جگمگاتی سڑکوں پر لے آیا- یہ براڈوے ہے جو شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہے،



اسے مختلف سٹریٹس کراس کرتی ہیں- میں 53 ویں سٹریٹ سے چلنا شروع ہوا جس کے کونے میں میرا ہوٹل واقع ہے اور پھر میں چلتا چلا گیا-

سڑک کے دونوں جانب کے فٹ پاتھوں پر انسانوں کا ہجوم ٹھاٹھیں مار رہا ہے- ان میں ہر ملک اور ہر رنگ ونسل کے انسان شامل ہیں- ہر دو چار قدم کے بعد کوئی نہ کوئی غیر ملکی نظر آجاتا ہے- یہ چہل پہل آپ کو امریکہ کے دوسرے شہروں میں نظر نہیں آئے گی- اکثر علاقوں میں شام ہوتے ہی سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں- پیدل چلنے والے تو دن کو بھی ڈاؤن ٹاؤن کے سوا کہیں نظر نہیں آتے، مگر رات ہونے پر کسی کا سڑک پر چہل قدمی کرتے پائے جانا، آ بیل مجھے مار کے مترادف سمجھا جاتا ہے مگر یہاں تو رات کو بھی دن کا سماں ہے- نوجوان جوڑے "من توشدم، تو من شدی" کی مجسم تصویر بنے چلے جا رہے ہیں- اکا دکا بوڑھے بھی عمر رفتہ کو آواز دیتے دکھائی دیتے ہیں- کچھ مجھ جیسے بھی ہیں جو کبھی ان سب کو اور کبھی اپنے آپ کو دیکھتے ہیں- چہروں سے فرصت ملتی ہے تو سر بفلک عمارتوں پر نگاہ اٹھتی ہے جس کے لئے سر کو مضحکہ خیز حد تک پیچھے کی جانب جھکانا پڑتا ہے- دکانیں ہر طرح کے سامان سے لدی پڑی ہیں- اشیاء کی نمائش کچھ اس انداز سے کی گئی ہے کہ خواہ مخواہ خریدنے کو جی چاہے- اس میں پیشہ ورانہ تکنیک کے علاوہ خالص نیو یارک تکنیک کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے- مثلاً شوکیس میں نہایت خوبصورت گھڑیوں کا انبار لگا ہے- اس کے بیچ میں گتے پر موٹے الفاظ میں قیمت لکھی ہے $ 4.35 لیکن اس کے نیچے نہایت باریک الفاظ میں لکھا ہے $ 4.35 سے $ 102.00 تک- کچھ اس قسم کی کاروباری تکنیک میں نے ایک دفعہ لاہور کے درودیوار پر ایک پوسٹر کی شکل میں بھی دیکھی تھی جس پر موٹے موٹے الفاظ میں یہ سرخی درج تھی: "لاہور میں خدا"!

لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو پوسٹر کی طرف متوجہ تھا مگر اس کے نیچے باریک الفاظ میں کچھ اس قسم کی عبارت درج تھی:

خدا کے فضل و کرم سے لوہاری گیٹ میں تمباکو کی دکان کھل گئی ہے۔..... لگتا ہے نیو یارک کے کاروباری حلقوں نے کچھ عرصہ لوہاری گیٹ کے اس تمباکو فروش کی چلمیں بھری ہیں!

اور آگے بڑھے، ایک دکان سے کچھ نامانوس سی زبان میں ریکارڈ نشر ہو رہے ہیں۔بورڈ پر نظر پڑتی ہے تو پتہ چلتا ہے سیخوں پر کباب بنائے جا رہے ہیں اور یہ صاحب یونان کے ہیں۔لوگ چٹخارے لے لے کر کباب کھا رہے ہیں۔

کچھ اور آگے بڑھیں تو تین چار امریکی نوجوان نظر پڑتے ہیں۔استرے سے سر منڈے ہوئے ہیں۔سر کے درمیانی حصے میں چوٹی ہے۔ماتھے پر قشقہ، ہاتھوں میں کڑے، گلے میں مالا، جسم پر دھوتی اور پاؤں میں گھنگھرو، آہنگ کے ساتھ پاؤں زمین پر پٹکتے ہوئے ناچتے ہیں اور مستانہ وار بھجن گاتے ہیں۔

اور پھر نظر پڑی ایک جوڑے پر کہ دونوں مرد ہیں مگر حرکات سے زنانہ پن ٹپکتا ہے۔ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں۔لوگ ایک نظر ان پر ڈالتے ہیں اور زیر لب تبسم کے ساتھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔

یہ جگمگ جگمگ کرتا نیویارک ہے۔نیویارک جو امریکہ کی کئی دوسری ریاستوں سے زیادہ ماڈرن ہے۔جہاں اسقاط حمل کو قانونی قرار دیا جا چکا ہے۔ہر قدم پر عریاں رسالوں کی دکانیں عریاں فلموں کے تھیٹر اور جنس کے دیگر مظاہر نظر آتے ہیں BURLESK کا نیون سائن وقفوں کے بعد جلتا بجھتا ہے۔مختلف عمر کے لوگوں کی ایک تعداد تیر کے ایک نشان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تنگ و تاریک سیڑھیوں تک پہنچ جاتی ہے۔سیڑھیاں ختم ہونے پر سامنے بکنگ آفس ہے۔لوگ ٹکٹیں خرید کر ہال میں جا رہے ہیں۔بکنگ کلرک جنوبی امریکہ کا باشندہ ہے۔"کیا میں ایک نظر ہال پر ڈال سکتا ہوں؟"..... "ڈال تو نہیں سکتے مگر ڈال لو۔غیر ملکی لگتے ہو"!



میں مسکراہٹ کے ساتھ اس بات کا جواب اثبات میں دے کر ہال میں داخل ہو جاتا ہوں۔گھپ اندھیرا ہے اور ایک فلم دکھائی جا رہی ہے فلم کیا ہے شیطان بھی دیکھے تو الامان الامان پکار اٹھے۔بکنگ کلرک کا شکریہ ادا کر کے باہر آ جاتا ہوں۔ایک اور نیون سائن پر نظر پڑتی ہے "ڈانسنگ پارٹنرز" باہر ایک تختے پر نیم عریاں لڑکیوں کی تصویریں ہیں۔

1.50 $ ہال میں داخل ہونے کی فیس ہے۔بکنگ کلرک سے پھر وہی سوال کرتا ہوں جو جنوبی امریکہ کے باشندے سے کیا تھا مگر وہ خالص نیو یارک کا باشندہ ہے۔

مکالمات ملاحظہ ہوں:

"کیا میں ہال پر ایک نظر ڈال سکتا ہوں؟"

"ون ڈالر ففٹی سینٹ!"

"محض سیمپل کے طور پر ایک نظر کہ یہ بہت دفعہ دیکھ چکا ہوں، صرف نیو یارک تکنیک کا اندازہ لگانا ہے!"

"ون ڈالر ففٹی سینٹ"۔

"مریں! صرف جھانک کر دیکھنا ہے!"

"ون ڈالر ففٹی سینٹ"۔

"اس سے زیادہ بھی منہ سے کچھ پھوٹو گے یا "ون ڈالر ففٹی سینٹ" کی گردان دہراتے جاؤ گے؟"

اس بار اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا لیا اور اس پر جلی قلم سے 1.50 $ لکھا اور ساتھ ہی یہ کہہ کر ہماری انگریزی کی دو سو سالہ غلامی کے شرف پر پانی پھیر دیا کہ شاید تم انگریزی نہیں سمجھتے۔جب اس نے زخموں پر یوں نمک پاشی کی، تب میں جان گیا کہ اللہ تعالی نے اس شخص کے دل پر مہر لگا دی ہے، کان بند کر دیئے ہیں اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔جب

یہ اسرار منکشف ہوئے مجھ پر تو میں گامزن ہوا اس دکان کی جانب جہاں جنس کے متعلق ہر چیز دستیاب ہونے کا دعویٰ ایک بہت بڑے نیون سائن کے ذریعے کیا گیا تھا- یہاں اندر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی- شوکیس میں "ہر طرح" کا مال سجا پڑا تھا- غالب نے تو کہا تھا: ع

لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

مگر اس شریف النفس انسان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک وقت آئے گا جب دل و جان ہی نہیں، بازار سے ہر سائز کے جنسی اعضا بھی خریدے جا سکیں گے، سو خریدا- کم از کم تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم یہاں بھی تھا-

چلتے چلتے پاؤں اور دیکھتے دیکھتے آنکھیں دکھنے لگی تھیں- سو پناہ لی ایک ریستوران میں- یہ ایک ہوائی طرز کا ریستوران تھا، ماحول سے یوں لگا کہ نیویارک سے ایک دم ہوائی پہنچ گیا ہوں- پیالے ناریل کے تھے اور ٹوکریاں پام کی- خادمائیں بھی ہوائی سے تھیں اور خدام بھی وہیں سے! اور تو اور کھانے کا آرڈر دیا تو اتنا انتظار کرنا پڑا کہ لگا جیسے اس کے لئے بھی کسی کو ہوائی بھیجا گیا ہو- ریستوران کے ساتھ بار بھی تھا- ویٹرس نے پوچھا "کھانے کے ساتھ کیا پیو گے؟" میں نے کہا "واٹر"- وہ مجسمہ حیرت بولی "واٹر؟"- میں نے کہا "ہاں واٹر"- اور پھر اس کی سہولت کے لئے ہجے کر کے بتائے "ڈبلیو، اے، ٹی، ای، آر"- اس نے پوچھا "کس ملک سے ہو؟" انداز ایسے تھا جیسے پوچھ رہی ہو کس جنگل سے آئے ہو؟ میں نے کہا "پاکستان سے"- پھر پوچھا- "وہاں سب لوگ کیا کھانے کے بعد پانی ہی پیتے ہیں؟"

کہا تو نہیں، مگر کہنے کو جی چاہا "- کھانا؟! اکثر لوگ صرف پانی ہی پیتے ہیں!"

سٹیج پر بینڈ اس وقت ایک معروف گانا پلے کر رہا تھا جس میں HI (ہیلو) کی تکرار تھی- شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی سو باتیں کچھ اس طرح ہو



رہی تھیں کہ میں اور وہ نازنین باری باری اپنا منہ ایک دوسرے کے کان کی طرف لے جاتے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر حرفِ مدعا بیان کرتے تھے- حرفِ مدعا کا استعمال غالباً یہاں درست نہیں کہ وہ بیان نہ ہوا- اس اثناء میں گلوکار پر دیوانگی کا سا عالم طاری ہو گیا- گانے کی لے تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی- اس کے ساتھ ساتھ اس کا جسم بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تھرک رہا تھا- اوپر سے PSYCHEDELIC LIGHTS ماحول کے سحر میں اضافہ کر رہی تھیں- اب وہ گانے اور تھرکنے کے ساتھ ساتھ دونوں ہاتھوں سے تالیاں بھی بجا رہا تھا- پھر اس نے مائک پکڑا- اسٹیج پر اتر کر فلور پر آ گیا اور چلایا

COME EVERY BODY DANCE

فلور پر پہلے سے ہی کچھ جوڑے محو رقص تھے- اس صدا پر اور بہت سوں نے لبیک کہی اور وہ مدہوشی میں لڑکھڑاتے ہوئے، ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے فلور پر جمع ہو گئے- میوزک کی لے اور تیز ہو گئی- گٹار بجانے والے کی انگلیاں کچھ اس تیزی سے گردش کر رہی تھیں کہ لگتا تھا کہ گٹار کی طرح انگلیاں بھی بجلی کی ہوں- ڈرمر (DRUMER) کے لمبے بال اس کے ہاتھ اور گردن کی حرکت کے ساتھ بار بار اس کا چہرہ ڈھانپ رہے تھے- گلوکار مائک ہاتھ میں لئے رقصاں جسم کے ساتھ چیخ رہا تھا:-

"EVERYBODY SAY HI"

لوگ چیخ چیخ کر جواب دے رہے تھے "HI"

"COM'ON EVERY BODY SAY HI"

"H"

"SAY HI"

"HI"

جن جوڑوں کو فلور پر جگہ نہ ملی، وہ دیوانگی کے عالم میں میزوں پر کھڑے ہو کر ناچنے

لگے سائیکاڈیلک لائٹس، پاگل کر دینے والا میوزک اور خوشی سے تمتماتے ہوئے سرخ و سفید چہرے۔ نجانے مجھ سے یہ سب کچھ کیوں نہ دیکھا گیا اور میں اٹھ کر باہر آ گیا۔

--------



# ٹائم سکائر کا شرابی

یہ ٹائم سکائر ہے-42ویں سٹریٹ! ایک نظر اس پر بھی ڈال لیں-رات کا ایک بجا ہے مگر گہما گہمی کا وہی عالم ہے- ٹائم سکائر کا صرف نام ہی نہیں درشن بھی بڑے ہیں- سڑک کے درمیانی حصے کے باغیچے میں بنچ پڑے ہیں-کچھ لوگ گھاس پر لیٹے ہیں اور کچھ بنچوں پر پڑے سستا رہے ہیں-کچھ کچھ فاصلے پر لوگ ٹولیوں میں کھڑے گپ شپ میں مشغول ہیں-ایک جگہ زیادہ ہی لوگ جمع ہیں-اور یہ کسی سنجیدہ موضوع پر بحث کر رہے ہیں- حاضرین سے تعارف کرائے دیتا ہوں- دس بارہ مردوں کے درمیان ایک لڑکی گھری کھڑی ہے- عمر بیس سے زیادہ نہیں- نیلے رنگ کی جین پہنے ہوئے ہے-پاؤں سے ننگی ہے- مرد حاضرین میں سے ایک کی عمر تیس پینتس کے قریب ہے- بنیان بغیر بوشرٹ پہنے ہوئے ہے جس کے اگلے سارے بٹن کھلے ہیں- چھاتی پر گھنے گھنگریالے کالے بال اس کی شخصیت کے مردانہ پن میں اضافہ کر رہے ہیں-ہاتھ میں شراب کی بوتل ہے-دوسرے صاحب پنتالیس کے لگ بھگ ہیں-نہایت خوبصورت داڑھی جس میں کالے اور سفید بال ایک ہی نسبت سے ہیں- چہرے سے وجاہت ٹپکتی ہے-چوتھے صاحب ایک نیگرو نوجوان ہیں کسی یونیورسٹی کے طالب علم، رنگ سیاہ نہیں بلکہ گندمی مائل ہے چہرے سے متانت اور سنجیدگی عیاں ہے-ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ یہاں موجود ہیں مگر وہ گفتگو میں زیادہ حصہ نہیں لے رہے ان کی حیثیت سامعین کی سی ہے-کبھی کبھار ایک آدھ نکتہ بغل میں دبائے بحث میں کود پڑتے ہیں- موضوع بحث

کوئی خاص نہیں گفتگو بھٹکتے بھٹکتے کہیں کی کہیں پہنچ جاتی ہے- جب میں لوگوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا مجمع کے درمیان میں پہنچا ہوں اس وقت موضوع بحث آزادی نسواں تھا- گھنے بالوں اور سینے والی دوشیزہ تحریک آزادی نسواں (WOMEN LIB) کی سرگرم کارکن ہے- وہ سراپا احتجاج بنی کہہ رہی ہے- "تم مردوں نے عورتوں کو ہزاروں سال قید کئے رکھا ہے- اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا- اس نے جب کبھی یکساں حقوق کے لئے آواز اٹھائی، تم نے کہا خدا نے مرد کو جسمانی اور ذہنی اعتبار سے، عورت سے برتر بنایا ہے- اپنے استحصال کو خدا کا فعل بتاتے ہوئے تم کو شرم آنی چاہئے-"

کھلے بٹنوں والی بوشرٹ پہنے ہوئے شخص نے شراب کی بوتل کو منہ لگایا اور دو تین لمبے لمبے گھونٹ لئے- اس کے چہرے پر شراب کی کڑواہٹ کے آثار نمایاں ہوئے اور زبان پر اس کا اظہار "شٹ! تم نے یہ کیا بک بک لگائی ہوئی ہے! تم نے سب کچھ حاصل کر لیا اب اور کیا چاہتی ہو؟ میں گزشتہ چھ ماہ سے نوکری کیلئے ٹھوکریں کھا رہا ہوں ابھی تک نہیں ملی- تم جب چاہو، جہاں چاہو ملازمت لے لو- باس کی گود میں جاکر بیٹھو اور تنخواہ میں اضافہ کرالو- اگر تم سمجھتی ہو کہ عورت ہونے کے سبب تم اتنی مظلوم ہو تو کہیں سے رقم کا بندوبست کرو، میں صبح ہی سرجری کے ذریعے اپنی جنس تبدیل کرا کے عورت بن جاتا ہوں اور تم مرد بن جاؤ" - یہ کہہ کر وہ ایک زوردار قہقہہ لگاتا ہے اور دوشیزہ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے- "لیکن اگر اس کے بعد چھ ماہ تک نوکری نہ ملے تو مجھے گالیاں مت دینا"-

لڑکی غصے سے اس کا ہاتھ پرے جھٹکتی ہے اور کہتی ہے "- یہ سب کچھ اسے کہو جو حقیقت حال سے واقف نہ ہو- تم عورت کو سیکرٹری، بک کیپر، ویٹرس یا ایئر ہوسٹس بنا کر یہ جتانا چاہتے ہو کہ اسے اس کے حقوق مل گئے- ذرا انگلیوں پر گن کر بتاؤ کتنی عورتیں کسی بڑے عہدے پر فائز ہیں؟ اور اس بات کا بھی جواب دو کہ آیا ملازمت پیشہ خواتین کو



مردوں کے برابر تنخواہ ملتی ہے یا انہیں کم سے کم اجرت پر ملازم رکھا جاتا ہے؟"

شرابی اس پر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہتا ہے- "یہ آزادی نسواں وغیرہ تو سب فراڈ ہے- تمہیں دراصل مردوں سے نفرت ہے اور تم سب ہم جنسی کی دلدادہ ہو- اپنے اس غیر فطری فعل پر پردہ ڈالنے کے لئے تم نے آزادی نسواں کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے-"

تحریک آزادی نسواں کی کارکن اشتعال میں آئے بغیر اس الزام کا جواب پورے تحمل سے دیتے ہوئے کہتی ہے "پہلی بات یہ ہے کہ ہم جنسی غیر فطری فعل نہیں ہے، تم اسے غیر معمولی فعل کہہ سکتے ہو- دوسرے یہ کہ تحریک آزادی نسواں کی کارکنوں پر ہم جنسی کا الزام محض اتہام ہے-"

شرابی اس بات کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے- "اگر یہ الزام محض اتہام ہے تو گزشتہ دنوں نیویارک کی سڑکوں سے گزرنے والے تحریک کے اس جلوس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جس میں شریک اکثر لڑکیاں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے تھیں اور ان میں سے بعض کو سرعام غیر اخلاقی حرکات کرتے بھی دیکھا گیا؟ یہاں پر موجود اکثر لوگوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے- اگر مجھے غیر معتبر راوی سمجھتی ہو تو ان ہی سے پوچھ لو"-

اس بار خوبصورت داڑھی اور گھنے بالوں والے بارعب شخصیت کے مالک شخص نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا- "تم صحیح کہتے ہو بعض شرکائے جلوس کو واقعی ایسی حرکات کرتے پایا گیا- مگر یہ ان کا ذاتی فعل ہو سکتا ہے- ضروری نہیں تحریک سے اس کا کوئی تعلق ہو-"

شرابی اپنی بڑھی ہوئی شیو میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتا ہے اور پھر ایک دم غصے سے لال پیلا ہو کر دھاڑتا ہے- "کتیا کے بچے! تم اپنی دم باہر ہی رکھو تم تو مجھے خود امرد پرست لگتے ہو-"

جسے گالی دی گئی ہے اسے ناگوار محسوس نہیں ہوتا بلکہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے لیکن مجمع میں سے ایک بوڑھی عورت نرم لہجے میں کہتی ہے۔"تمہیں ایک سچے عیسائی کی حیثیت سے ایسی زبان اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ بائبل کہتی ہے اپنے دشمنوں سے بھی محبت کارویہ اختیار کرو۔"

اس بار یونیورسٹی کا نیگرو طالب علم بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہتا ہے "کوئی لفظ برا نہیں اور کوئی لفظ اچھا نہیں۔ معاشرے کے قائم کئے ہوئے اچھائی اور برائی کے معیار ٹیبو (TABOO) ہیں۔ لفظوں کی تخصیص بھی ایک ٹیبو ہے جسے ہمیں توڑنا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم ایسے الفاظ کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں جنہیں سوسائٹی نے ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ ہمیں لفظوں کو معانی کی غلامی سے آزاد کرانا ہے"۔

"کیا تم بائبل کو نہیں مانتے؟" بوڑھی عورت پوچھتی ہے۔ انداز ایسے ہے جیسے نفی میں جواب ملا تو رو پڑے گی۔

"میں بائبل کے وجود سے منکر نہیں۔ اس نام کی ایک کتاب واقعی موجود ہے مگر یہ انسانوں کی لکھی ہوئی ہے۔ سب مذہبی کتابیں اپنے اپنے دور کے لئے مفید تھیں مگر کوئی فلسفہ حیات ابدی نہیں۔ ہر دور اپنے ساتھ ایک فلسفہ لاتا ہے یا ہر فلسفہ ایک نئے دور کا پیغامبر ہوتا ہے۔ زندگی حرکت کا نام ہے اور جامد نظریے اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔"

شرابی اس ساری گفتگو سے بے نیاز نظر آتا ہے۔ اس نے ایک ہی سانس میں بوتل ختم کی ہے اور اب وہ اسے زمین پر رکھ کر بار بار دوشیزہ کو خبردار کرتا ہے کہ کہیں وہ اس پر بیٹھ نہ جائے۔ اب گفتگو کا رخ سیاسیات کی طرف مڑ گیا ہے۔ بارعب شخص آئرلینڈ کے معاملے میں برطانوی حکومت پر تنقید کرتا ہے۔ مگر یونیورسٹی کے نیگرو طالب علم کا کہنا ہے کہ "دوسروں پر تنقید کرنے سے قبل ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھ لینا چاہئے۔ دنیا کا کونسا خطہ ایسا ہے۔ جہاں ہم نے اپنے پاؤں پسارنے کی کوشش نہیں کی۔ کسی



حکومت کا تختہ الٹے یا کوئی نئی حکومت بنے، کوئی ملک داخلی بحران کا شکار ہو یا خارجی بحران کا۔ پس پردہ کسی نہ کسی صورت ہمارا ہاتھ کارفرما ہوتا ہے۔ اگر برطانیہ آئرلینڈ میں مداخلت کررہا ہے تو اس پر کوئی اور تنقید کرے تو کرے ہمیں کسی صورت یہ حق نہیں پہنچتا!"

لگتا ہے جیسے آئرلینڈ کا لفظ اس تمام گفتگو کے دوران میں پہلی دفعہ شرابی کے کانوں تک پہنچا ہے۔ ایک دم سے اس کی بھویں تن جاتی ہیں اور وہ مکا فضا میں لہرا کر غیض و غضب کے عالم میں کہتا ہے۔"انگریز دنیا کی بدترین قوم ہے۔ اگر میرا بس چلے تو میں پکاڈلی سرکس میں بم پھینک کر انگلینڈ کو تہس نہس کردوں۔ دنیا کے نقشے پر برطانیہ کا وجود ناقابل برداشت ہے"

نیگرو طالب علم اس کے کندھے پر تھپکی دیتا ہے اور نرمی سے پوچھتا ہے"۔ کیا تم آئرش ہو"؟

"ہاں میں آئرش ہوں مگر مجھے برطانیہ سے اس لئے نفرت ہے کہ اس نے اقوام عالم کا سب سے زیادہ خون چوسا ہے۔"شرابی اسی غیض و غضب کے عالم میں جواب دیتا ہے نیگرو طالب علم مسکراتے ہوئے کہتا ہے "اگر میں یہی بات امریکہ کے بارے میں کہوں تو تم کیا محسوس کروگے؟ کیا تم پسند کروگے کہ واشنگٹن کو بم سے اڑا دیا جائے؟"

یوں لگتا ہے کہ جیسے شرابی یہ بات سن کر ہوش کا دامن چھوڑ بیٹھا ہو۔ اس بار وہ بھینچی ہوئی مٹھیوں کو فضا میں بلند کرتا ہے اور منہ آسمان کی طرف کرکے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیختا ہے"۔ تم اگر واشنگٹن کو بم سے اڑانا چاہتے ہو تو اس نیک کام میں دیر نہ کرو! ابھی اڑا دو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تم سے متفق ہوں۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں روزانہ یہاں فٹ پاتھ پر سوتا ہوں۔ واشنگٹن کو صفحہ ہستی سے مٹا دو مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر کہیں سے تم بم حاصل کرسکتے ہو تو ابھی جاؤ اور واشنگٹن پر پھینک دو۔ اسے صفحہ ہستی سے مٹا دو۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟"

وہ ہسٹریائی انداز میں چیختا ہوا مجمع سے نکل جاتا ہے اور ٹائم اسکائر کے باغیچہ میں بچھے ہوئے بنچ پر جا کر لیٹ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں اسے نیند کی آغوش میں پاتا ہوں چہرے پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ ہے۔

یہ ٹائم اسکائر ہے جس کے رگ و پے میں زندگی رواں ہے! گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ پلکیں نیند سے بوجھل ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ تب میں نے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ہوٹل کی راہ لی۔ اور اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

## ڈان اور سینڈی

جب آنکھ کھلی تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ کھڑکی میں سے جھانک کے دیکھا تو دھند میں لپٹا ہوا نیویارک میرے سامنے تھا۔ اس شہر ناپرساں میں میرا قیام جہان فانی ہی کی طرح دو روزہ تھا۔ سوچا اگر یہاں آ کر بھی ڈان سے نہ ملے تو تمام عمر پچھتاوا رہے گا...... ڈان واشنگٹن یونیورسٹی کا فارغ التحصیل سفید فام امریکی، سفید فاموں سے بیزار، حشیش کا رسیا، پراسرار روحانی قوتوں کا قائل، چھ مہینے کام کرنے والا، تین مہینے نگر نگر گھومنے اور تین مہینے کمرہ بند کر کے مسلسل شاعری کرنے والا، سینٹ لوئیس میں میرا "فلیٹ میٹ" تھا اور اب چھ مہینے سے نیویارک اور اس کے گردونواح کے "سروے" کے لئے آیا ہوا تھا۔ اس کا فون نمبر میری ڈائری میں موجود تھا۔ نمبر گھمایا تو ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

THE NUMBER YOU HAVE DIALLED, IS NOT IN SERVICE.
BE SURE YOU ARE DIALING THE CORRECT NUMBER

پیشتر اس کے کہ اس خاتون سے مزید "مذاکرات" کا موقع پیدا کیا جاتا یہ اختتامی فقرہ سنائی دیا۔

THIS IS A RECORDING, THANK YOU



اور اس کے ساتھ ہی ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو گیا!

دوبارہ ڈائری پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ 60789 کی بجائے 607893 گھما بیٹھا ہوں۔ وہ "آٹومیٹک خاتون" بھی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ بچارا 607893 کا الاٹی فون کا بل ادا نہیں کر سکا ہو گا اسی لئے ٹیلیفون کمپنی کو اس کے دوستوں کی سہولت کی خاطر یہ سب کچھ بتانے کا اہتمام کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نے دوبارہ ڈان کو رنگ کیا۔ وہ گھر پر ہی موجود تھا۔

"ہیلو" سدا کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ڈان! دس از عطا" خوشی سے میری آواز کپکپانے لگی۔

"او۔ یو سن آف اے گن" پیار اور خلوص میں ڈوبے ہوئے استقبالیہ کلمات سنائی دیئے

"سینٹ لوئیس سے بول رہے ہو"؟

"ارے نہیں تمہارے شہر میں آیا ہوں اور پرسوں ہمیشہ کیلئے پاکستان جا رہا ہوں"

"بل شٹ!"

"بل شٹ نہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں"۔

"اچھا تو پھر وہیں رکو میں تمہیں لینے کے لئے آ رہا ہوں"۔

پتہ اس نے مجھ سے پوچھ لیا تھا اور پھر وہ آدھ گھنٹے بعد میرے کمرے میں موجود تھا۔ جگہ جگہ سے پیوند لگی بلیو جین، نیم وا آنکھیں اور بکھرے بکھرے بال! کمبخت ویسے کا ویسا ہی تھا، مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کے بھرپور تاثرات نمایاں تھے مگر ہاتھ ملاتے وقت یوں لگا جیسے میری گرفت اگر ذرا سی بھی ڈھیلی ہوئی تو اس کا ہاتھ زور سے اس کی رانوں پر جا گرے گا۔

"ذرا جلدی چلو۔ میرے کمرے میں ہمارا انتظار ہو رہا ہے"۔

یہ "ہمارا" سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"وہاں پہنچو گے تو پتہ چل جائے گا......!"

نیچے اتر کر کار تک پہنچنے کیلئے کوئی ایک فرلانگ چلنا پڑا-اتنے فاصلے میں پارکنگ کے لئے جگہ خالی نہ تھی اور یوں ڈان کو ایک منی سٹوری پارکنگ لاٹ کے تیسرے فلور پر دو گز زمین مل سکی تھی-کار دیکھی تو جی خوش ہو گیا-اگلے وقتوں کی چیز تھی-کھنڈروں سے بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ عمارت کبھی حسین رہی ہو گی-باقی رہی سہی کسر ڈان نے پوری کر دی تھی-دروازے پر جلی حروف میں لکھا تھا "اپنے رسک پر اندر داخل ہوں"-ڈیش بورڈ پر ہدایت درج نظر آئی کہ "گھاس پر چلنا منع ہے"-نیز یہ کہ "پھول توڑنے والا حوالہ پولیس کیا جائے گا"-

مسخرہ! میرے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی-کار میں بیٹھے تو ڈان نے ایک زبانی ہدایت یہ دی کہ ایک ہاتھ سے دروازے کو ذرا تھامے رکھنا اس کے بعد وہ تمام رستے خلاف معمول باتیں کرتا رہا-

"تم پاکستان کیوں جا رہے ہو"؟

"والد صاحب اداس ہو گئے ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ تم میری آنکھوں کے سامنے رہو تاکہ میرے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچتی رہے"-

"تب تو وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے-"

"ہاں بہت زیادہ، مگر یہی کوئی دو چار دن پھر وہ مجھے دیکھ دیکھ کر کڑھیں گے-صبح نماز کے وقت سوتا دیکھ کر کہیں گے بے دین-رات کو دس بجے کے بعد گھر آؤں گا تو کہیں گے آوارہ-نہ دین سے تعلق نہ دنیا کا خیال-دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا!"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں-اس دو سال کے عرصے میں میں اس ڈانٹ کے لئے ترس گیا ہوں-رات گئے واپس آتا ہوں اور کبھی نہیں بھی آتا مگر میرے لئے کوئی آنکھ منتظر نہیں ہوتی اور کوئی دروازے کے باہر بے چینی سے ٹہل نہیں رہا ہوتا-"



"اوہ گاڈ" ڈان کے چہرے پر افسردگی کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی "مجھے میرے والدین نے اٹھارہ سال کی عمر میں اجازت دے دی تھی کہ تلاش معاش میں جدھر سینگ سمائیں میں چلا جاؤں......!"

اس عرصہ میں ہم بڑی بڑی شاہراہوں سے گزر کر ایک چھوٹی سی سڑک پر آ چکے تھے-اس کے دونوں طرف تھڑوں والے بوسیدہ مکانات تھے-جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے تھے-مکانوں کی رنگت ایک عرصے سے سفیدی نہ ہونے کے باعث سیاہی مائل ہو چکی تھی کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے-سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی جس کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد جھٹکے محسوس ہوتے-میں نے حیرت سے اپنی آنکھیں ملیں اور ڈان سے پوچھا "ہم نیویارک سے باہر آ گئے ہیں......!"

"نہیں، ہم مکمل طور پر نیویارک کے اندر ہیں-یہ علاقہ سیاہ فاموں کا ہے"-

کچھ آگے چل کر سڑکوں پر یہ لوگ نظر بھی آنا شروع ہو گئے-دراز قد، توے جیسا رنگ، سفید چمکتے ہوئے دانت اور بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس-وہ مکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے-ایک مکان سے دو ننگ دھڑنگ بچے بھاگتے ہوئے نکلے اور سڑک پر آ گئے-ان کی ماں کوسنے دیتی ہوئی ان کے پیچھے آ رہی تھی-ایک جگہ دو لڑکے آپس میں گتھم گتھا تھے اور غلیظ گالیوں کا تبادلہ کر رہے تھے-پانچ سات لوگ ان کے گرد کھڑے اس تماشے سے محظوظ ہو رہے تھے-ایک بچہ ان سب سے بے نیاز سڑک کے کنارے اکڑوں بیٹھا اپنی مشکل رفع کرنے میں مشغول تھا-میں اندرون لاہور کے کسی محلے میں نہیں، عین نیویارک ہی میں تھا-اتنے میں ڈان نے کار ایک جگہ روک لی-

"کیا بات ہے رک کیوں گئے ہو؟"

"ہمارا گھر آ گیا ہے"-اس نے ایک آسیب زدہ مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا-

"تم یہاں رہتے ہو......؟"

"ہاں......!"

دروازہ کھلا ہی تھا، ہم اندر داخل ہو گئے- ڈرائنگ روم شروع ہی میں تھا- ایک ٹوٹا ہوا صوفہ اور ایک تپائی- باقی سارا کمرہ باں باں بول رہا تھا- اتنے میں دوسرے کمرے سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر وہ چاپ قریب آتی گئی- میرے سامنے سینڈی کھڑی تھی- گدرائے گدرائے جسم والی سینڈی......ڈان کی یہ گرل فرینڈ از سینٹ لوئیس- وہ اکثر راتیں میرے برابر والے کمرے میں ڈان کے ساتھ ہی گزارتی تھی اور رات بھر آنے والی عجیب عجیب آوازوں اور اکثر مرتبہ دروازہ کھلا رہنے کی بدولت دکھائی دینے والے مناظر سے میری نیندیں اچاٹ ہو جاتی تھیں- وہ بھاگتی ہوئی آئی اور مجھ سے چمٹ گئی......! "تم یہاں کہاں؟ ڈان نے مجھے یہ تو بتایا تھا کہ وہ ایک دوست کو لینے جا رہا ہے اور یہ کہ اتنی دیر میں کھانا تیار رکھنا مگر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دوست تم ہو"-

"میں اپنے بارے میں پھر بتاؤں گا- پہلے تم بتاؤ کہ تم یہاں کیسے؟"

"وہ ایسے کہ ڈان یہاں چلا آرہا تھا- اس کا خیال تھا کہ وہ مجھ سے بچ جائے گا- میں کچھ عرصہ کے لئے کیلیفورنیا چلی گئی لیکن اب ایک مہینے سے پھر یہیں ہوں"- یہ کہہ کر اس نے ڈان کی طرف پیار بھرے انداز میں دیکھا-

ڈان نے اس کے بھرے بھرے کو لہوں پر ایک زوردار دو ہتڑ رسید کیا اور کہا-

"بک بک بند کرو، پہلے جا کر میز پر کھانا لگاؤ سخت بھوک لگ رہی ہے"-

کھانا کھانے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں واپس آگئے-

"تمہاری شاعری کا کیا حال ہے؟" میں نے ڈان سے پوچھا-

میں نے محسوس کر لیا تھا یہ تین مہینے اس نے شاعری کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں- وہ چپ چاپ اٹھا اور دوسرے کمرے میں جا کر "بیاض" اٹھا لایا-

"خدا کیلئے ڈان، خدا کیلئے رہنے دو" سینڈی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھلائے ہوئے



انداز میں کہا "میں تمہاری اس شاعری سے سخت بیزار ہوں-" ڈان نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "عرض کیا ہے-" اور اس کے ساتھ ہی سینڈی پیر پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گئی-

"ارشاد" میں پوری سنجیدگی سے ہمہ تن گوش ہو گیا- گو اس کی شاعری میرے لئے کبھی باعث کشش نہیں رہی- فرمائش میں نے یوں کر دی تھی کہ میں زندگی میں آخری بار اس ڈان کو مکمل طور پر ملنا چاہتا تھا جس کے ساتھ کئی مہینے ایک مکان میں اکٹھے بسر کئے تھے-

ڈان نے بیاض کے ورق پلٹے اور ایک نظم سنانا شروع کر دی:-

"میں کالی ہواؤں کی غلاظتیں چاٹتا ہوں-
شہر میں بازی گروں کا تماشا ہو رہا ہے-
اور لوگ اصیل مرغوں پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں
پتھروں کو سوزاک ہو گیا ہے، انہیں ٹھوکریں مار مار کر
مشرق کی جانب لڑھکا دو اور مجھے
مسی سپی ریور میں ڈوب جانے دو کہ
زندگی کی ساری خوشیاں گدلے پانیوں میں ہیں-"

"بہت اچھی پوئٹری ہے واہ واہ! ویسے تم نے افتخار جالب کو پڑھا ہے؟"

"وہ کون ہے!" اس نے خفگی سے کہا

"گویا تم نے اسے نہیں پڑھا!"

"نہیں"-

"تو پھر اس نے تمہیں پڑھا ہو گا"-

اس نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بیاض کے ورق پھر سے پلٹنا شروع کر

دیئے- قریب تھا کہ وہ دوسری نظم شروع کرتا کہ سینڈی ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے بیاض چھین لی-

"کچھ تو خدا کا خوف کرو- وہ چند لمحوں کے لئے تم سے ملنے اور پھر جدا ہونے کے لئے آیا ہے- تم ہو کہ اپنی شاعری لے کر بیٹھ گئے ہو"-

ڈان نے بے بسی سے میری طرف دیکھا اور پھر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا"- یہ لڑکیاں بہت بدذوق ہوتی ہیں- کام کی باتیں انہیں بہت گراں گزرتی ہیں" اور پھر اس نے ہتھیار ڈال دیئے-

"تمہارے اس پاکستانی دوست کا کیا حال ہے جو تمہیں ملنے آیا کرتا تھا مگر اس دوران سارا عرصہ میری ٹانگوں کو گھورتا رہتا تھا!" سینڈی نے ہنستے ہوئے پوچھا-

"وہ ٹھیک ہے اور اب بھی تمہاری ٹانگوں سمیت تمہارا ذکر کرتا اور آہیں بھرتا ہے"-

"یوناٹی بوائے!" سینڈی نے دور سے مکا دکھاتے ہوئے کہا-

اتنے میں گھنٹی کی آواز سنائی دی اور وہ اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئی- تھوڑی دیر بعد تین گرانڈیل قسم کے نیگرو اور ان کے ساتھ تین سیاہ فام دوشیزائیں کمرے میں داخل ہوئیں اور پھر یوں لگا جیسے بھونچال آ گیا- ڈان کے ان دوستوں نے آتے ہی کباڑیے کی دکان سے خریدے ہوئے فریج کی طرف یلغار کی اور پھر بیئر اور کوک میں سے جو کسی کے ہاتھ لگا لے اڑا-

یہ دیکھ کر میں نے کھسکنا ہی مناسب سمجھا- چنانچہ اجازت چاہی اور مل گئی کہ یہاں لوگ مہمان کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں پڑ جاتے- ڈان اور سینڈی اپنی کار میں مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آئے- میں نے رخصت ہوتے وقت ڈان کا ہاتھ زور سے دبایا اور کنکھیوں سے سینڈی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم کبھی شادی کے ادارے پر ایمان لے کر آؤ تو اس موقع پر مجھے ضرور بلانا- نہیں تو روحانی قوت کے بل پر ایسا منتر پھونکوں گا کہ پوری



سہاگ رات ایک ٹانگ پر کھڑے رہو گے-"

سینڈی اور ڈان کھلکھلا کر ہنسے اور پھر میں ان سے ہاتھ ملا کر بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے ہوٹل میں چلا آیا- یہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد نہا دھو کر کپڑے بدلے اور ایک بار پھر میرے قدم نیویارک کی سڑکیں ناپنے لگے-

-------

# مولوی ہرکولیس

عام حالات میں یہ فقیر دو قدم بھی پیدل چلے تو (خواتین سے معذرت کے ساتھ) اس کا پاؤں بھاری ہو جاتا ہے اور اڑیل ٹٹو کی طرح آگے بڑھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ مگر یہاں شوق آوارگی اسے سوکھے پتوں کی مانند اڑائے پھر رہا ہے۔ چنانچہ ایک بار پھر میں براڈوے پر ہوں۔ ایک سٹریٹ سے دوسری سٹریٹ کی طرف گامزن...... چلتا چلا جا رہا ہوں، اور ہر چیز کو یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں کہ اصحاب کہف نے بھی کیا دیکھا ہوگا۔ وہی بلند و بالا عمارات ہیں اور وہی HUGE ڈیپارٹمنٹل سٹور جہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک دستیاب ہو سکتے ہیں۔ ڈانگوں سے ناپے جانے والی لمبی لمبی کاریں اور ان میں براجمان اسی سائز کے صاحبان کار! شام ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے مگر دکانوں کے نیون سائن "آن" ہیں۔ لوگ آ جا رہے ہیں۔ اس وقت میں جس علاقے میں ہوں اسے نیویارک کے میکلوڈ روڈ ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ قطار اندر قطار سینما نظر آ رہے ہیں اور لوگ جوق در جوق اندر جاتے اور باہر آتے دکھائی دیتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ باہر "سینما سکوپ" سائز کے بورڈ نظر نہیں آ رہے۔ جن پر سینما سکوپ سینوں والی ایکٹرسوں کی تصویریں بنی ہوتی ہیں اور جنہیں دیکھ کر بچے بلبلانے لگتے ہیں۔ ٹکٹ لینے کے لئے لوگ قمیصیں اور بنیانیں اتار کر ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار بھی نظر نہیں آتے بلکہ مرد اور خواتین ایک ہی لائن میں بڑے سکون سے کھڑے ہیں۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ مرد عورتوں کی موجودگی سے بے نیاز ہیں اور ان کے ہاتھ "علاقائی حدود" کی خلاف ورزی نہیں کر رہے۔ ٹکٹ ایک ڈالر پچاس سینٹ ہے اور یہ



سارے دن کے لئے ہے۔ چاہیں تو اسی ٹکٹ میں تمام شو دیکھیں۔ مگر لوگ اس سہولت سے صرف یہی فائدہ اٹھاتے ہیں کہ اگر وقت کی کمیابی کے باعث وہ آدھی فلم چلنے کے بعد سینما میں پہنچتے ہیں تو اختتام دیکھنے کے بعد اس کا آغاز وہ دوسرے شو میں دیکھ لیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ سینماؤں میں ایکس ریٹ فلمیں چل رہی ہیں جو صرف بالغوں کے لئے ہیں اور یقین جانیں یہ واقعی بالغوں کے لئے ہیں۔ آج میرا موڈ صرف سٹلز STILLS دیکھنے کا ہے، چنانچہ استغفر اللہ کا ورد کرتے ہوئے ایک سینما سے دوسرے سینما میں داخل ہو رہا ہوں...... واقعی "استغفر اللہ آور" فلمیں ہیں۔ مگر امریکہ میں دو سال کے قیام کے بعد اب یہ زیادہ انسپائر نہیں کرتیں۔ سینماؤں کا یہ ہے کہ معمولی درجے کے ہیں۔ اپنے لاہور اور کراچی میں ان سے بہتر سینما موجود ہیں۔ ویسے فلم دیکھنے کا لطف بھی اپنے ہاں ہی آتا ہے۔ ٹکٹ لینے کا ایڈونچر! کامیابی پر احساس فتح! فلم میں مشرع لباس میں ملبوس رقاصہ پر پبلک کا لٹو ہونا اور پھر ہدیہ تبریک پیش کرنے کے لئے بڑھکیں لگانا اوپر سے انٹرویل کے دوران کوکا کولا۔ نان کباب۔ گنڈیریوں اور مونگ پھلی والوں کی یلغار!...... یہاں کیا ہے...... ہر کوئی ایک حسینہ بغل میں دابے بیٹھا ہے اور صرف فلم دیکھتا ہے یا پھر کچھ بھی تو نہیں دیکھتا۔

میں STILLS دیکھنے کے کاروبار سے فارغ ہو کر سڑک پر آ گیا ہوں مگر بقول میر درد:۔

ان دنوں کچھ عجب ہے میرا حال
دیکھتا کچھ ہوں دھیان میں کچھ ہے

چنانچہ کئی کاروں کی "چر چر چر" کی آواز بیک وقت سنائی دیتی ہے اور ایک کار کی بریکیں مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر پہنچ کر اپنے درست ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ میں سڑک کراس کرتے کرتے رک جاتا ہوں۔

"اندھے ہو نظر نہیں آتا؟" ایک چوڑی چکلی چھاتی اور ۲x۲ سائز کی داڑھی والا امریکی کار کے شیشے فولڈ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہے۔

"اندھے ہو گے تم، اندھا ہو گا تمہارا باپ"! میں لکھنوی بھٹیارنوں کے انداز میں ہاتھ نچا نچا کر جواب آں غزل پیش کرتا ہوں۔ تس پر یہ مولوی ہرکولیس ڈیش بورڈ میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک چیز ہے۔ جسے پستول کہا جاتا ہے اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اس کا رخ میری جانب کرتے ہوئے کہتا ہے

You Want Trouble,Man?

اہنسا کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اگر تم تشدد کے قابل نہیں ہو، تو عدم تشدد کے قائل ہو جاؤ، سو جب میں نے جان لیا کہ دل ناتواں مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو میں نے انگشت شہادت اور درمیان والی انگلی بند مٹھی سے باہر نکالی اور PEACE کا نشان بنا کر کھڑا ہو گیا، یعنی یہ کہ ہرکولیس صاحب جان بخشی فرمائیے۔ اسی اثناء میں پیچھے کا سارا ٹریفک جام ہو گیا تھا اور لوگ ہارن پر ہارن بجائے جا رہے تھے۔ اس پر مولوی ہرکولیس کا غصہ کچھ فرو ہوا۔ اس نے پستول سمیت اپنا ہاتھ کھڑکی کے اندر داخل کرتے ہوئے کہا!...... میں ان فرمودات کا اردو میں سلیس ترجمہ پیش کرتا اگر اپنی حمیت اور قارئین کے اخلاقی جذبات مجروح ہونے کا خدشہ نہ ہوتا۔ جب فطرت کے اس ظالم مظہر کی کار آنکھوں سے ذرا دور ہوئی تو اس خاکسار نے انگشت شہادت، بند مٹھی میں سمیٹ لی اور صرف درمیان والی انگلی کھڑی کر کے بزعم خود اسے دکھائی جسے ابھی PEACE کا نشان بنا کر دکھایا تھا۔ اس تازہ سگنل کا مطلب بھی قارئین کے گوش گزار کرتا اگر ایک بار پھر اخلاقی قدریں خطرے میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہوتا، صرف اتنا جان لیں کہ مولوی ہرکولیس وہ سگنل دیکھ پاتا تو مجھے دوبارہ پیس کا نشان بنانے کی مہلت بھی نہ ملتی۔



# بیوی سامراج ہائے ہائے!

اب شام کا دھندلکا پھیل رہا ہے مگر میرے پاؤں ان دیکھے راستوں کی جانب بڑھتے جا رہے ہیں۔ ایک جگہ راہ گیروں کو کچھ دیر کے لئے رکتے، زیر لب مسکراتے اور پھر آگے بڑھتے دیکھتا ہوں تو پاؤں اس جانب اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک صاحب یہی کوئی چالیس پینتالیس کے پیٹے میں ہوں گے کچھ بینر ہاتھوں میں اور کچھ جسم کے ساتھ لپیٹے کھڑے ہیں۔ ان کے ساتھ دو عدد دوشیزائیں ہیں اور وہ بھی اسی ہیئت کذائی میں نظر آ رہی ہیں...... قریب جاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ ایک بینر پر موٹے حروف میں لکھا ہے......"تحریک آزادی شوہراں"......اور باقیوں پر درج ہے۔ "دنیا بھر کے شوہرو ایک ہو جاؤ"......"یہ بیویاں نہیں خدا کا قہر ہیں"......"بائیبل میں لکھا ہے کہ شوہر مجازی خدا ہیں، مگر یہ بیویاں ہم مجازی خداؤں کو گھاس نہیں ڈالتیں"......"ہمیں ہمارے حقوق دو"......"اگر عورت اور مرد برابر ہیں تو طلاق، علیحدگی اور بچوں کے حصول وغیرہ کے معاملات میں عورتوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیوں کیا جاتا ہے؟" "بیوی سامراج ہائے ہائے؟" برابر میں کھڑی دو دوشیزاؤں کے بارے میں میرا یہ گمان تھا کہ وہ تحریک آزادی نسواں سے متعلق ہیں اور ان صاحب کو سبوتاژ کرنے کے لئے ان کے مقابل جوابی مظاہرہ کر رہی ہیں۔ مگر ان کے بینر پڑھے تو جانا کہ وہ توان کی ہمنوا ہیں اور اپنے بینروں کے ذریعے بیویوں کے "مظالم" پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہیں...... جب بیویوں کے زخم خوردہ ان صاحب سے ملتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اس انجمن میں تنہا نہیں

بلکہ یہاں ان کے کئی اور رازداں بھی ہیں۔

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ صرف پارٹ ٹائم ورکر ہے۔ تحریک کا "سرغنہ" دراصل چارلس پنٹر نامی ایک شخص ہے جسے پہلے دو دفعہ طلاق مل چکی ہے اور آج کل وہ اپنی تیسری بیوی کے ساتھ رہ رہا ہے مگر یہاں بھی اسے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خدا جانے نئی بیوی اسے کب "پیکے" بھیج دے۔ اس نے تو طلاق یافتہ شوہروں کی قانونی امداد کے لئے ایک سوسائٹی بھی قائم کی ہوئی ہے جس کے ارکان کی تعداد اس وقت سات ہزار سے بھی زیادہ ہے، نیز ایک کتاب لکھی ہے، جس میں اس نے امریکہ کے قانونی نظام اور اس کے ہرکاروں پر سخت نقطہ چینی کی ہے اور اس میں جہاں کہیں بھی ججوں اور وکیلوں کا ذکر آیا ہے اس نصیبوں جلے نے انہیں غنڈے اور بدمعاش ہی قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ دونوں طبقے عورتوں سے ملے ہوئے ہیں جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ طلاق کے مقدموں میں بالآخر جیت عورت ہی کی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں مردوں کو ناکامی کے علاوہ جس پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ وکیلوں کی بھاری فیسوں اور نان نفقہ وغیرہ کے بھاری اخراجات سے متعلق ہے۔ یہ مظلوم شخص یہ بھی کہتا ہے کہ طلاق کی صورت میں بیوی کی طرف سے بچے کو اپنے پاس رکھنے کا مطالبہ صرف شوہر سے پیسے ہتھیانے کا ایک حربہ ہے، اس کا محرک مامتا کا جذبہ نہیں اور اس ضمن میں دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ عورتیں مردوں ہی کی طرح فیکٹریوں اور دفتروں میں کام کرتی ہیں اور رات کو انہی کی طرح تفریح کے لئے گھر سے باہر نکلتی ہیں جب کہ اس دوران بچے گھر پر ہی رہتے ہیں اور ان کی دیکھ بھال کے لئے BABY SITTER (آیا) کی خدمات حاصل کر لی جاتی ہیں۔ چنانچہ چارلس پنٹر پوچھتا ہے کہ آیا یہ "کارنامہ" مرد انجام نہیں دے سکتے؟

یہ سب بپتا سنانے کے بعد تحریک آزادی شوہراں کا یہ کارکن اس سارے معاملے میں میری رائے پوچھتا ہے اور میں "پتر وا! ہور چوپو"! کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔



# ابوالہول سے ملاقات

اب تاریکی بڑھ گئی ہے لیکن نیویارک روشنیوں میں نہا گیا ہے۔ واشنگٹن بھی دیکھا ہے اور شکاگو بھی مگر اس شہر کے طور سب سے نرالے ہیں۔ انہی لمحات کے دوران میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک لمبا تڑنگا امریکی کبھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے اور کبھی ایک دو قدم آگے یا پیچھے ہو جاتا ہے۔ چہرے سے کھردراپن جھلکتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر پھر ارد گرد لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اپنے ارادے سے باز رہ جاتا ہے۔ میں کچھ گھبرا سا گیا ہوں اور میرے قدم تیز تیز اٹھنا شروع ہو گئے ہیں۔ وہ بھی اسی رفتار سے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔ میں اپنے حواس مجتمع کر کے خود کو پرسکون ظاہر کرنے کے لئے سیٹی بجانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس اثناء میں یوں لگتا ہے جیسے وہ میری گھبراہٹ تاڑ گیا ہے۔ اب وہ مجھ سے ایک دو قدم پیچھے ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک بھاری بھرکم ہاتھ اپنے کندھوں پر محسوس کرتا ہوں اور جسم میں کرنٹ سا دوڑ جاتا ہے! ابوالہول کے چہرے پر خوفناک سی مسکراہٹ ہے اور وہ حقیقتاً کرخت مگر بظاہر نرم انداز میں میری قومیت پوچھتا ہے۔ جب اسے پتہ چلتا ہے کہ میں پاکستانی ہوں تو اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور وہ چٹکی بجاتے ہوئے کہتا ہے۔ "میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا، تم انڈین یا پاکستانی ہو"۔

اس کے ساتھ ہی وہ مجھے ساتھ کے سنیک بار میں کافی کی دعوت دیتا ہے۔ انکار کی جرات یوں نہیں ہوتی کہ ناتوانی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ میں سنیک بار میں قد آدم

شیشوں والی کھڑکی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں اور وہ کافی لینے کے لئے قطار میں کھڑا ہو جاتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد گتے کے دو گلاسوں میں کافی لیے نمودار ہوتا ہے۔ ہاتھ میں دودھ کے دو چھوٹے چھوٹے تکونے پیکٹ بھی ہیں اور وہ میرے سامنے والی نشست پر بیٹھ جاتا ہے، چینی میز پر پہلے ہی سے موجود ہے۔ کافی بنا کر مجھے پیش کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "میرا نام جارج ناب ہے اور تم......"۔

"عطا۔!"

"آتا۔؟"

"چلو آتا ہی کہہ لو۔!"

تعارف کے بعد جارج میز پر کہنیاں ٹیک کر اپنا سر میرے قریب لے آتا ہے اور سرگوشی کے لہجے میں کہتا ہے۔ "اگر تمہارے پاس حشیش (چرس) ہو تو میں بڑے معقول داموں پر خرید سکتا ہوں۔ پہلے یہ معاملہ طے ہو جائے، باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی"۔

"خدا چور بنائے، چور ایسی شکل نہ بنائے" والا محاورہ تو بیسیوں بار سنا تھا مگر اس کی معنویت پہلی بار واضح ہوئی۔ اس کی یہ بات سن کر گو غصہ آیا تاہم انجانے خطرے کا خوف دور ہو گیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم نے غلط آدمی سے رابطہ قائم کیا ہے"۔ میں اسے بتاتا ہوں مگر جارج کو غالباً میری بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ کہتا ہے۔ "مین! ڈرو نہیں، میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا کاروبار ہی یہی ہے"۔

"اس کا مجھے اندازہ ہے، مگر یقین جانو میرا کاروبار یہ نہیں ہے!" میں اسے ایک بار پھر یقین دلانے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ کچھ کچھ قائل نظر آنے لگتا ہے۔ مگر لگتا ہے جیسے مایوسی اس کے نزدیک کفر ہے۔ چنانچہ وہ مجھ سے درخواست کرتا ہے کہ میں اپنے کسی ایسے دوست سے ملا دوں۔ جو اس "بزنس" میں ہو۔ جب میں اس ضمن میں بھی



لاچاری کا اظہار کرتا ہوں تو وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بغیر کسی توقف کے مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو جاتا ہے۔ امریکی لوگ وقت کی بہت قدر کرتے ہیں!

# نیویارک کی آخری رات

اب میں بہت تھک چلا تھا اور پھر نیویارک میں اپنا وقت مولوی ہرکولیس اور ابوالہول جیسے لوگوں ہی کی صحبت میں گزارنا مقصود نہیں تھا۔ یہ بھی ذہن میں تھا کہ نیویارک میں میری یہ آخری رات ہے۔ مولانا حالی بھی یاد آئے جنہوں نے کہا تھا۔

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

چنانچہ یہ نوجوان یہاں سے اٹھ کر اس طرف چلا آیا جدھر گنگا بہہ رہی تھی یہ AIRO SPACE (ایرو سپیس) ہے۔ نیویارک کی ایک شبینہ تفریح گاہ۔ اندر داخل ہونے کے لئے دروازہ کھولا تو تیز موسیقی اور گلوکاروں کی جذب و مستی میں ڈوبی ہوئی آوازیں کانوں سے ٹکرائیں۔ ہال کی مدھم مدھم روشنی میں میزوں پر چند جوڑے بیٹھے نظر آئے۔ باقی فلور پر دیوانہ وار رقص میں مشغول تھے۔ خادمائیں ٹرے ہاتھوں میں لیے بڑی پھرتی سے ایک میز سے دوسری میز کی جانب آجا رہی تھیں۔ انہوں نے یہ نکتہ سمجھ رکھا تھا کہ عریانی سے بہتر کوئی لباس نہیں۔ چنانچہ وہ زیر ناف ایک ہلکی سی پٹی اور پستانوں کو پھولوں سے ڈھانپے ہوئے تھیں۔ تھل تھل چلتے دیکھا تو دھرتی ہلتی محسوس ہوئی۔ میں ابھی بیٹھنے کو جگہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ ایک خادمہ "بناکا" مسکراہٹ کے ساتھ میرے پاس آئی اور کہا "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں"؟

"بہت کچھ۔ مگر فی الحال بیٹھنے کو جگہ درکار ہے"۔

وہ مجھے کونے میں پڑی ایک خالی میز کی طرف لے گئی۔ میں نے پیپسی کا آرڈر دیا اور



موصول ہونے پر چسکیاں لینے لگا۔ اب میری نظریں فلور پر تھیں۔ ناچنے والوں اور والیوں کے تڑپتے جسموں کی طرف نظر اٹھی تو یوں لگا جیسے ان پر کسی آسیب کا سایہ ہو۔ ان کے سروں پر رنگ برنگی روشنیاں تیز میوزک کے ساتھ جل بجھ رہی تھیں۔ لال، سبز، نیلی، کوندتی روشنیوں میں جسم یوں تھرک رہے تھے جیسے بند پانی کی بوتل میں رنگ برنگی مچھلیاں ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں۔ گلوکاروں کو دیکھا تو محسوس ہوا، وار فتگی کسے کہتے ہیں۔ وہ حلق کی پھولی رگوں اور اذیت سے کھنچے ہوئے چہروں کے ساتھ گا رہے تھے۔

AMERICAN WOMAN
GET AWAY FROM ME:

گانا کیا تھا، امریکی دوشیزاؤں پر عدم اعتماد کی قرارداد تھی۔ یعنی لنڈا تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ، شیری میں تمہیں دیکھنا نہیں چاہتا...... سوزی! خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو!

گانا ختم ہوا تو یہ لنڈائیں اور سوزیاں اپنے ہم رقص کی بانہوں میں بانہیں ڈالے واپس میزوں پر آگئیں۔ ایک بار پھر ہال پر نظر ڈالی تو COUPLES کے علاوہ کچھ لڑکیاں اور کچھ لڑکے تنہا بیٹھے بھی نظر آئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں آج کی شب کے لئے DATE نہیں مل سکتی تھی یا وہ کسی اجنبی ساتھی کی THRILL کے لئے اکیلے آئے تھے اور یا پھر آج وہ تنہا ہی رہنا چاہتے تھے۔

دوسرے راؤنڈ میں گلوکاروں نے جو گانا منتخب کیا وہ SLOW DANCE کے لئے تھا چنانچہ ہلکے ہلکے سروں کی موسیقی ہال میں پھیل گئی اور مخمور جوانیاں چوڑی چکلی چھاتیوں پر سر رکھے، آنکھیں بند کیے فرش پر ہلکورے کھانے لگیں۔ نیم تاریک ماحول اور SOFT MUSIC اور گلوکاروں کی پرسوز آواز گیت کی معنویت میں اضافہ کر رہے تھے:

گانا ختم ہوا تو سازندوں نے ایک بار پھر چیختی چنگھاڑتی دھنیں بجانا شروع کر دیں۔ گالوں سے گال اور سینوں سے سینے جدا ہوئے۔ فاصلے پھیل گئے اور اس کے ساتھ ہی ٹانگیں، کولھے اور بازو مشینوں کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کرنے لگے۔

اس اثنا میں میں اردگرد نظریں دوڑاتا ہوں اور بالآخر نگاہیں ایک چہرے پر آ کر ٹک جاتی ہیں۔ چہرہ کیا ہے؟ جیسے گلاب کا پھول، آنکھیں؟ ساری مستی شراب کی سی ہے۔ ہونٹ؟ پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے۔ زلفیں؟ جن شانوں پر پریشان ہوں تمام پریشانیاں رفع ہو جائیں اور بقیہ حصوں کا ذکر خلاف تہذیب...... اس دوران کئی جوانان رعنا اس کے پاس آ کر رقص کی درخواست کر چکے ہیں، مگر وہ ہر ایک سے معذرت کر چکی ہے۔ میں "اے ہمت مردانہ، اے ہمت مردانہ" کا ورد کرتے ہوئے اس کی ٹیبل کی طرف بڑھتا ہوں۔ ذہن میں "لازم نہیں کہ سب کو ملے ایک سا جواب" والا امکان ہے! قریب جا کے قدرے جھکتا ہوں اور حرف مدعا زبان پر لاتے ہوئے کہتا ہوں۔ "کیا مجھے آپ کے ساتھ رقص کا اعزاز حاصل ہو سکتا ہے"؟

وہ قتالہ لمبی لمبی پلکیں اوپر اٹھا کر میری جانب دیکھتی ہے اور پھر بڑی ملائمت سے کہتی ہے "مجھے اس میں خوشی محسوس ہوئی، مگر افسوس کہ اس وقت بہت تھکی ہوئی ہوں"

میں جانتا ہوں کہ انکار کا یہ ایک مہذب طریقہ ہے چنانچہ فوراً تکنیک نمبر 12 بروئے کار لاتے ہوئے چہرے پر افسردگی اور مایوسی کی ایک لہر نمایاں کرتا ہوں اور یہ کہہ کر ٹیبل چھوڑنے لگتا ہوں کہ "میں نے رقص کی درخواست اس حسن ظن کے ساتھ کی تھی کہ دوسرے لوگوں کی طرح تمہارے دل میں رنگدار لوگوں کے لئے کوئی تعصب نہ ہو گا"۔

تیر نشانے پر بیٹھتا ہے اور وہ حسینہ اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہتی ہے۔ "تم نے غلط سمجھا میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں؟ اور ہم فلور پر آ جاتے



ہیں۔ گلوکار چیخ چیخ کر گا رہا ہے۔

اور مست جوانیاں اس دھن پر اپنے کولھوں اور چھاتیوں کی ہیجان انگیز حرکتوں سے کرائسٹ کو بھرپور خراج تحسین پیش کر رہی ہیں...... ادھر میں سوچ رہا ہوں یہ راؤنڈ زیادہ طول ہو گیا ہے یا میری ٹانگوں نے مزید حرکت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کبھی خود کو دیکھتا ہوں اور کبھی اپنی ہم رقص کو جو شعلہ جوالہ بنی ہوئی ہے۔ خدا خدا کر کے یہ ہنگامہ ختم ہوتا ہے اور میں لڑکھڑاتی ٹانگوں کے ساتھ اپنی میز کی جانب بڑھتا ہوں۔ وہ قتالہ میرے ساتھ ہے۔ میں نے اسے اپنی میز پر مدعو کیا ہے جسے اس نے قبول کر لیا ہے۔

"میرا نام عطا ہے"۔

"اور میرا نام ڈیبرا"۔

اب ہم ایک دوسرے سے باقاعدہ متعارف ہوتے ہیں۔ سازندوں کے لئے وقفہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہال میں صرف ہلکی ہلکی موسیقی سنائی دے رہی ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اس پر رقص کر سکتا ہے۔

"تم کس ملک سے تعلق رکھتے ہو"؟ ڈیبرا پوچھتی ہے۔

"بوجھو تو جانیں"۔

"سپین؟"

"نہیں"۔

"اٹلی"۔

"نہیں"

"میکسیکو؟"

"ہرگز نہیں"!

"چلو میں ہار مانتی ہوں، اب بتا دو!"

"اونہوں! ایک بار پھر دماغ پر زور ڈالو"۔

وہ باقاعدہ سوچ بچار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر ایک دم کھل اٹھتی ہے اور چٹکی بجا کر کہتی ہے "انڈیا"!

میں بالآخر اسے بتا دیتا ہوں کہ میں پاکستان سے ہوں۔

"پاکستان"! وہ کچھ سوچتے ہوئے کہتی ہے "وہی نا جہاں آج کل کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔"

"ہاں نیک خاتون! وہی پاکستان"۔ جل کر کہتا ہوں!

"یہاں کب آئے؟"

"دو سال قبل آیا تھا۔ صبح واپس اپنے وطن جا رہا ہوں۔ تم آخری امریکی لڑکی ہو جس سے مل رہا ہوں"۔

"سچ؟" ڈیبرا کے چہرے سے مسرت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ میں جانتا ہوں امریکی لڑکی کے لئے کسی مرد کی "خاتون اول" یا "خاتون آخر" ہونا بہت THRILLING ہے۔ اتنے میں وہی "اختصار پسند" ویٹریس پھر آ ٹپکتی ہے اور آرڈر لینے کے لئے جھکتی ہے۔

"رم اینڈ کوک" ڈیبرا آرڈر دیتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی مجھ پر واضح کر دیتی ہے کہ بل کی ادائیگی وہ خود کرے گی کیونکہ وہ باقاعدہ DATE پر یہاں موجود نہیں ہیں اور پھر وہ خم پر خم لنڈھانے لگتی ہے۔ یہ شغل اسی وقت سے جاری ہے جب سے میں اسے ہال میں دیکھ رہا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں لال لال ڈورے بھی تیرنے لگتے ہیں۔

"تم نے یہ تو بتایا نہیں امریکہ کیوں آئے"؟ ڈیبرا میٹھی نظروں سے دیکھتی ہوئی پوچھتی ہے۔

"گل رخوں کے لئے"۔



"اور اب واپس کیوں جا رہے ہو"؟

"گل رخوں ہی کے لئے۔"

"پھر تمہیں یہاں کے گل رخ کیسے لگے"؟

"جیسے دنیا بھر کے ہوتے ہیں۔ بے وفا، ستم گر، وعدہ کر کے بھول جانے والے!"۔ "چچ چچ" ڈیبرا شرارت سے مسکراتے ہوئے کہتی ہے "اگر تم کچھ عرصہ یہاں اور رہتے تو تم پر واضح ہوتا کہ سب محبوب ایسے نہیں ہوتے"۔

اس گفتگو کے دوران ڈیبرا کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھ رہا ہوں جسے صرف پسندیدگی ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ وجہ میں جانتا ہوں۔ وہ یہ کہ امریکی بلکہ دنیا بھر کی لڑکیاں ہلکی پھلکی گفتگو کی رسیا ہیں۔

"بائی دی وے، تمہیں کونسا سکرٹ اچھا لگتا ہے۔ میکسی، مڈی یا منی سکرٹ؟"

مائیکرو منی سکرٹ والی یہ قتالہ پھر شرارت آمیز سوال پوچھتی ہے۔ میں جواب میں "نو سکرٹ" کہتا ہوں اور اس کی جلترنگ ہنسی کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔

"تم جانتے ہو جب تم اپنے لہجے میں انگریزی بولتے ہو بہت بھلے لگتے ہو اور یہ بھی کہ تمہاری باتیں بہت مزے کی ہیں؟" ڈیبرا اب پوری طرح مائل بہ کرم ہے۔

"سچ مچ"؟ میں اپنے پاؤں تلے آسمان محسوس کرتا ہوں۔

"ہاں"...... وہ قریب جھک آتی ہے اور میرا جسم پگھلنے لگتا ہے۔

"مجھے کچھ کچھ یقین آنے لگتا ہے کہ اس کے دل میں رنگدار لوگوں کے لئے کوئی نفرت نہیں!

سامنے کی طرف نگاہ اٹھتی ہے تو میز پر ایک قدرے فربہ دوشیزہ بیٹھی نظر آتی ہے حرکتیں بتا رہی ہیں کہ وہ نشے میں پوری طرح دھت ہے۔ اس کے سامنے والی میز پر ایک نوجوان بیٹھا پورے غور و خوض سے اس کا جائزہ لے رہا ہے۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ

یہ میخوار بھی کسی اور دُھن میں بیٹھا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس سے مخاطب ہے۔

HAY CHICK, WHAT'S YOUR NAME?

وہ ایک آوارہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہتی ہے (چھاتیاں)!! MY NAME IS BOOBS چھاتیاں نوجوان اس غیر متوقع جواب پر بوکھلا کر پوچھتا ہے۔"وہ کس طرح؟"

وہ جواب میں اس جنس گرانمایہ کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر کہتی ہے۔

BECAUSE IGOT BIG BOOBS

یہ "مکالمات فلاطوں" سن کر میں ڈیبرا کی جانب دیکھتا ہوں تو اس کے چہرے پر ندامت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور وہ کہتی ہے "عطا! ہر قوم میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں یہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر امریکی دوشیزاؤں کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کرنا"۔

چنانچہ میں اس مشورے کو پلے باندھتا ہوں اور امریکی دوشیزاؤں بلکہ دنیا کے کسی بھی خطے کی لڑکیوں کے بارے میں اچھی رائے رکھنے کے عزم کا اظہار کرتا ہوں اور ساتھ ہی نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہوں کہ دوسرے روز علی الصبح کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ ڈیبرا بھی میرے ساتھ ہے۔ اس نے مجھے اپنی گاڑی میں میرے ہوٹل تک چھوڑنے کی فراخدلانہ پیش کش کی ہے۔ چنانچہ ہم باہر آتے ہیں مگر میں دیکھتا ہوں کہ ڈیبرا کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں اور وہ میرا سہارا لیے ہوئے ہے۔ بسا اوقات "الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے" کی دعا کئے بغیر بھی مدعا پورا ہو جاتا ہے۔ وہ سٹیرنگ پر بیٹھنے لگتی ہے مگر میں اسے ساتھ والی سیٹ کی طرف کھسکا دیتا ہوں اور خود اس کی جگہ لے کر اس سے پوچھتا پوچھتا کار ڈرائیو کرتا ہوا ہوٹل تک لے آتا ہوں۔



# نیویارک کا میزبان لاہور کا مہمان

اگلے روز صبح نو بجے تفریحی بس کے ذریعے نیویارک کے بعض دیگر حصے دیکھنے کا پروگرام تھا سو مقررہ وقت پر متذکرہ بس کے دفتر میں جا دھمکا۔ بکنگ کلرک نے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ، اقوام متحدہ، مجسمہ آزادی، چائنہ ٹاؤن، گرین وچ ولیج اور وال سٹریٹ کی سیاحت کو پروگرام کا حصہ بتایا۔ ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ، گرین وچ ولیج اور وال سٹریٹ کے بارے میں وضاحت کی کہ ان مقامات پر قیام نہیں کریں گے۔ بلکہ صرف سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر جائیں گے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ بھی نیویارک مارکہ کاروباری تکنیک تھی۔ اقوام متحدہ کی عمارت بھی چلتی بس میں سے دکھائی گئی۔ تاہم میں نے آٹھ ڈالرز زرنقد بکنگ کلرک کی ہتھیلی پر رکھے اور پھر گائڈ کی ہمراہی میں ایئرکنڈیشنڈ اور شیشے کی چھت والی بس میں بیٹھ کر ان مقامات کی سیاحت کو روانہ ہو گیا۔

بس میں قریباً چالیس زائرین تھے، ان میں سے کچھ تو امریکہ ہی کے مختلف مقامات سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ غیر ملکی تھے۔ گائڈ اپنے مخصوص امریکی مزاج کی چاشنی کے ساتھ عمارات اور سڑکوں پر رواں تبصرہ کر رہا تھا۔ اس وقت بس گرین وچ ولیج میں سے گزر رہی تھی۔ یہ بازار ہپیوں کی سرگرمیوں کے لئے مشہور ہے۔ سڑک پر ہپی ہی ہپی نظر آئے۔ پھر وال سٹریٹ میں سے گزرے اور بالآخر پہلی منزل آ پہنچی۔ یہ چائنا ٹاؤن تھا۔ جہاں ہم نے تقریباً ایک گھنٹہ قیام کیا۔ مجسمہ آزادی تک رسائی کے لئے بحری جہاز میں بیٹھنا پڑا اور یوں ایک ٹکٹ میں دو دو مزے لئے۔ لیکن بعدازاں کافی دیر تک جہاز

کے ہچکولوں سے طبیعت بدمزہ رہی اور ادھر پر شکوہ "مجسمہ آزادی" کی ہیبت بھی کافی دیر تک دل پر بیٹھی رہی۔

گو تفریحی بس والوں نے چائنا ٹاؤن اور مجسمہ آزادی دکھا کر زائرین کو گھر کا رستہ دکھایا مگر دل نے کہا اگر پردیس میں آکر بھی اقوام متحدہ نہ گئے تو دیس والوں کو کیا منہ دکھاؤ گے؟ کمر ہمت باندھو اور اس شہر ناپرساں کی دید سے آنکھوں کو منور کر لو۔ سو پاؤں نے تھکے ہوئے جسم کے ساتھ سیاسی تماش بینوں کے اس کلب کا رخ کیا۔ یہ عمارت گائیڈ کی رہنمائی میں سیاحوں کو دکھائی جاتی ہے۔ جب میں وہاں پہنچا ہوں مقررہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ تاہم میں نے اپنا بیگ سامان کی نگرانی پر متعین شخص کے حوالے کیا اور پھر میرے قدم اقوام متحدہ کے طول و عرض کو ماپنے لگے۔ اس کا "حدود اربعہ" تو پہلے سے ہی علم میں تھا، سلامتی کونسل کی زیارت جھروکے سے کی۔ جنرل اسمبلی کے پر شکوہ ہال میں داخل ہوا تو لپک کر سٹیج پر چڑھ گیا اور جی چاہا کہ وہ دھواں دھار تقریر کروں کہ ہمیشہ کی طرح ہال کے در و دیوار عش عش کر اٹھیں کہ یہاں کے مقررین کے مقدر میں ازل سے یہی در و دیوار بطور سامعین لکھ دیئے گئے ہیں۔

میرا جہاز رات کو ساڑھے دس بجے یورپ (لگژمبرگ) کے لئے روانہ ہونا تھا۔ نیویارک کی سڑکیں ماپتے ماپتے ٹانگیں دکھنے لگی تھیں اور عالم یہ تھا کہ اس کا سواں حصہ بھی نہ دیکھ پائے تھے سو یہ کہہ کے دل کو ڈھارس بندھوائی کہ یہ شہر خانہ خراب دو دن میں دیکھنا ممکن ہوتا تو یار لوگ اسے لکھتے وقت دو دفعہ نیویارک نیویارک کیوں لکھتے؟

یہ سوچ کر ذہن سے اس شہر کو مزید دیکھنے کی ہوس کا جامہ اتارا اور اپنے ہوٹل جا پہنچا کہ وہاں سے ایئرپورٹ روانہ ہو سکوں۔ یہیں اس کہانی کا دردناک انجام ہے۔ وہاں ملاقات ہوئی ایک شناسا سے جو اسی ہوٹل میں مقیم تھا۔ جب میں نے اپنا شبہ دور کرنے کے لئے اس سے کرائے کی بابت دریافت کیا تو اس ظالم نے چھ ڈالر بتائے۔ اس پر میں نے



عالم غیظ و غضب میں منیجر کے کمرے کا رخ کیا اور برہمی کے انداز میں نیویارک اور اس کے مکینوں کی عظمت و ہیبت کو یکسر نظر انداز کر کے کہا "منشی جی کیا ہم سے آپ کی ذاتی پرخاش ہے جو نو ڈالر زیادہ وصول کئے۔ ہمارے پیسے واپس کرو......" اس نے یہ الفاظ تو نہیں کہے مگر مفہوم کچھ اسی طرح کا تھا کہ یہاں سے غائب ہو جاؤ اور پیسوں کی واپسی کے بارے میں بھی بھول جاؤ۔ سو راقم الحروف وہاں سے غائب ہو گیا اور پیسوں کی واپسی کے بارے میں بھی بھول گیا مگر سیدھا اپنے کمرے میں گیا، وہاں نظر پڑی بیت الخلائی کاغذوں کے دو بنڈلوں پر۔ جو فلش سسٹم میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے کافی تھے۔ سو ان دونوں کو یکے بعد دیگرے کموڈ میں پھینکا اور زنجیر کھینچ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ یقین واثق ہے کہ نیویارک کا میزبان اور لاہور کا مہمان ایک دوسرے کی یاد سے اپنے سینوں کو ہمیشہ منور رکھیں گے۔

# جمالِ ہم نشین

اگر ٹی۔ڈبلیو۔اے(T.W.A) والے طوطا چشم نہیں تو وہ ہمارے اس احسان کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے کہ ہم نے سینٹ لوئیس سے نیویارک تک کا سفر اس فضائی کمپنی کے ذریعے طے کیا اور یوں ستر ڈالر کا بزنس دے کر کمپنی کی مالی حالت کو استحکام بخشا۔ پھر مسئلہ نیویارک سے لگزمبر (یورپ) تک جانے کا در پیش تھا۔ اس موقع پر ہمارے سیاسی شعور نے ہماری راہنمائی کی اور ہم نے فضائی کمپنیوں میں "طاقت کا توازن" برقرار رکھنے کے لئے اس بار ٹی۔ڈبلیو۔اے کی بجائے ایئر آئس لینڈک کو ذریعہ سفر بنایا۔ اس میں تین مصلحتیں پوشیدہ تھیں۔ ایک تو جیسا کہ ابھی عرض کیا، فضائی کمپنیوں میں "طاقت کا توازن" برقرار رکھنا مقصود تھا۔ دوسرے طبیعت شروع ہی سے مہم جوئی کی طرف مائل رہی ہے اور ایئر آئس لینڈک کے بارے میں یہ شنید تھی کہ ان کے پاس جو طیارے ہیں دنیا کے بہت سے عجائب گھر ان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر انہیں خریدنے کے لئے کمپنی سے گفت و شنید کر چکے ہیں۔ تیسرے (خدا اسے اصل وجہ قرار نہ دیں) امریکہ سے پاکستان تک کے سفر میں "ہاتھ کے میل" کی ضرورت تھی اور اس کمپنی کے ذریعے سفر کرنے سے اس جنس کی اچھی خاصی بچت نظر آئی۔ چنانچہ ان "ٹھوس" وجوہ کی بنا پر میں نے سینٹ لوئس ہی سے نیویارک کے آگے کا ٹکٹ ایر آئس لینڈک کا بنوالیا تھا۔

جہاز کو ساڑھے دس بجے شب کینیڈی ایئرپورٹ سے لگزمبرگ کے لئے پرواز کرنا تھا



مگر مسافر دس بجے ہی اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان ہو چکے تھے لیکن ہوا یہ کہ FLIGHT CONNECTING کے انتظار میں ہمارے جہاز کو قریباً ایک گھنٹہ ایئرپورٹ پر رکنا پڑا۔ اس دوران بے خبر مسافروں نے جنہیں فلائٹ کی تاخیر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا، ٹھیک ساڑھے دس بجے حفاظتی پٹیاں کمر سے باندھ لیں۔ پھر اس کے بعد انہوں نے ہر دو ایک منٹ کے بعد گھڑیاں دیکھنا شروع کر دیں۔ بعد ازاں جماہیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر بعض غیر ثقہ قسم کے مسافروں نے سیٹیاں بجانا شروع کر دیں اور کچھ تو باقاعدہ آوازیں کسنے پر اتر آئے۔ خدا خدا کر کے انتظار کی یہ گھڑیاں تمام ہوئیں اور جہاز کی روانگی کا اعلان کیا گیا۔ اس سے قبل مسافروں کو خوفزدہ کرنے کے لئے (کم از کم میرا تاثر تو یہی ہے) ایئر ہوسٹس نے جہاز کو کوئی خطرہ در پیش آنے کی صورت میں جان بچانے کے کچھ گر بتائے۔ یقین کریں اس کی باتوں سے دل میں اعتماد پیدا ہونے کی بجائے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ جہاز کی ہیئت کذائی، کرائے میں غیر معمولی رعایت، اور اوپر سے کمپنی کا فضائی کمپنیوں کی انجمن کا رکن نہ ہونا، یہ ایسے امور تھے کہ کمزور دل اشخاص کو اختلاج قلب بخشنے کے لئے کافی تھے اوپر سے جب ان محترمہ نے ہزاروں فٹ بلندی پر پرواز کرتے ہوئے جہاز سے چھلانگیں لگانے کی باتیں شروع کیں اور وہ بھی اس صورت میں کہ نیچے بحر الکاہل ٹھاٹھیں مار رہا ہو تو یقین جانیں، اپنے اگلے پچھلے سارے گناہ یاد آ گئے۔ یوں لگا بستر مرگ پر پڑے کسی شخص کے سرہانے سورۃ یاسین کی تلاوت کی جا رہی ہو! اے اولاد والو یہ منظر اپنی آنکھوں کے سامنے لاؤ اور پھر سچ سچ کہو اس ایئر ہوسٹس نے ہم ناتوانوں کے ساتھ جو کچھ کیا۔ ٹھیک کیا؟

اختلاج قلب کی یہ کیفیت خدا جانے کب تک قائم رہتی۔ اگر نگاہیں اپنے ہمسفروں پر نہ اٹھتیں جو میرے برابر میں بصد ناز و ادا مسند نشیں تھے، نگاہیں تو دراصل بیٹھتے ہی ان پر اٹھی تھیں بلکہ چار ہوئی تھیں مگر اس وقت یہ سوچ کر ان کی ہم

نشینی مزید تقویت قلب کا باعث ہوئی کہ یہ عورت ذات ہو کر یوں اطمینان سے بیٹھی ہیں تو میں کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں اور فکر فردا میں محو غم دوش رہوں؟ سو ان حیلے بہانوں سے دل کو فکر فردا سے نجات دلائی۔ آئندہ کے لئے "سود فراموشی" سے توبہ کی اور مزید "زیاں کاری" سے بچنے کے لئے ان سے گفتگو کا آغاز کیا۔ بیشتر اس کے کہ اس گفتگو کی روداد بیان ہو، پہلے ان سے تعارف ہو جائے۔

برابر والی دوشیزہ پنسلونیا سٹیٹ سے تعلق رکھتی ہے۔ سکول میں ٹیچر ہے۔ اپنے کسی بوائے فرینڈ سے ملنے ایتھنز (یونان) جا رہی ہے۔ نیلی آنکھیں، گندمی رنگ (کہ ماں کی طرف سے ریڈ انڈین ہے) شانوں تک کھلے بال، سکرٹ پہنے ہوئے ہے۔ نام میریلین ہے۔ عمر ستائیس اٹھائیس کے لگ بھگ! اس کے ساتھ فرانسیسی لڑکی زولا بیٹھی ہوئی ہے۔ کالی آنکھیں، سرخ و سفید رنگ۔ بیل بوٹم پہنے ہوئے ہے۔ عمر یہی کوئی اٹھارہ انیس برس جوانی کے دن، مرادوں کی راتیں! انگریزی اتنی ہی آتی ہے جتنی مجھے فرنچ!

جہاز نے پرواز کے لئے پر تولے تو میریلین نے مجھے ٹہوکا دیا۔ "حفاظتی پیٹی باندھ لو اور سگریٹ بجھا دو"۔

لفظ بہ لفظ تعمیل ارشاد کی عادت کبھی نہیں رہی سو سگریٹ تو بجھا دیا مگر حفاظتی پیٹی بدستور میری نظر التفات کو ترستی رہی!

"پیٹی باندھ لو، یہ تمہاری ہی حفاظت کے لئے ہے"۔ اس بار زولا نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں التجا کی۔

"زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر مقدر میں موت ہی لکھی ہے تو وہ اس عالم میں تو نہ آئے کہ ہاتھ پاؤں بندھے ہوں۔ غلامی کی موت سے بدتر تو کوئی موت نہیں"۔ میں نے اپنی ضد کو فلسفے کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس پر دونوں نے چپ سادھ لی۔



اتنے میں جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کیا اور پھر دوڑتا چلا گیا۔ اس کی رفتار میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا مگر وہ زمین سے اٹھ کر فضا میں آنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس بار میں نے میریلین کو ٹہوکا دیا اور کہا "پائلٹ کا ارادہ لگژمبرگ تک بائی روڈ جانے کا لگتا ہے"۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پائلٹ نے غالباً بعد میں اپنا ارادہ تبدیل کر لیا کیونکہ کچھ دیر بعد طیارہ فضا میں تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو جگمگاتا نیویارک میری نظروں کے سامنے تھا۔ بلڈنگوں اور بازاروں کی روشنیاں طیارے کی طرف لپکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ یہ روشنیاں نگاہوں سے دور ہوتی چلی گئیں اور پھر کچھ دیر بعد نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے جہاز اندھیرے کے سمندر میں ڈوب چلا ہو اور میں نے گھبرا کر نگاہیں اس منظر سے پھیر لیں۔

"ایک لطیفہ سنو گی......؟"

میں نے اپنے ہمسفروں کو جگائے رکھنے کی خاطر گفتگو کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنی سیٹیں پیچھے کی جانب پھیلا دی تھیں اور اب سونے کی تیاری میں مشغول تھیں۔

"سناؤ"

انداز کچھ ایسا تھا کہ سناؤ اور پیچھا چھوڑو!

انسان ڈھیٹ ہو تو بہت سے مسائل حل ہو جاتے ہیں، سو میں ڈھیٹ بن گیا۔ "ٹرین روانہ ہوئی تو ایک مسافر نے سلسلہ کلام شروع کرتے ہوئے اپنے ہم سفر سے پوچھا

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں"؟

"فلاں شہر کا باشندہ ہوں"!

"خوب! میں بھی وہیں رہتا ہوں"

"کس محلے میں رہائش ہے؟"

"فلاں محلے میں"!

"بہت خوب! میں بھی وہیں رہتا ہوں، آپ کا مکان کس جگہ ہے؟"

مخاطب نے محل وقوع بتایا تو وہ صاحب اچھل پڑے اور بولے "کمال ہے صاحب، حد ہو گئی میں بھی اسی مکان میں رہتا ہوں"۔

اس پر برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک مسافر سے نہ رہا گیا بولا صاحب! آپ عجیب قسم کے لوگ ہیں۔ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو نہیں جانتے"۔

اس پر ان میں سے ایک نے کہا "آپ خاموش رہیے جناب! ہم دونوں باپ بیٹے ہیں۔ یہ گفتگو صرف وقت گزارنے کے لئے ہو رہی ہے"۔

میریلین اور زولا دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ زولا نے میریلین کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر میری طرف جھکتے ہوئے فرانسیسی لہجے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا:

"میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ وقت گزاری کا مسئلہ واقعی اہم ہے تو لو پھر شروع ہو جاؤ...... تمہارا نام کیا ہے......؟"

"پیرزادہ محمد عطاء الحق قاسمی"۔

"ویٹ اے منٹ، ویٹ اے منٹ! یہ سارے کا سارا نام تمہارا اپنا ہی ہے؟"

"یہ تو نام کا ایک حصہ ہے۔ ابھی تو قاسمی کے بعد امرتسری، ثم لاہوری اور عفی عنہ، وغیرہ جیسے اہم حصے چھوڑ گیا ہوں"!

"یہ، کس می، کیا ہے"؟؟

'کس می' کا مطلب نہیں سمجھتیں"؟ میں نے پوچھا۔

"ہم فرانسیسیوں سے زیادہ اس کا مطلب کون جانتا ہوگا؟" زولا نے ہنستے ہوئے کہا" "میں تو صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے اسے نام کا حصہ کیوں بنایا"۔



"وہ یوں کہ لڑکیوں میں بہت پاپولر ہوں، جدھر سے گزر جاؤں 'کس می کس می' کی آوازیں آتی ہیں۔ اب تو یہ نام کا حصہ بن گیا ہے"۔

"تو مسٹر کس می......!

"یہ مسٹر کیا ہوا، صرف کس می کہو...... میں تکلفات کا قائل نہیں"۔

"نہ بابا" زولا نے شریر مسکراہٹ سے کہا "میں یہ رسک نہیں لے سکتی"۔

"تو چلو پھر قاسمی کہہ لیا کرو کہ اصل لفظ قاسمی ہی ہے"۔

"قیس می؟"

"قیس می نہیں، قاسمی"۔

"قاسمی؟" زولا نے زور لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں قاسمی"۔

"تو چلو، یہ قاسمی کیا ہے؟"

"تم اس بحث میں نہ پڑو۔ قاسمی کے بعد پوچھو گی کہ پیرزادہ کیا ہے۔ عفی عنہ کسے کہتے ہیں۔ امرتسری کیا بلا ہے، جب کہ ان میں سے کوئی لفظ ایسا نہیں جو بگڑ کر قابل قبول معنی دے۔ تم مجھے صرف عطا کہہ سکتی ہو"۔

اس اثنا میں جہاز ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے کو جھکا اور پھر بیٹھتا ہی چلا گیا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ تاہم کچھ ہی دیر بعد اس نے نارمل پرواز شروع کر دی۔ پتہ چلا کہ ہوا کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ میرے چہرے کی زرد رنگت بھی کچھ دیر بعد نارمل ہو گئی۔ جو مسافر ٹانگیں دراز کیے اونگھ رہے تھے، اس جھٹکے نے انہیں بیدار کر دیا تھا اور اب وہ ایک دوسرے سے محو کلام تھے۔

"آج کل جہازوں کے حادثات بہت ہو رہے ہیں"۔ اس بار میریلین بھی شریک گفتگو ہو گئی۔ جو ابھی تک میری اور زولا کی گفتگو کے درمیان محض مسکرانے پر اکتفا

کر رہی تھی۔اسے بیٹھے بٹھائے جانے یہ کیا بات سوجھی تھی۔

"ہاں، اللہ رحم کرے" میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں خالص مشرقی انداز میں اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارا جہاز بھی کسی حادثہ کا شکار ہو سکتا ہے، بلکہ اس کے زیادہ امکانات ہیں"۔

میریلین نے غالباً میری کیفیت بھانپ لی تھی اور وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔

میں نے رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا "بی بی تمہاری شکل اچھی ہے۔اگر باتیں بھی ویسی ہی کرو تو کیا حرج ہے؟"

"موت تو آنی ہی آنی ہے، پھر اس سے ڈرنا کیسا"؟ میریلین نے ایک وار اور کیا۔

تب میں نے جانا کہ دفاعی تکنیک سے دشمن کے حوصلے بلند ہو رہے ہیں۔اس پر میں نے پینترا بدلا اور کہا "میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ ایتھنز میں تمہارا بوائے فرینڈ کہیں ساری عمر انتظار ہی نہ کرتا رہے"۔

میریلین کے اندر کا خوف اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگا۔وہ سنجیدہ ہو گئی چنانچہ اس کے خوفزدہ ہونے سے میں اپنا خوف بھول گیا اور اسے مزید زچ کرنے پر تل گیا "دیکھو نا اگر یہ جہاز اس تاریک رات میں، نیچے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں جا گرے تو ہمارا پرسان حال شارک مچھلیوں کے علاوہ اور کون ہو گا؟ بڑے بڑے مگرمچھوں کے سوا ہماری موت پر کون آنسو بہائے گا! سوچو میریلین! یہ رات ہماری زندگی کی آخری رات بھی ثابت ہو سکتی ہے"۔

میریلین نے ایک جھرجھری سی لی، اس کی گہری جھیل ایسی نیلی آنکھوں میں خوف کے ڈورے تیرنے لگے پھر اس نے روتی آواز میں کہا:

"عطا! خدا کے لئے ایسا نہ کہو"۔



"کیا تم واقعی موت سے اتنی خوفزدہ ہو"؟ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

میریلین کے چہرے پر سنجیدگی کی لہر چھا گئی۔اس نے منمناتے ہوئے کہا۔"موت سے میں صرف اتنا ہی ڈرتی ہوں جتنا ہر شخص۔ لیکن میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ فریڈرک کہتا ہے میں تم سے شادی کروں گا۔یہ اقرار اس نے آٹھ سال بعد کیا ہے"۔

"یہ فریڈرک کون ہے؟"

"وہی جس سے ملنے کے لئے میں ایتھنز جا رہی ہوں۔وہ وہاں جہازوں کی ایک کمپنی میں کام کرتا ہے۔ میری اس سے پہلی ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ جہاں ہم دونوں چھٹیاں گزارنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔اس کے بعد سے میں کئی دفعہ ایتھنز جا چکی ہوں۔ایک بار وہ بھی امریکہ آیا تھا۔اب کے اس نے خط میں لکھا تھا کہ وہ آئندہ موسم بہار میں مجھ سے شادی کرے گا اس نے اس سلسلے میں اپنی ماں سے بھی بات کر لی ہے"۔

میریلین کے چہرے پر معصوم بچوں کی سی خوشی اور والہانہ جذبات نمایاں ہو گئے۔اس کی آنکھوں میں وہ چمک ابھر آئی جو زمانے کی نظروں سے بچ کر محبت کرنے والوں کے راز بھی افشا کر دیا کرتی ہے۔

"مگر تم صرف اسی سے شادی کیوں کرنا چاہتی ہو"؟ میں نے اس دوشیزہ سے پوچھا جو آنکھ بھر کے دیکھ لے تو جان سے بدن خالی ہو جائیں۔

"تم نے اسے دیکھا نہیں۔ ورنہ یہ سوال نہ پوچھتے"۔ میریلین نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کی رگ شرارت دوبارہ پھڑکی"۔ وہ پورا مرد ہے۔ایک بار اس سے مل لو تو لڑکی بننے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگو"۔

اس کے یہ ریمارکس سن کر میں بری طرح جھینپ گیا۔ میری جھلاہٹ دیکھ کر میریلین اور زولا دونوں کھڑ کھڑ ہنسنے لگیں تو میں نے کہا "اے نیک بیبیو! انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اللہ تعالیٰ یک طرفہ فیصلہ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔

دونوں ایک بار پھر ہنسنے لگیں "ہم نے تم سے یہ تو پوچھا نہیں کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو"؟ میریلین نے بات کارخ موڑنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے"۔ میرے لہجے میں جھلاہٹ باقی تھی۔

"چھوڑو بھی، بتاؤ کہاں کے رہنے والے ہو؟"۔

"تمہارا حافظہ بہت کمزور ہے، تعارف کے وقت بتایا تھا کہ میں پاکستانی ہوں"۔

"میرا مطلب ہے مشرقی یا مغربی پاکستان؟"

"مغربی پاکستان......!"

اب کے میں نے اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھے۔

"تمہاری فوج کے ہاتھ بے گناہ بنگالیوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ کیا تم مغربی پاکستانی ہونے کی حیثیت سے خود کو گلٹی محسوس نہیں کرتے"؟ میریلین کی آنکھوں میں غصہ تھا۔

اتنے میں ایئر ہوسٹس ہمارے پاس آئی اور اس نے گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے مشروب کے بارے میں پوچھا۔ میں نے گریپ فروٹ جوس کا آرڈر دیا۔ میریلین اور زولا نے وہسکی طلب کی۔!

"مجھے ایک بات بتاؤ"۔ میں نے پوچھا "کیا تم ویت نام کی جنگ کے بارے میں ہنوئی کی کسی نیوز ایجنسی کی خبروں پر لفظ بہ لفظ اعتبار کر سکتی ہو......؟"

"نہیں"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اس میں جانبداری کی جھلک کہیں نہ کہیں ضرور مضمر ہو گی"۔

"انڈیا اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں کچھ جانتی ہو"۔

"ہاں دونوں ایک دوسرے کو ناک آؤٹ کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ مگر تم یہ



کیوں پوچھ رہے ہو؟"۔

"اس لئے کہ تمہارے اخبارات میں اس معاملہ کے بارے میں جتنی خبریں شائع ہوئی ہیں وہ سب کی سب ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا نے جاری کی ہیں اور اس کا باقاعدہ حوالہ دیا جاتا رہا ہے"۔

"تمہارا مطلب ہے کہ بنگالیوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی؟"

"نہیں! انڈیا میں تربیت یافتہ مکتی باہنی کے سپاہیوں سے نبرد آزمائی کے دوران یقیناً بے گناہ لوگ زیادتیوں کا شکار ہوئے، میرا دل ان کے لئے روتا ہے۔ مگر میں ان محب وطن افراد کو بھی نہیں بھول سکتا جنہیں مکتی باہنی نے اپنے مظالم کا نشانہ بنایا۔ ظالم کوئی بھی ہو، وہ ظالم ہے اور مظلوم کوئی بھی ہو، وہ مظلوم ہے۔ اس میں تفریق نہیں کرنا چاہئے، مجھے افسوس ہے کہ تمہارے پریس نے اس ضمن میں کھلی جانبداری کا مظاہرہ کیا"۔

میریلین کے چہرے پر تاسف کے آثار نمایاں ہوئے اور اس نے کہا "ہمارا پریس واقعی صرف وہی تصویر پیش کرتا ہے جو وہ عوام کو دکھانا چاہتا ہے۔ اب تم سے بات ہوئی تو مسئلے کا دوسرا پہلو بھی سامنے آیا، ورنہ میں ہمیشہ یہی سمجھتی کہ تم لوگ بہت ظالم ہو"۔

بہت جی چاہا کہ کہہ دوں تم ایسے لوگ ہم ایسوں کا شروع ہی سے دل دکھاتے آئے ہیں اور ہم شروع ہی سے معاف کرتے چلے آئے ہیں، مگر کہہ نہ سکا کہ وہ سمجھ نہ پائے گی۔ سو ایک خاموش مسکراہٹ کے ساتھ میں نے اپنی سیٹ پیچھے کو سرکائی اور سونے کے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد مجھ پر غنودگی چھا گئی۔ دوبارہ آنکھ اس وقت کھلی جب ایئر ہوسٹس کی طرف سے آئس لینڈ کی آمد کا شہرہ بلند ہوا اور مسافروں سے حفاظتی پیٹیاں باندھنے کی درخواست کی گئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہمارا طیارہ قطب شمالی میں واقع آئس لینڈ کے دارالحکومت ریک جیوک کے ایئر پورٹ پر لینڈ کر رہا تھا۔

# یہ آئس لینڈ ہے

یہ آئس لینڈ ہے، جو قطب شمالی میں واقع ہے، وہی قطب شمالی جس کے متعلق آٹھویں کی جغرافیے کی کتاب میں پڑھا تھا کہ وہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے اور سننے میں یہ آیا ہے کہ یہاں کے لوگ بہت محنتی ہیں چنانچہ سال میں صرف ایک چھٹی کرتے ہیں۔ عشاق کے متعلق شنید ہے کہ وصل کی شب سے مستفید ہوتے ہوتے تھک جاتے ہیں اور یوں انہیں اس موذن سے شکایت پیدا نہیں ہوتی جس کم بخت کو عین پچھلے پہر خدا یاد آتا ہے۔ مصحفی کے متعلق پتہ چلا ہے کہ وہ یہاں "پاپولر" نہیں کیونکہ اس کا رویہ حقیقت پسندانہ نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی "ریپوٹیشن" زیادہ تر اس شعر سے خراب ہوئی ہے:

تیرے کوچے اس بہانے مجھے "دن سے رات کرنا"
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا

اس خطے کے متعلق جو دیگر معلومات ہمیں حاصل ہوئی ہیں۔ وہ بہت حیرت انگیز ہیں، مثلاً یہ کہ یہاں "جنریشن گیپ" کا مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ کیونکہ باپ اور بیٹے کی عمر میں بس "دنوں" ہی کا فرق ہوتا ہے۔ شادی کی رسوم بھی عجیب ہیں۔ بچہ ابھی بیس بائیس "دن" ہی کا ہوتا ہے کہ اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگر شادی صبح ہوئی ہے تو رات کے پچھلے پہر تک یہ خود دار والد صاحب بھی کہلانے لگتے ہیں۔ اللہ اللہ! ہتھیلی پر سرسوں جمانا اسی کو کہتے ہیں۔ گردش دوراں کے



ستائے ہوئے ہمارے ایک شاعر نے کہا تھا:

جی چاہتا ہے قطب شمالی میں جا بسیں!
تنگ آگئے ہیں روز کے شام و سحر سے ہم

سو ہمارا طیارہ اسی قطب شمالی میں واقع آئس لینڈ میں پون گھنٹہ کے لئے رکا تھا اور گو روز کے شام و سحر سے تنگ آئے ہوئے ہم بھی ہیں مگر اس قیام میں ہماری مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا سو اس عرصے میں ہم نے ڈیوٹی فری شاپ کا رخ کیا یا یوں کہہ لیجیے کہ اس ہجوم کے پیچھے چل دیئے جو سیل بلا کی طرح اس جانب رواں تھا۔ یہاں گرم کپڑوں کی فراوانی تھی۔ سوئٹر، موزے، دستانے، فر کے کوٹ۔ خواتین تو اونی کپڑوں کی خریداری یا کم از کم الٹنے پلٹنے میں مشغول ہوگئیں، اور مردوں نے شراب والے کاؤنٹر پر ہلہ بول دیا۔ دنیا بھر کی شراب کوڑیوں کے مول...... یار لوگوں نے جی بھر کر خریدی...... اس خاکسار نے رخ کیا سگریٹوں والے گوشے کا! چار کارٹن ونسٹن سگریٹ کے اپنے لئے اور دو کارٹن کیمل سگریٹ ہالینڈ میں مقیم اپنے پاکستانی دوست کے ولندیزی سسر صاحب کے لئے خریدے۔ یہ ان کا پسندیدہ برانڈ تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ونسٹن سگریٹ پاکستان پہنچ کر پینا شروع کریں گے تاکہ ہمارے "امریکہ پلٹ" ہونے میں کسی کو کوئی شبہ نہ رہے مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ جب گھومتے گھامتے استنبول پہنچے اور کچھ دن ترکی کے "کڑک" سگریٹ پئے تو بابر یاد آگیا، جس نے "بعیش کوش" کی نصیحت کی تھی، مگر ونسٹن شروع کرنے سے قبل ہم نے احتیاطاً اپنے ان ہم وطنوں سے جو تازہ تازہ رفیق سفر بنے تھے، پوچھ لیا کہ وہ سگریٹ نوشی ایسی عادت بد میں تو مبتلا نہیں ہیں۔ جواب اس کا انہوں نے یہ دیا کہ کبھی تھے مگر اب چھوڑ چکے ہیں۔

اس نکتے کا تو بعد میں علم ہوا کہ وہ سگریٹ پینا نہیں۔ سگریٹ خریدنا چھوڑ چکے تھے، مگر افسوس ہمارے "عالم" ہونے تک چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔

سگریٹوں کی خریداری کے دوران زولا میرے پاس آئی اور شکوے کے انداز میں بولی "تم کہاں تھے۔ میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی"۔

میں نے کہا "زہے نصیب! لیکن معاملہ کیا ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں"۔ اس نے فرانسیسی لہجے کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ "مجھے صرف یہ پوچھنا تھا کہ لکسمبرگ کے بعد تم کہاں جاؤ گے"؟

"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا" میں نے اسے بتایا "ممکن ہے ہالینڈ چلا جاؤں اور یہ بھی ممکن ہے پہلے پیرس جاؤں"۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ تم پیرس تک میرے ساتھ چلو" زولا نے کہا۔

"تمہارے نپولین صاحب نے تو یہی کہا تھا کہ دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں، مگر تم یہ کیوں چاہتی ہو"؟ میں نے پوچھا۔

"کیونکہ تم ابھی تک اچھے ہمسفر ثابت ہوئے ہو"۔ زولا نے سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا۔

"وہ اس لئے کہ میں جلد بازی پر یقین نہیں رکھتا"۔

میرے اس جواب پر زولا ہنسنے لگی اور موتیوں کی لڑی نے اسے اور حسین بنا دیا۔

"مذاق چھوڑو سنجیدگی سے بتاؤ، چلو گے"؟

"چلوں گا مگر وہاں اپنے مہمان کے ساتھ کیا سلوک کرو گی؟"

"سارا پیرس گھماؤں گی"۔

"اور؟"

"اور بس!" زولا نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں پھیلا کر کچھ اس ادا سے یہ جملہ کہا کہ جملہ حقوق محفوظ ہوتے ہوئے محسوس ہوئے اور میں نے فوراً اقرار میں سر ہلا دیا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میریلین ہاتھوں میں "اولڈ سمگلر" کی دو بوتلیں



دبوچے اونچی ایڑی والی جوتی پہنے ٹک ٹک کرتی ہماری طرف آتی دکھائی دی "یہ، لوبرڈز (LOVE BIRDS) یہاں کیا کر رہے ہیں"؟ اس نے آتے ہی شرارت آمیز مسکراہٹ سے پوچھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔ "ویسے اللہ تمہاری زبان مبارک کرے"۔

"اور یہ کیا اٹھا لائی ہو"؟ زولا نے شراب کی بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جہاز میں پارٹی دینے کا ارادہ ہے"؟ اور پھر ہنستے ہوئے چٹکی کے 'تال' پر کھڑے کھڑے جسم تھرکانے لگی۔

"یہ تو میں فریڈرک کے لئے لے کر جا رہی ہوں"۔ میریلین کی آنکھوں میں محبت اور وارفتگی کے جذبات سمٹ آئے"۔ میں نے اس کے لئے آفٹر شیو، اور کولون بھی خریدے ہیں"۔

# تمھاری کتنی بیویاں ہیں؟

اتنے میں جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا اور مسافروں سے التماس کی گئی کہ وہ اپنی اپنی سیٹ سنبھال لیں۔ میں، میریلین اور زولا آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سو گز کے فاصلے پر کھڑے جہاز کی طرف بڑھے۔ دروازے پر ایئر ہوسٹس کھڑی کاروباری دانت دکھا رہی تھی۔ باقی مسافر ابھی آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں لوگ اپنی اپنی نشست پر دراز ہو گئے جہاز روانہ ہونے کو تھا اور سیڑھی ہٹائی جانے کو تھی کہ ایک دبلا پتلا الم سلما امریکی، آنکھوں پر نظر کی عینک چڑھائے گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ ہم نے اس بار سیٹوں کی ترتیب بدل لی تھی۔ میریلین کھڑکی کی طرف تھی، زولا درمیان میں اور میں اس کے ساتھ۔ یہ "معنک" میرے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور مجھ سے کچھ کہنے سے قبل اس کی نظر پھسل کر زولا اور میریلین پر جا پڑی اور اس نے چہک کر کہا "ہائے گرلز"۔

"ہائے"۔ دونوں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

جہاز رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ اس نے سہارا لینے کے لئے بے تکلفی سے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور اب کے مجھے "ہائے" کہا۔ جواب میں اس عندلیب نے بھی ہائے کا نعرہ بلند کیا۔ مزید آہ و زاری کی نوبت یوں نہ آئی کہ اسے اپنی سیٹ نظر آ گئی تھی۔ اس نے مجھے تھپکی دیتے ہوئے "لکی مین" کہا اور بے دلی سے سامنے بیٹھے ہوئے دو گرانڈیل جوانوں کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ اب جہاز ایک بار پھر فضا میں تھا۔

میں ابھی حفاظتی پیٹی کھول ہی رہا تھا کہ میریلین نے زولا کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے



ہوئے میری طرف جھک کر اچانک پوچھا "تمہاری کتنی بیویاں ہیں"؟

یہ سوال چونکا دینے والا ضرور تھا مگر میرے لئے نہیں کیونکہ امریکہ میں قیام کے دوران بیسیوں افراد نے مجھ سے یہ سوال پوچھا تھا۔ ایک عام امریکی کی معلومات دوسرے ممالک کے بارے میں انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ بیشتر تو جانتے ہی نہیں کہ پاکستان نام کا کوئی ملک دنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ جو جانتے ہیں وہ اسے مشرق وسطیٰ کا کوئی ملک سمجھتے ہیں اور پھر اس کے بعد فلموں، ٹیلی ویژن، ناولوں اور اخبارات میں شائع ہونے والے سنسنی خیز مضامین اور کارٹونوں کے زیر اثر یہ سمجھتے ہیں کہ وہاں ہر گھر میں 'حرم' آباد ہے، لوگ خیموں میں رہتے ہیں اور واحد ذریعہ آمد و رفت اونٹ ہے۔ سو میریلین کا بیویوں والا یہ سوال میرے لئے نیا نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا "آٹھ سو!"

آٹھ سو! جیزز!" میریلین اور زولا حیرت سے اپنی نشستوں سے اچھل پڑیں۔ ان کی آنکھیں استعجاب سے پھٹی جا رہی تھیں۔

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ غریب آدمی ہوں، زیادہ کی استطاعت نہیں"۔

"یو مسٹ بی کڈنگ (YOU MUST BE KIDDING)"

"اس میں مذاق کی کون سی بات ہے۔ کیا تم نے اپنی فلموں میں شیوخ کے حرم نہیں دیکھے؟"

"دیکھے ہیں تبھی تو یہ سوال پوچھا تھا...... اور بچے؟"

"گیارہ سو!!!"

"اوہ خدایا! تم ان کے نام کیسے یاد رکھتے ہو"؟

"یہ تو ممکن نہیں۔ میں انہیں نمبروں سے پکارتا ہوں۔ آٹھ سو بائیس نمبر۔ بڑا پیارا

ہے"۔ ان کی آنکھوں میں شدید استعجاب ابھی تک موجزن تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے چہروں پر جوش و خروش جھلک رہا ہے اور وہ اس خیال سے پھولے نہیں سما رہیں کہ ان کے ساتھ ایک ایسا شخص سفر کر رہا ہے جس کے بارے میں 'آج تک انہوں نے صرف پڑھا ہی تھا یا فلموں میں دیکھا تھا۔ چنانچہ کرہ ارض کے اس عجیب و غریب باشندے میں ان کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"تم دو سال گھر سے باہر رہے ہو۔ اپنی بیویوں کو مس نہیں کرتے۔" میریلین نے ایک سوال اور پوچھا۔ "نہیں...... البتہ جب گھر لوٹوں گا، ان سے کچھ ضرور "مس" ہو رہی ہوں گی"۔

"آئی وونٹ بلیم دیم فار وہٹ (WON'T BLAME THEM FOR THAT) میریلین نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہارے پاس تو بہت اچھی نسل کے اونٹ بھی ہوں گے"۔ ایک اور متوقع سوال پوچھا گیا۔

"اونٹ اچھی نسل کا ہو یا بری نسل کا بہر حال اونٹ ہے"۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہین ہوتی۔ چلتا ہے تو یوں کہ فلک کج رفتار کو پسینہ آ جائے۔ ہمارے ہاں تو بیک وقت دو افراد کا اونٹ پر بیٹھنا غیر اخلاقی حرکت سمجھا جاتا ہے"۔

"سچ؟"

"ہاں! ویری کنزرویٹو پیپل "VERY CONSERVATIVE PEOPLE"

"تمہارے پاس کتنے اونٹ تھے؟" میریلین نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ "میں اونٹوں کا اتنا زیادہ شوقین نہیں لہذا میرے پاس صرف دو تھے"۔



"دو بھی کس لئے؟"

"ایک پر بیٹھ کر کالج جاتا تھا اور دوسرے کو واپسی کے لئے استعمال کرتا تھا۔ ان میں سے ایک ایئر کنڈیشنڈ، آٹومیٹک، پاور سٹیئرنگ اور پاور بریک تھا"۔

میریلین اور زولا دونوں کے چہروں پر مردہ سی مسکراہٹ کھیل گئی۔ میریلین نے کہا "میں اب سمجھی تم ہم سے مذاق کر رہے تھے"۔

لہجے میں ابھی تک تذبذب باقی تھا۔ یوں لگتا تھا گویا جی ہی جی میں دعا مانگ رہی ہو کہ یا خدا! یہ سب کچھ سچ ہو۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ دیر تک جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اس ڈرامے کا ڈراپ سین کر دیا تھا۔ چنانچہ جب میں نے انہیں بتایا کہ تم مغربی لوگ بہت بھولے ہو، سپر ریس کہلاتے ہو۔ مگر باہر کی دنیا کے متعلق تمہاری معلومات کا یہ عالم ہے تو ان کے چہروں پر شرمندگی کے آثار نمایاں ہوئے اور اس کے ساتھ ہی وہ تھرل THRILL بھی ختم ہو گئی، جو اس داستانوی شخص کے وجود سے پیدا ہوئی تھی، چنانچہ اب میں دوبارہ ان کے لئے ایک عام سا شخص تھا۔ اس سطح زمین پر رینگنے والے کروڑوں کیڑوں میں سے ایک کیڑا!

# اوئے فریڈرک تیرا ککھ نہ رہوے!

"تو کیا ابھی تک تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی؟" میر یلین نے غالباً اپنی زندگی کے سب سے بڑے دھچکے سے دوچار ہونے کے بعد پوچھا۔

"نہیں، وطن پہنچنے پر کراؤں گا"۔

"کیا تم نے اپنی شریک حیات کا انتخاب پہلے سے کیا ہوا ہے یا وہاں پہنچ کر تلاش شروع کرو گے؟"

"یہ کیا کفریہ کلمے بکنے لگی ہو۔ ہمارے ہاں شریک خیات کا انتخاب متعلقہ فریق نہیں ان کے والدین کرتے ہیں"۔

"ہاں یاد آیا، میں نے اس عجیب و غریب رسم کے بارے میں کہیں پڑھا تھا۔ مگر کیا وہ اس ضمن میں تم لوگوں کی رائے بھی نہیں لیتے؟"

"کیوں نہیں" میں نے وضاحت کی "وہ پوچھتے ہیں فلاں یا فلاں بنت فلاں تمہیں پسند ہے؟ اگر تم ہاں کہہ دو تو وہ تمہاری شادی وہاں کر دیں گے......اور اگر نہ کہو تو بھی کر دیں گے"۔

اس بار ان دونوں کا قہقہہ بہت بلند تھا۔ "تو کیا ایسی شادیاں جو ایک دوسرے کو دیکھے بھالے بغیر کی جائیں کامیاب ثابت ہوتی ہیں"؟ میر یلین نے پوچھا۔

"تم لوگ جو اتنا ٹھونک بجا کر شادی کرتے ہو، وہ کون سی کامیاب ہوتی ہیں"۔

یہ بات اس کے دل کو لگی مگر میرے نہیں کہ میں جانتا تھا جب ان میں نہیں بنتی تو



اپنے سماجی ڈھانچے کے سبب بڑی آسانی سے علیحدہ ہو جاتے ہیں جب کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے اور تمام عمر لڑائی مار کٹائی سے بھرپور کسی فلم کے کردار بنے رہتے ہیں۔

"تمہیں امریکی لڑکیوں میں سے کوئی پسند آئی؟"

"ناپسند تو میں نے کسی کو بھی نہیں کیا"۔

"فور گاڈ سیک، بی سیریئس۔" میر یلین نے ہنستے ہوئے کہا "میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ کوئی امریکی لڑکی اتنی پسند آئی کہ تمہارا جی اس سے شادی کرنے کو چاہا ہو؟"

"ہاں! مگر اس سے معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی"۔

"کونسا معاہدہ؟"

"وہی جو امریکہ جانے کے سلسلہ میں والد صاحب سے ہوا تھا اور جس کی ایک شق یہ تھی کہ تم وہاں نظریں نیچی کر کے چلو گے اور شادی تو بالکل نہیں کرو گے چنانچہ میں وہاں نظریں نیچی کر کے چلتا تھا۔ بس جس سے ٹکرانا ہوتا سیدھا جا ٹکراتا۔ سو میں نے وہاں شادی بالکل نہیں کی"۔

"اچھا اب یہ مسخرہ پن چھوڑو۔ سیدھی طرح بتاؤ تم نے وہاں شادی کیوں نہیں کی"؟ میر یلین بے تکلفی پر اتر آئی۔

"میں نے اپنے دو پاکستانی دوستوں کے انجام سے عبرت پکڑی"۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ان دوستوں نے وہاں امریکی لڑکیوں سے شادی کی اور میاں بیوی دونوں کا جینا حرام ہو گیا۔ وجہ صرف یہ کہ دونوں تہذیبوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جسے تم ہنسنا کہتے ہو، ہمارے ہاں اسے پھنسنا کہتے ہیں"۔

"اوہ ری ایلی؟ (OH REALLY)"

"YEH"

"اگر مردوں سے ہنس کر بات کرنے پر بھی پابندی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارے معاشرے میں "ہینکی پینکی" کا کوئی چانس نہیں" زولا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہم بڑے وضعدار لوگ ہیں۔ سب کام پردے میں کرتے ہیں"۔

"میں نے سنا ہے۔ مشرقی لڑکیاں بڑی وفادار ہوتی ہیں۔ ایک بار جس سے محبت کریں تمام عمر اسی کا دم بھرتی ہیں"۔

"ہاں میں نے بھی یہی سنا ہے"۔

زولا کے اس سوال نے مجھے مغموم کر دیا۔ وہ اس بارے میں کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھی مگر میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں نیند نہیں آ رہی؟"

اس نے مدھ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری باتیں نیند اڑانے کے لئے کافی ہیں"۔

ہمارے علاوہ باقی سبھی مسافر سو چکے تھے۔ ان کی گردنیں ڈھلکی ہوئی تھیں اور نتھنے کھلتے بند ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ تمام جہاز کی بتیاں گل تھیں البتہ ہر سیٹ کے ساتھ ایک چھوٹا بلب روشن تھا جس کی ہلکی ہلکی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جوڑا آزادی عمل کے فلسفے کو عملی جامہ پہنا رہا تھا۔ لم سلما امریکی آنکھوں پر عینک چڑھائے ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے کھنگھورا مارا۔ "اونہوں"! اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، عینک اتاری، شیشے صاف کیے اور ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر اور گردن بگلے کی طرح آگے کو نکال کر ایک بار پھر "تاڑی" لگانے میں مشغول ہو گیا۔

میں نے میریلین کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں بھی نیند تیر رہی تھی۔ مگر زولا ابھی سونے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے یوں اپنی طرف دیکھتے پایا تو غیر ارادی طور پر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ میریلین اونگھنے



لگی تھی۔ اس کی صراحی دار گردن کھڑکی کے ساتھ جا لگی تھی اور اس کی ریشمی زلفوں کا ایک حصہ اس کے حسین چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے چاند بدلیوں کی اوٹ میں چھپ رہا ہو اور بدلیاں چمک رہی ہوں۔

"اوئے فریڈرک تیرا بیڑا غرق ہو" میرے منہ سے رشک کے جذبات کا اظہار بے ساختہ ہو گیا۔

"کیا کہا"؟ زولا نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ انگریزی بولتے بولتے ذرا جبڑے دکھنے لگے تھے"۔

"ادھر بھی یہی عالم ہے"۔ زولا نے ہنستے ہوئے کہا اور اپنے جبڑے سہلانے لگی "یہ زبان بڑی تکلیف دہ ہے"۔

"تم نے انگریزی کہاں سے سیکھی؟" میں نے پوچھا۔

"جب میں نے سیاحت کے لئے امریکہ میں قدم رکھا، مجھے اس زبان کے کچھ ابتدائی الفاظ آتے تھے، جو میں نے سکول میں سیکھے تھے، شروع شروع میں تو بہت تکلیف ہوئی، مگر ان چھ مہینوں میں کچھ نہ کچھ سیکھ گئی ہوں۔ تمہاری باتیں کافی حد تک سمجھ آ جاتی ہیں مگر ناک میں بولنے والے ان امریکیوں کی گفتگو اب بھی مشکل سے پلے پڑتی ہے۔

ان چھ مہینوں میں کہاں کہاں جانے کا اتفاق ہوا؟"

"میں بہت گھومی ہوں۔ ویسٹ ورجینا۔ کیلیفورنیا، انڈیانا، اوہائے الی نوئے وغیرہ ریاستوں کے دور دراز قصبوں تک، ہچ ہائیکنگ کے ذریعے ہو آئی ہوں"۔

"اگر الینوائے جانے کا اتفاق ہوا ہے تو پھر یقیناً ملیوری سٹیٹ سے بھی تمہارا گزر ہوا ہو گا"۔

"میں نے تو وہاں ایک ہفتہ قیام بھی کیا ہے"۔

"کس شہر میں؟"

"مس پسی ریور کے کنارے واقع سینٹ لوئیس میں"۔

"سچ؟" میں نے خوشی سے اس کا بازو تھام لیا۔

"ہاں، مگر تم اتنے خوش کیوں ہوتے ہو؟"

"وہ اس لئے کہ میں نے اس شہر میں بہت وقت گزارا ہے۔ تم وہاں کس کاؤنٹی میں رہیں؟"

"سینٹ این کے ایگزیکٹو اپارٹمنٹس میں"۔

"وہ جو کوتک شاپ کے بالکل قریب واقع ہیں؟"

"بالکل وہی" اب کے وہ بھی اس خوشی میں شریک ہوگئی، جو اس طرح کے خوشگوار اتفاقات کے نتیجے میں فطری طور پر محسوس ہوتی ہے۔ "تم کہاں رہتے تھے؟"

"ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایئرپورٹ کے قریب واقع میمرٹ پارک اپارٹمنٹس میں۔ ویسے میں، ایگزیکٹو اپارٹمنٹس میں اکثر آیا جایا کرتا تھا وہاں بارہ نمبر میں میرا ایک پاکستانی دوست رہتا تھا"۔

"تمہیں یہ شہر کیسا لگا؟"

"جیسا بھی تھا۔ مگر اتنا عرصہ قیام کے باعث مجھے اس سے جذباتی لگاؤ سا پیدا ہوگیا ہے۔ تم نے آرک، چڑیا گھر اور فوریسٹ پارک وغیرہ دیکھا" میں بچوں کی طرح جوش و خروش سے باتیں کر رہا تھا۔

"ہاں میں ان سب جگہوں پر گئی ہوں مگر دن کے وقت۔ میرا دوست کہتا تھا یہاں رات کو باہر نکلنا خطرناک ہے"۔

"وہ ٹھیک کہتا تھا، خصوصاً ڈاؤن ٹاؤن کے علاقے یا ایسٹ سینٹ لوئیس کی طرف جانے سے پیشتر اقربا کو وصیت کرنا پڑتی ہے"۔

"اس کے علاوہ یہ بہت رجعت پسند سٹیٹ ہے۔" زولا نے کہا "میرا دوست یہاں سے



کسی دوسری ریاست میں مائیگریٹ کرنے کی سوچ رہا تھا!"

"بائی دی وے۔ یہ تم کس دوست کا ذکر کر رہی ہو؟"

"وہی جس کے ساتھ میں نے ایگزیکٹو اپارٹمنٹس میں ایک ہفتہ گزارا۔ واشنگٹن ڈی سی میں اس سے شناسائی ہوئی تھی۔ وہ یہاں گھومنے پھرنے آیا تھا۔ واپسی پر اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ میں تو پہلے ہی یہ سرزمین زیادہ سے زیادہ دیکھنا چاہتی تھی، سو اسی بہانے کار میں آتے ہوئے یہ درمیانی علاقہ بھی دیکھ لیا"۔

"پھر تم نے امریکہ کو کیسا پایا؟"

"بس ٹھیک ہے...... اور تم نے؟"

"بس ٹھیک ہے"۔ میں نے اسی کے انداز میں کہا۔

سفید موتیوں کی لڑی اس کی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ ایک بار پھر دکھائی دی ۔"تم وہاں کیا کرتے تھے!" اس نے اپنے دلکش فرانسیسی لہجے میں پوچھا۔

"لمز (LUMS) نامی ایک ریستوران میں کافی عرصے تک منیجر رہا ہوں۔ پورے امریکہ کے علاوہ سینٹ لوئیس اور اس کے وسیع و عریض گردونواح میں اس کی کئی شاخیں تھیں۔ چنانچہ میری ڈیوٹی ایک ہفتے کے دوران کبھی فلوریسنٹ، کبھی گرے وُے، کبھی لنڈبرگ اور کبھی دریا کے پار ریاست الینوئے کے ایک قصبے ایڈور ڈولز کی شاخ میں ہوتی۔ اس کے لئے مجھے ایک دن میں اسی اسی میل تک کار ڈرائیو کرنا پڑتی اور آٹھ گھنٹے کی اعصاب شکن ڈیوٹی اس کے علاوہ ہوتی۔ آنے سے پہلے "رماڈا ان" میں فوڈ اینڈ بیوریجز منیجر تھا"!

"پاکستان میں کیا کرتے تھے؟"

"ولیاں کھاتا تھا"۔

"کیا؟"

"کچھ نہیں ایک بار پھر جبڑوں کو آرام پہنچا رہا تھا"۔

"پھر تم پیرس میرے ساتھ چلو گے نا؟" زولا کو جانے بیٹھے بیٹھے دوبارہ یقین دہانی کی کیا ضرورت محسوس ہوئی کہ اس نے پھر یہ سوال پوچھ ڈالا۔

"تم ایسی خوبصورت لڑکی کے ساتھ تو میں جہنم میں جانے کے لئے بھی تیار ہوں"۔ میں نے کہا۔

"میں تمہیں خوبصورت لگتی ہوں؟" اس نے اس انداز سے پوچھا جیسے وہ اس سے زیادہ سننا چاہتی ہو۔

میں نے کنکھیوں سے ایک نظر میریلین پر ڈالی۔ حسن کی دیوی گہری نیند سو رہی تھی اور اس کے چہرے پر محبت کا دیوتا سایہ کیے ہوئے تھا۔ "اوئے فریڈرک تیرا ککھ نہ رہوے۔" میری زبان سے ایک بار پھر بے ساختہ رشک کے جذبات کا اظہار ہو گیا۔

"کیا کہا؟"

"میں نے کہا ہے کہ میں کبھی سوچتا تھا کہ حسن کی کوئی انتہا نہیں مگر آج اس کی انتہا دیکھ رہا ہوں۔" میں نے دزدیدہ نگاہوں سے میریلین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم مشرقی لوگ بہت رومانی ہوتے ہو"۔ زولا کی موٹی موٹی آنکھوں میں اپنائیت کے ڈورے تیرنے لگے اور وہ میری جانب جھک گئی۔

"میں پیرس ضرور چلوں گا"۔ میں نے زولا کے کان میں سرگوشی کی اور پھر نیند سے ہماری آنکھیں بوجھل ہوتی چلی گئیں۔

"گڈ مارننگ" ایئر ہوسٹس ناشتے کا ٹرے لیے کھڑی تھی۔ جہاز کے سبھی مسافر جاگ رہے تھے۔ گلاس کے پھول کی طرح ترو تازہ میریلین بیٹھی کافی کی چسکیاں لے رہی تھی اور زولا منہ ہاتھ دھونے کے لئے ٹوئلٹ میں تھی۔

"گڈ مارننگ" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے ہونقوں کی طرح باری باری دونوں کی



طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میریلین نے ہنستے ہوئے میرے گھٹنوں پر سے کمبل کھینچا اور بے تکلفی سے مجھے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ "جلدی دانت صاف کر کے آؤ میں ناشتے پر تمہارا انتظار کر رہی ہوں"۔

تینوں نے اکٹھے ناشتہ کیا اور ایک بار پھر گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ اب باقی مسافروں کی آوازیں بھی کان میں آ رہی تھیں۔ مگر چہروں سے تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ لکسمبرگ آنے والا تھا۔ لکسمبرگ جہاں سے میریلین کو اپنے دیوتا کے پاس یونان چلے جانا تھا اور میری بے چین روح کو یورپ کی خاک چھاننا تھی۔ بالآخر پورے چودہ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لکسمبرگ میں تھے۔ اور میں میریلین سے کہہ رہا تھا "ایئر آئس لینڈک میں سفر کرنے سے تو بہتر تھا میں اپنا اونٹ ساتھ لے آتا، ذرا جلدی تو پہنچ جاتے"۔

اور میریلین کی کھنکھناتی ہنسی میرے کانوں میں رس گھولنے لگی۔ زولا بھی اس ہنسی میں شریک تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم ہال میں کھڑے اپنے سامان کا انتظار کر رہے تھے۔ اور میری نظریں اپنے سامنے پھیلے ہوئے یورپ پر تھیں۔

# رفاقتوں کا ڈوبتا سورج

لکسمبرگ ایئرپورٹ کے چھوٹے سے ہال میں مسافر اپنے سامان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے اور یوں لگتا تھا جیسے اب انہیں انتظار کی گھڑیاں ناگوار گزرنے لگی ہیں۔ پورٹر سب سامان ایک جگہ اکٹھا کرتے جاتے تھے۔ اور مسافر تھکے تھکے انداز میں اپنے سامان کی پہچان میں مشغول تھے۔ کسٹم والوں سے گلوخلاصی کرا کے وہ اپنے ہم سفروں سے ہاتھ ملاتے اور ایک دوسرے سے حاصل کیے گئے پتوں پر خط لکھنے کے وعدے وعید کر کے رخصت ہو جانے لگے۔ زولا چیکنگ وغیرہ سے فراغت پا کر میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ جب کہ میریلین ابھی تک اس جھنجھٹ سے آزاد نہیں ہو سکی تھی، تاہم تھوڑی دیر بعد وہ سامان سے لدی پھندی میرے قریب آن کر کھڑی ہو گئی۔

"تم مجھے خدا حافظ نہیں کہو گے؟" اس نے آتے ہی دلکش مسکراہٹ سے کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اب میں تم سے رخصت ہونے والی ہوں" اس نے ادائے دلبری سے کہا۔

"مگر میں تمہاری رخصتی کا منظر نہیں دیکھ سکتا"۔

"تو ٹھیک ہے، میں تار دے کر فریڈرک کو بھی یہیں بلائے لیتی ہوں"۔ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ارے نہیں نہیں، میں ابھی پانچ منٹ میں تمہیں خدا حافظ کہتا ہوں" میں نے



جلدی سے کہا اور اپنا سامان ڈھونڈنے کے لئے لگیج روم کی طرف چل دیا، میرے سوٹ کیس وہاں نہیں تھے، تاہم پورٹر ابھی جہاز سے سامان لا رہے تھے اور اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی فراغت میں خاصی دیر ہے۔

"ابھی تو میرا سامان لگیج روم میں نہیں پہنچا"۔ میں نے واپس آ کر اطلاع دی۔ "تو پھر میں چلتی ہوں"۔ میریلین نے کہا۔ "فریڈرک نے لکھا تھا کہ زیادہ سے زیادہ سفر کم سے کم وقت میں طے کرنے کی کوشش کرنا"۔

اس پر میرے منہ سے ایک بار پھر "اوئے فریڈرک" والا نعرہ بے ساختہ نکل گیا جس پر زولا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ غالباً وہ سمجھ گئی تھی کہ میں بار بار اجنبی زبان میں یہ فقرہ جبڑوں کو آرام پہنچانے کے لئے نہیں، دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے ادا کرتا ہوں۔

"ابھی تم نے یہ کیا کہا؟" زولا کے ہنسنے پر میریلین نے تجسس کے انداز میں پوچھا۔

"میں نے کہا تھا کہ دنیا میں ایک شخص عطاء الحق قاسمی بھی ہے۔ کبھی اس دیوانے کی بھی خبر لو"۔

"او، آئی جسٹ لو ہم (OH,I JUST LOVE HIM)" میریلین نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور آگے بڑھ کر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں"۔ اس نے بھنوؤں کو چھوتی ہوئی پلکیں اٹھا کر میری طرف تکتے ہوئے کہا اور اپنا سامان اٹھانے کے لئے جھکی۔

"کچھ دیر کے لئے اور رک جاؤ"۔

"نہیں عطا! مجھے جلدی پہنچنا ہے، اب مجھے جانے دو"۔ زولا نے آگے بڑھ کر اس کے گلابی گالوں کو بوسہ دیا اور الوداعی کلمات کے ساتھ اسے رخصت کر کے ہال کے دوسرے کنارے کی طرف چلی گئی۔

اس اثنا میں جہاز کے اکثر مسافر قواعد و ضوابط کے مراحل طے کر کے اپنی اگلی

منزلوں کو روانہ ہو چکے تھے۔ چنانچہ اب ہال میں صرف چند لوگ بیٹھے نظر آتے تھے۔ ایک سوئیس (SWISS) جوڑا، ایک بوڑھا انگریز اور تین جرمن لڑکیاں زولا ہال میں لگی مشین میں سے کوکا کولا کی بوتل نکال کر ایک کونے میں کھڑی چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی لگتی تھی۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے چند مزید سکے مشین میں ڈالے اور پھر ایک بوتل میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "لو، فی الحال اسی سے غم بھلانے کی کوشش کرو"۔

میں نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے پوچھا "مسرت تو آنے جانے والی چیز ہے صرف غم پائیدار ہے۔ مگر تم کس غم کی بات کر رہی ہو؟"

"میریلین کی جدائی کا غم!" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ میریلین!" میں نے عاشقانہ انداز میں دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرد آہ بھری اور ایک بار پھر خود پر غیر سنجیدگی کا وہ خول چڑھا لیا، جو زندگی کی بے رحمیوں کے خلاف ڈھال کا کام دیتا ہے۔ "میں کتنا بدقسمت ہوں کہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اسے اپنے حرم میں شامل ہونے پر آمادہ نہ کر سکا۔ میری آٹھ سو بیویوں میں سے اسے یقیناً ایک ممتاز مقام حاصل ہوتا"۔

"تم اس مسخرے پن سے اپنے دل کے جذبات چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ میرا مقصد تم سے شکایت نہیں، صرف ہمدردی کا اظہار کرنا تھا۔ ہم ابھی اس مقام تک نہیں پہنچے کہ ایک دوسرے کی سرگرمیوں پر اعتراض کر سکیں...... ہم صرف دوست ہیں" زولا نے چہرے کو جذبات سے عاری بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟ ہم ایک دوسرے کی سرگرمیوں پر اعتراض نہیں کر سکتے اور یہ کہ ہم صرف دوست ہیں؟ تم ذرا کسی لڑکے سے ہنس کر بات تو کر کے دیکھو اسے "کانی آنکھ" کے ساتھ گھر نہ بھیجوں تو کہنا"۔ میں نے ایک امریکی محاورے پر ہاتھ صاف کرتے



ہوئے مصنوعی غصے سے کہا۔

"کیا تمہیں میرا کسی اور سے گھلنا ملنا واقعی ناگوار گزرے گا؟" زولا نے سب کچھ بھول کر ایک عجیب لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! بشرطیکہ اس کی وجہ سے تم مجھ سے "گھلنا ملنا" چھوڑ دو" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

زولا کے چہرے کی اداسی عود کر آئی۔ "تم بہت عجیب آدمی ہو۔ میں تمہیں ابھی تک سمجھ نہیں سکی شناسائی کی اس مختصر مدت میں کسی کو سمجھنا آسان بھی تو نہیں۔ مجھے میرے دوست بجا طور پر "سٹوپڈ" (STUPID) کہتے ہیں"

لگیج روم میں کچھ اٹیچی پڑے تھے۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو ایک کونے میں اپنا سوٹ کیس پڑا دکھائی دیا مگر دوسرا کہیں نظر نہ آیا۔ اس پر میں نے کاؤنٹر کا رخ کیا اور کلرک سے پوچھا کہ آیا جہاز کا سب سامان یہاں پہنچ گیا ہے۔ اس نے انگریزی نما کسی زبان میں جواب دیا۔ جس کا مفہوم میری سمجھ میں یہ آیا کہ ہاں سب سامان پہنچ گیا ہے۔ میں نے اس سے اپنے دوسرے اٹیچی کے بارے میں پوچھا تو ایک بار پھر اس کے لب ہلتے دکھائی دیئے اور اندازہ مین نے یہ لگایا کہ وہ اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کر رہا ہے۔ اس پر میں گھبراہٹ کے عالم میں واپس زولا کے پاس گیا اور اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

"اب کیا ہوگا؟" اس نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں صرف انتظار کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے سامان حاصل کئے بغیر میں یہاں سے ٹل نہیں سکتا"۔

زولا کے چہرے پر تھکن کے آثار نظر آئے۔ اس پر مین ایک بار پھر کاؤنٹر کلرک کی طرف گیا اور ناگواری کے عالم میں اس سے بات کی اور اس نے جواب میں غالباً مجھے یہ

سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس معاملے میں بے بس ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ میرا موڈ آف ہو گیا۔

"مجھے نجانے مزید کتنا انتظار کرنا پڑے۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ تم پیرس کی گاڑی پکڑو اور میں یہاں سے فراغت پا کر ہالینڈ میں اپنے ایک دوست کی طرف سے ہوتا ہوا تمہارے پاس پیرس پہنچ جاؤں؟" میں نے زولا سے واپس آ کر کہا۔

"نہیں میں تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ لمحے گزار سکتی ہوں"۔ اس نے تھکے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر میں کوفت کے لمحات میں تمہیں شریک نہیں کرنا چاہتا"۔ میں نے اس کے جذبات مجروح ہونے سے بچانے کے لئے الفاظ کا سہارا لیا۔ اس نے جواب میں میری طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا واقعی تم چاہتے ہو کہ میں تم سے پہلے روانہ ہو جاؤں؟"۔

"ہاں! تاکہ مجھے احساس ہو کہ پیرس میں کوئی میرا انتظار کر رہا ہے"۔

"تو پھر پیرس میں میں تمہارا انتظار کروں گی"! اس نے انداز محبوبیت سے میرے بہت قریب آ کر کہا "مگر وعدہ کرو کہ جلد آؤ گے"۔

"وعدہ"! ایک قدم میں نے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "مگر میرے وہاں پہنچنے پر تم بھی اپنے وعدوں کا پاس کرنا"۔

اس کے جواب میں زولا کی ہنسی میرے کانوں کے بالکل پاس سنائی دی!



# آپل وارن کی ایک شام

رات کے بارہ بجے کے قریب میری گاڑی ہالینڈ کے ایک قصبہ آپل وارن (APELDOORN) کے سٹیشن پر کھڑی تھی اور میں اپنا سامان پلیٹ فارم پر دھرے اس قصباتی سٹیشن کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس چھوٹے سے نیم تاریک پلیٹ فارم کے ایک کونے میں چھوٹا سا سنیک بار تھا جہاں چقندر ایسی رنگت والی ایک بھاری بھرکم ولندیزی عورت سفید ایپرن پہنے چیزیں سمیٹنے میں مشغول تھی۔ گاڑی میں سے چند مقامی لوگ اترے جو دوسرے شہروں میں کام کاج سے فارغ ہو کر اب رات گئے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے...... سنیک بار والی موٹی عورت کو غالباً انہی کا انتظار تھا مگر ان میں سے کوئی بھی کافی پینے کے لئے یہاں نہیں رکا تھا۔ وہ صرف ہاتھ کے اشارے سے WISH کر کے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔ پلیٹ فارم پر دھرے بنچ خالی نظر آ رہے تھے۔ ریلوے کا ایک مقامی ملازم کیپ ہاتھ میں لیے جمائیاں لیتا ہوا ایک بنچ کی جانب بڑھ رہا تھا...... سنیک بار سے ذرا آگے ایک بک سٹال تھا جو بند پڑا تھا۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی تو سب مسافر جا چکے تھے اور گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے رینگ رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک سوٹ کیس اٹھایا اور بیگ گلے میں لٹکا کر پلیٹ فارم سے باہر نکل آیا۔ گیٹ پار کرتے ہی آپل وارن کا قصبہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ بستی کے درودیوار چاندنی کی جھیل میں ڈوبے ہوئے تھے...... میری نظروں کے عین سامنے ایک سڑک روشنی کی مدھم سی لکیر کی طرح دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔

دونوں طرف کی دکانیں بند تھیں اور ہو کا عالم تھا۔ یوں لگتا تھا، کسی داستان کے جادوگر نے اس بستی پر سحر کیا ہوا ہے۔ بائیں ہاتھ پر ایک ریستوران تھا جس کے نیون سائن میں ہالینڈ کی مشہور زمانہ بیئر HEINEKEN کی تصویر اجاگر تھی، ذرا فاصلے پر ٹیکسی سٹینڈ اور دائیں جانب بس سٹینڈ تھا مگر یہاں بھی سناٹوں کا راج تھا۔

مجھے یہاں ایک تو ایسے قصبوں کی رومانیت اور دوسرے ارشد کی کشش لائی تھی، ارشد جو لاہور میں، پھر اس کے بعد امریکہ میں میرا ہمسایہ تھا۔ اب کچھ عرصہ سے اپنی ولندیزی بیوی ایلس کے ساتھ یہاں مقیم تھا۔ وہ امریکہ آنے سے کچھ عرصہ قبل ہالینڈ میں رکا تھا اور ایلس سے اس کی شناسائی یہیں ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ارشد امریکہ چلا آیا مگر اس کی شناسائی نے یہاں بھی اس کا پیچھا کیا اور یہ قضیہ بالآخر شادی پر ختم ہوا...... شادی کے بعد یہ خاتون خاصی "پاور فل" لیڈی ثابت ہوئی اور ارشد دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اشاروں کا پابند ہو کر رہ گیا۔ میاں بیوی کچھ عرصہ امریکہ ہی میں رہے مگر ایلس کو ہالینڈ کی یاد مسلسل ستاتی رہی اور بالآخر وہ ارشد کو واپس ہالینڈ لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔ واپسی پر ان کی محبت کا ایک بلبلاتا ثبوت بھی ان کے ہمراہ تھا جس کا نام انہوں نے جواد تجویز کیا۔

امریکہ سے روانگی سے قبل ٹیلی فون پر ارشد سے میری بات چیت ہوئی تھی۔ اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان جاتے ہوئے تم سے ملاقات کے لئے آؤں گا۔ احتیاطاً اس کا ٹیلی فون نمبر بھی میں نے نوٹ کر لیا تھا، یہ نمبر اس کے سسرال کا تھا اور اس نے کہا تھا کہ سٹیشن سے مجھے یہاں اطلاع دے دینا۔ مجھے پیغام مل جائے گا اور میں تمہیں لینے آ جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے جیب سے پچیس سینٹ کا سکہ نکالا اور قریبی ٹیلی فون بوتھ سے ارشد کا دیا ہوا نمبر ملایا۔

"ٹرن......ٹرن" دوسری طرف سے گھنٹی سنائی دی اور پھر کسی مرد نے ریسیور اٹھایا



"ہالو!"

یہ یقیناً ارشد کا سسر تھا اور اس نے یہ "ہالو" اتنے زور سے کہا تھا کہ میرے کان میں خارش ہونے لگی۔

"میں ارشد کا دوست ہوں اور امریکہ سے آیا ہوں"۔ میں نے کان میں انگلی پھیرتے ہوئے اپنا حدود اربعہ بیان کیا۔

"نو انگلش...... نو انگلش"۔ دوسری طرف سے ہسٹریائی انداز میں جواب ملا۔

"او کے، نو انگلش، بٹ، ارشد، فرینڈ، امریکہ"۔ میں نے شارٹ ہینڈ میں اپنا موقف واضح کرنے کی کوشش کی جو قدرے کامیاب ہوئی اور پھر ادھر سے شارٹ ہینڈ ہی میں جواب موصول ہوا۔

"ارشد کیم...... ناؤ گان"

"مائی میسج...... ریلوے سٹیشن!"

"نو۔ نو!" اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے ٹیلی فون بند کر دیا گیا۔

اس مرد شریف کے اطوار سے مایوس ہو کر میں نے اپنا سامان اٹھایا اور آہستہ آہستہ ٹیکسی سٹینڈ کی جانب چلنے لگا۔ ابھی دو قدم ہی چلا تھا کہ روشنی میں نہا گیا اور پھر ایک ٹیکسی میرے قریب آ کر رک گئی۔ ڈرائیور نے اتر کر میرا سامان ڈکی میں بند کر دیا۔ اور پھر سٹیرنگ پر بیٹھ کر ہونقوں کی طرح میرا منہ تکنے لگا گویا پوچھ رہا ہو کہ اب کیا عزائم ہیں؟ میں نے ڈائری میں سے ارشد کا پتہ نکال کر اس کے آگے رکھ دیا 342 KRUIZEMUNT STARAT APELDOORN۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر نیند میں ڈوبے ہوئے اس قصبے کی فضاؤں میں ہلچل پیدا کرتا ہوا چیختے ویلز کے ساتھ بائیں جانب کی ایک سڑک کو مڑ گیا۔

یہ کوئی کاروباری علاقہ تھا مگر لوگ دکانیں بند کر کے کب کے گھروں کو جا چکے تھے

صرف نیون سائن آن تھے۔ جن سے کاروبار کی نوعیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ البتہ ایک انڈونیشی ریستوران ابھی تک کھلا تھا اور بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکیوں میں سے کچھ لوگ اندر بیٹھے نظر آرہے تھے۔ ذرا آگے کراسنگ کے قریب ایک سپر مارکیٹ تھی جس کی شیشے کی دیواروں پر چسپاں اشتہارات کے ذریعے معزز گاہکوں کو یہ نوید سنائی گئی تھی کہ فلاں کوپن دکھانے پر انہیں گاجریں 80 سینٹ کی بجائے صرف 69 سینٹ میں دستیاب ہوسکیں گی اور وہ جوس کی بوتل ایک گلڈ اور دس سینٹ کی بجائے صرف 89 سینٹ میں خرید سکیں گے۔ ٹریفک سگنل کراس کرتے ہی بائیں ہاتھ پر "ڈائی خراف ہیئر ڈریسر" کی دکان پر نظر پڑی۔ یہاں شوکیس میں استرے اور قینچیاں سجی ہوئی تھیں۔ بعد میں ارشد کی زبانی پتہ چلا کہ ڈائی خراف صاحب خاندانی نائی ہیں اور قصبے میں جنم لینے والی کم از کم دو نسلوں کی حجامت بنا چکے ہیں۔ یہاں سے بائیں جانب مڑتے ہی دکانوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور سرکاری دفاتر دکھائی دینے شروع ہوئے، یہ قدرے کھلی سڑک تھی اور اس کے ایک جانب فرانسیسی کار "پی زو" کا شوروم بنا ہوا تھا۔ کچھ دور آگے ایک خوبصورت نہر دکھائی دی جس کے کنارے کچھ کشتیاں کھڑی تھیں۔

نہر عبور کرتے ہی رہائشی علاقہ شروع ہوگیا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے مکانات کے سلسلے تھے۔ چونکہ یہ گھر سڑک کے کنارے واقع تھے اس لئے کہیں کہیں لوگوں نے نچلے حصوں میں دکانیں بھی بنالی تھیں۔ پچاس گز کے فاصلے پر ایک اور کراسنگ سے ڈرائیور نے ٹیکسی دائیں جانب موڑلی اور اس کے ساتھ ہی ہم بڑی سڑک سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی گلی میں داخل ہوگئے۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا اور چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والے قدیم طرز کے مکانات دم بخود کھڑے تھے۔ ان کے جھروکوں میں سے ہلکی ہلکی روشنی چھن کر باہر کو آرہی تھی۔

یہاں سے ٹیکسی ساکت فضاؤں میں تلاطم پیدا کرتی ہوئی ایک اور گلی میں مڑی جہاں



بڑی بڑی کرینیں اور عمارتی سامان بکھرا ہوا تھا۔ اس علاقے کا نام SEVEN HUISEN (سیون ہاوزن) یعنی "سات گھروں کا علاقہ" تھا اور یہ ایک زیر تعمیر ماڈرن کالونی تھی۔ اس علاقے میں سات سات گھروں پر مشتمل بلاک بنائے گئے تھے۔ تعمیر کے کام کی وجہ سے سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی تاہم ذرا آگے چل کر یہ بہتر ہوگئی کیونکہ اب ہم اس بستی کے مکمل طور پر تعمیر شدہ حصے میں پہنچ چکے تھے۔ تین بلاک گزرنے کے بعد ڈرائیور نے گاڑی بائیں جانب کی ایک گلی میں موڑی اور پھر ایک مکان کے پچھواڑے میں کھڑی کردی۔

342 KRUIZEMUNT STARAT اس نے مکان کے باہر لگی نمبر پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اتر کر ڈکی میں سے سامان نکالنے لگا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کرائے کے علاوہ کچھ رقم اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

"وانکے ویل (شکریہ)" اس نے گردن کو خم دے کر کہا اور پھر "ڈاخ" (خدا حافظ) کہتے ہوئے گاڑی واپس موڑلی۔ اس "ڈاخ" پر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے غلیل میں کنکر لپیٹ کر ٹین کے کنستر پر دے مارا ہو۔

میں نے چند قدم چل کر دروازے کے باہر لگی بیل (BELL) پر انگلی رکھ دی۔ رات کے سناٹوں میں دوسری منزل سے گھنٹی کی آواز سنائی دی اور چند لمحوں بعد لکڑی کی سیڑھیوں میں ارتعاش پیدا ہوا، کوئی سیڑھیاں اترتا ہوا آرہا تھا ٹھپ۔ ٹھپ۔ آہستہ آہستہ یہ صدر دروازے کے بالکل قریب پہنچ گئی اور پھر کسی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ تیکھے نقوش اور سانولے رنگ کا ارشد گاؤن پہنے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے پہچاننے کی کوشش کی اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ "ارے بونگے، تم......!"

"ہاں، اے زیرک انسان...... میں!" میں نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا

"آؤ، اوپر آجاؤ"۔ اس نے میرے ہاتھ سے ایک سوٹ کیس تھامتے ہوئے کہا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ پہلے فلور پر دائیں جانب ایک کمرہ تھا۔ ارشد نے سامان ایک کونے میں رکھ کر مجھے کمرے کی واحد کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا اور خود سامنے چارپائی پر دراز ہو گیا۔

"کس حال میں ہیں یاران وطن؟" اس نے پہلی بار کسی مصرعے کے ساتھ بدسلوکی سے گریز کرتے ہوئے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں، بلکہ دھاندلی مچائی ہوئی ہے!" میں نے بتایا۔

"کیا مطلب؟"

"تم دھاندلی کا مطلب نہیں سمجھتے۔ یار وہی جو ایلس کے امریکہ پہنچنے سے پہلے تم نے مچائی ہوئی تھی"۔

"ہا۔ ہا" اس نے خوش ہو کر قہقہہ لگایا "اب صرف یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ اچھا چھوڑو یہ باتیں پھر ہوں گی۔ پہلے بتاؤ کھانا کھاؤ گے؟"

"نہیں۔ کھا کے آرہا ہوں۔ ایلس کہاں ہے؟"

"وہ سو رہی تھی۔ تمہاری گھنٹی کی آواز سن کر جاگی ہے، میں اسے بلا کر لاتا ہوں، تمہیں مل کر وہ بہت خوش ہو گی"۔

وہ اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف گیا اور تھوڑی دیر بعد کچھ دبی دبی آوازیں سنائی دیں، پھر یہ آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں۔ ان میں ایلس کی آواز بہت بلند تھی اور ارشد اپنی آواز بھینچ کر آہستگی سے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ایلس کی آواز بلند ہوتی چلی گئی اور پھر یہ قریب قریب چیخوں میں بدل گئی۔

"نیں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ اسے آدھی رات کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ یہ سونے کا وقت ہے کسی کے ہاں جا کر مہمان بننے کا نہیں"۔



"ایلس، فار گاڈ سیک۔ آہستہ بولو۔ وہ اتنی محبت سے ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے ہمیں ملنے آیا ہے۔ اس نے اگر سن لیا تو کیا سوچے گا" ارشد کی بھنچی بھنچی آواز سنائی دی۔

"مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ تم کمرے سے نکل جاؤ، مجھے تنہا چھوڑ دو"۔ اس کے بعد چیزیں گرنے کی آواز کانوں میں آئی اور پھر کھڑاک سے دروازہ بند ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد میرے سامنے کھڑا تھا۔ "یار تمہاری بھابی کی طبیعت خراب تھی اس لئے میں نے اسے تمہارے بارے میں نہیں بتایا۔ امید ہے تم مائنڈ نہیں کرو گے"۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ سخت پریشان نظر آرہا تھا۔

"ارے اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ صبح ناشتے کی میز پر ملاقات ہو جائے گی۔ تم آؤ میرے پاس بیٹھو"۔ میں نے ارشد کی کیفیت دیکھ کر دکھ کے شدید جذبات دباتے ہوئے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ بکھیر کر کہا۔

"نہیں۔ تم بہت تھکے ہوئے لگتے ہو، آرام کرو۔ صبح کھل کر باتیں ہوں گی" ارشد نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا اور پھر گردن جھکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

آپل دارن نے اپنے بازو میرے لئے وا نہیں کیے تھے۔

صبح نو بجے کے قریب ارشد میرے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے آہستگی سے مجھے جگایا۔ میں رات گئے تک شدید کرب کے عالم میں جاگتا رہا تھا۔ چنانچہ اس وقت میری آنکھیں کھلنے میں نہیں آرہی تھیں۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے ارشد کی طرف دیکھا تو اس کا دھندلا دھندلا سا چہرہ نظر آیا اور پھر آہستہ آہستہ یہ چہرہ صاف ہوتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور چہرے پر اداسی کی لکیریں بہت گہری تھیں، لگتا تھا جیسے وہ بھی رات بھر نہیں سو سکا تھا۔ اس نے مجھے جاگتے پایا تو چہرے کو مسکراہٹ سے آلودہ کر لیا۔ پھر میرے جسم پر سے چادر گھسیٹ کر پرے پھینک دی"۔ اب اٹھو گے بھی یا یونہی پڑے

منہ بسورتے رہو گے؟" اس نے خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور سلیپر گھسیٹتا ہوا ٹائلٹ کی جانب چل پڑا اور منہ ہاتھ دھو کر اور دانتوں کی صفائی وغیرہ سے فراغت کے بعد میں واپس اپنے کمرے کی جانب آنے لگا تو ارشد نے برابر کے کمرے سے پکارا "ادھر آ جاؤ"۔ میں نے ادھر کا رخ کیا تو وہ ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا۔ اس نے برابر والی کرسی میرے لئے سرکائی اور میں اس پر براجمان ہو گیا۔

دودھ کے دو گلاس اور کچھ سینڈوچ ایک پلیٹ میں پڑے تھے۔ میز کے درمیان میں لکڑی کا ایک خوبصورت گلدان دھرا تھا جس میں تازہ پھول سجے ہوئے تھے۔ یہ "ڈائننگ روم" "ڈائننگ روم ہی کے ایک حصے میں بنایا گیا تھا۔ میں نے ادھر نظر ڈالی تو ڈرائنگ روم کے درمیانی حصے میں موٹی لکڑی کی رومن اسٹائل گول میز نظر آئی، اس سے پرے سرخ رنگ کی لکڑی کی چار کرسیاں ایک ترتیب سے دھری تھیں، کمرے کے دائیں کونے میں اسی رنگ کا ایک پنگھوڑا نظر آیا جو یقیناً جواد کے لئے تھا۔ کمرے کی دیواریں پھولوں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور اس سے ڈچ لوگوں کی پھولوں سے معروف زمانہ محبت کا ثبوت ملتا تھا۔ میں ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ ارشد نے دودھ کا گلاس میری طرف سرکایا اور پیار لہجے میں پوچھا۔ "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں، میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس قوم کو پھولوں سے کس قدر محبت ہے؟"

"میں سمجھا، تم ناشتے کی میز پر ایلس کی راہ دیکھ رہے ہو"۔ ارشد کے ضمیر کی چبھن اس کے ہونٹوں پر آ گئی"۔ صبح صبح اس کا والد اسے آ کر لے گیا تھا۔ انہیں کہیں جانا تھا جواد بھی ان کے ساتھ ہے وہ کہہ رہی تھی میری طرف سے عطا سے معذرت کر دینا"۔ ارشد نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں" حالانکہ مجھے ایک بار پھر دل پر بوجھ محسوس ہوا اور یوں لگا کہ نوالہ میرے حلق میں پھنس کر رہ گیا ہو۔ "تم سناؤ آج کل کیا کر رہے ہو؟"



"ایمسٹراڈیم کی ایک فرم میں ایگزیکٹو پوسٹ پر ہوں۔ ایمسٹراڈیم یہاں سے سو میل کے فاصلے پر ہے۔ صبح ٹرین میں جاتا ہوں۔ شام کی ٹرین میں واپس لوٹ آتا ہوں"۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تم ایسٹراڈیم ہی میں کوئی مکان کرایہ پر کیوں نہیں لے لیتے"۔ میں نے پوچھا۔ "ہالینڈ میں مکانات کی سخت قلت ہے۔ تاہم جس شہر میں آپ نوکری کر رہے ہوں وہاں رہنا آپ کا حق ہے، مگر اس کے لئے بھی سٹی کونسل سے اجازت لینا پڑتی ہے"۔

"اگر یہ بات ہے تو سٹی کونسل سے اجازت کیوں نہیں لے لیتے؟ کیا اس میں کچھ دشواریاں پیش آتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں"۔ ارشد نے ہچکچا کر کہا "مگر تم جانتے ہو ایلس امریکہ سے یہاں اپنے والدین کی خاطر آئی تھی۔ اسے اپنے ماں باپ سے بہت پیار ہے۔ وہ انہیں چھوڑ کر ایمسٹراڈیم جانا بھی پسند نہیں کرتی"۔

کچھ اندازہ تو پہلے سے ہی تھا کہ ارشد ایلس کے خاصے دباؤ میں ہے۔ اس کا ایک مزید ثبوت ارشد کی اس گفتگو سے بھی مل گیا۔

"تو گویا اس امر کا کوئی امکان نہیں کہ تم کبھی پاکستان واپس جا کر اپنے والدین کے ساتھ رہائش اختیار کرو؟" میں نے ایک ایسی بات پوچھ لی کہ ارشد کے چہرے پر حزن و ملال کے تاثرات دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ نہیں پوچھنی چاہئے تھی۔

"میں نے ایلس سے اس مسئلہ پر دو ایک بار بات کی ہے مگر وہ اس پر رضامند نہیں، آغا جان نے کئی بار لکھا بھی ہے کہ وہ بہت ضعیف ہو گئے ہیں۔ اب ان سے بزنس نہیں سنبھالا جاتا۔ مگر میں مجبور ہوں"۔

"ہاں یاد آیا"۔ میں نے گفتگو کا رخ موڑنے کے لئے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے

اٹھ کر کہا۔ "میں تمہارے سسر کے لئے کیمل سگریٹ کے دو کارٹن لایا ہوں۔ امریکہ میں تم نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا کہ وہ یہ سگریٹ بہت رغبت سے پیتے ہیں اور یہاں یہ سگریٹ باآسانی دستیاب نہیں"۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا، ارشد کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ "وہ اس تحفے سے بہت خوش ہوگا"۔

میں نے سوٹ کیس کھولا اور سگریٹ نکال کر ارشد کے سپرد کر دیئے۔

"میرا سسر بہت نائس آدمی ہے، تم اسے ملے ہو؟" اس نے پوچھا۔

اس پر مجھے وہ گفتگو یاد آگئی جو اس نے گزشتہ رات ٹیلی فون پر مجھ سے کی تھی۔

"ملاقات تو نہیں ہوئی، البتہ ٹیلی فون پر بات چیت ضرور ہوئی تھی"۔

"کیا مطلب؟" ارشد نے حیرت سے پوچھا۔

"رات کو میں نے اسے اسٹیشن سے فون کیا تھا تاکہ تمہیں میری آمد کی اطلاع ہو سکے"۔

"رات کو؟" ارشد نے ایک بار پھر حیرت سے سوال کیا۔ "رات کو میں اور ایلس تو قریباً ساڑھے گیارہ بجے تک وہیں تھے۔ تم جب ہمارے ہاں پہنچے اس وقت ہمیں گھر پہنچ کر سوئے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی"۔

"جب میں نے ٹیلی فون کیا، تم لوگ بہر حال وہاں نہیں تھے"۔

"تم بونگے کے بونگے ہی رہے۔ اس سے درخواست کرتے کہ وہ تمہاری آمد کے بارے میں مجھے اطلاع کر دے۔ وہ بہت شریف انسان ہے کبھی انکار نہ کرتا"۔ ارشد آہستہ آہستہ نارمل ہو رہا تھا۔

"جی تو چاہا کہ اس شریف انسان کے ہتک آمیز رویّے کے بارے میں اسے بتلا دوں مگر پھر میں نے ہونٹ سی لئے کہ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں نکلے گا کہ میرے



اس بھولے بھالے دوست کی اداسیاں عود کر آئیں گی۔

"تم کل لکسمبرگ کس وقت پہنچے؟" ارشد نے کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی ٹرے میں برتن اٹھائے ہوئے تھے اور اب وہ انہیں دھونے کے لئے باورچی خانے میں لے جا رہا تھا۔

"دوپہر سے قبل پہنچ گیا تھا"۔

"دوپہر سے قبل؟ پھر یہاں اتنی رات گئے کیوں پہنچے؟ لکسمبرگ اور ہالینڈ کے درمیان تو صرف ایک آدھ ملک پڑتا ہے اور ان میں سے تو بعض ملک ہمارے ہاں کے بڑے شہروں سے بھی چھوٹے ہیں"۔

"لکسمبرگ ریلوے اسٹیشن کے بکنگ کلرک کی بیوی کی وجہ سے لیٹ ہو گیا تھا"۔ میں نے جواب دیا۔

"کیا......؟" ارشد نے باورچی خانے سے قریباً چیخ کر کہا "اب لوگوں کی بیویوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگے"۔

"ارے نہیں" میں نے ہنس کر کہا۔ "بات صرف اتنی ہے کہ ہالینڈ کا ٹکٹ لینے سے قبل ایک معمولی سی بات پر بکنگ کلرک مجھ سے الجھ پڑا۔ پھر بات اتنی بڑھی کہ صرف کھڑکی کی سلاخوں کی وجہ سے ہاتھا پائی نہ ہو سکی۔ لگتا تھا کہ وہ صبح بیوی سے لڑ کر آیا ہے چنانچہ اس نے بیوی کا انتقام مجھ سے لیا۔ اس نے میرا ٹکٹ اس طرح کا تیار کیا کہ آپل دارن تک پہنچنے کے لئے مجھے چار گاڑیاں تبدیل کرنا پڑیں۔ راقم الحروف سارے رستے گاڑیاں بدلنے کے چکر میں رہا، سو جب آپل دارن پہنچا تو آدھی رات ادھر اور آدھی ادھر ہو چکی تھی۔

"تم بڑی شے ہو!" اس نے باورچی خانے سے نکلتے ہوئے اپنے مخصوص COMMENTS دیئے۔ وہ خوشگوار موڈ میں تھا اور لگتا تھا ایلس کی طرف سے پیدا کردہ تلخی

اب مکمل طور پر اس کے ذہن سے اتر چکی ہے۔ ”دو منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ قصبے کا ایک چکر کاٹ کر آتے ہیں“۔ اس نے نادر شاہی حکم جاری کیا اور پھر کچھ دیر بعد ہم قصبے کے مرکز میں لے جانے والی سڑک پر تھے۔

رات کو جو قصبہ میں نے نیند میں ڈوبا ہوا پایا تھا، اب وہ آہستہ آہستہ انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ آج ہفتے کی وجہ سے چھٹی تھی اور یوں لوگ ابھی تک اپنے گھروں ہی میں تھے، تاہم کہیں کہیں کوئی بوڑھا ڈچ یا کوئی HOUSE WIFE ہاتھ میں ٹوکری پکڑے سودا سلف خریدتی نظر آ جاتی......ایک چھ سات سالہ گول مٹول بچہ اپنی ننھی سی سائیکل پر سوار ہاتھ ہلاتا ہوا میرے قریب سے گزر گیا۔ سڑک شیشے کی طرح صاف اور شفاف تھی۔ یہاں دو رویہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکان نظر آ رہے تھے۔ گھروں کے آگے مختصر سی جگہ میں لوگوں نے کیاریاں بنائی ہوئی تھیں جن میں اودے اودے، نیلے نیلے اور پیلے پیلے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ان مکانوں کے بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکیوں میں سے ڈچ بیویاں گھر کے کام کاج میں مشغول نظر آ رہی تھیں۔ قصبے کے لوگ ارشد سے خاصے مانوس دکھائی دیتے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر کچھ دیر کے لئے رکتے، حال احوال دریافت کر کے ”ڈاخ“ کا نعرہ بلند کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔

رہائشی علاقے سے نکل کر ہم بازار میں آ گئے۔ میں رات کو جس سنسان راہگذر سے گزرا تھا۔ اب وہاں زندگی رواں دواں تھی۔ تمام دکانیں کھلی تھیں اور لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ تاہم ان کی آہستہ روی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلدی میں نہیں ہیں۔ پیدل سوار اور سائیکل سوار لوگوں کے ریلے میں کہیں کہیں کار بھی نظر آئی۔ رستے میں جنسی رسالوں کی ایک دکان تھی جس میں ایک ڈچ بوڑھا انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھ کر داخل ہو رہا تھا۔

”قصبے کے لوگوں کا جنس کے بارے میں کیا رویہ ہے؟“ میں نے ارشد سے پوچھا جو



ریشم ایسے بالوں اور شگفتہ چہرے والی ایک لڑکی کو بری طرح گھورنے میں مشغول تھا۔

”ہونہہ، کیا کہا؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”میں پوچھ رہا تھا کہ شادی کے بعد بھی ان حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے؟“

”میں نے کیا کیا ہے؟ یونہی ذرا ایک نظر دیکھ رہا تھا۔“ اس نے کھسیانے ہو کر کہا۔

”قصبے کے لوگوں کا جنس کے بارے میں کیا رویہ ہے؟“ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ ”وہ اسے ایک نارمل چیز سمجھتے ہیں۔ نہ اس سے خوفزدہ ہیں، نہ اس کے پیچھے دیوانے ہیں۔ یہاں PERVETION بہت کم ہے۔

”تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟“ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”میں؟“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ ”میں شادی کے بعد اپنی زندگی میں ایک بڑا خلا محسوس کرتا ہوں“۔ پھر اس نے بات ٹالتے ہوئے ایک طرف اشارہ کر کے پوچھا ”یہ دائیں ہاتھ ایک بڑا سا میدان دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں دیکھ رہا ہوں، پارکنگ لاٹ ہے اور کیا ہے؟“

”یہ تمہیں اس وقت پارکنگ لاٹ دکھائی دے رہا ہے مگر ہر سیٹر ڈے نائٹ کو یہ منڈی کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لوگ ہفتے کی شام کو یہاں چھوٹی چھوٹی دکانیں کھڑی کر لیتے ہیں اور رات کو انہیں دوبارہ اکھاڑ کر واپس لے جاتے ہیں۔ آج اتفاقاً ہفتہ ہے، رات کو ادھر آئے تو تمہیں ایک تماشا دکھاؤں گا“۔

”کیسا تماشا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جو تم نے لاہور کی سبزی منڈی میں کئی بار دیکھا ہوگا مگر فرق یہ ہے کہ دیوانگی کے عالم میں آوازیں لگانے والے ہنکارے وہاں میلی سی دھوتی میں اور یہاں قیمتی قسم کے سوٹ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں گنڈیریاں بیچنے والا اگر انہیں ”پیڑے“ کہہ کر بیچتا ہے تو یہاں بھی یہ لوگ چیخ چیخ کر گاجر کو سیب قرار دے رہے ہوتے ہیں“۔

استنے میں ہم ایک کراسنگ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ بائیں جانب وہی انڈونیشی ریستوران تھا جو گزشتہ رات بارہ بجے بھی آباد نظر آیا تھا۔

"یہاں بہت اچھا کھانا ملتا ہے، کیا خیال ہے؟" ارشد نے پوچھا۔

"نیک خیال ہے"۔ میں نے کہا اور اندر داخل ہو گئے۔

ہال میں صرف ایک میز خالی تھی۔ باقی نشستوں پر ٹماٹر کی طرح سرخ گالوں والی لڑکیاں اور لڑکے براجمان تھے۔ ارشد نے کھانے کا آرڈر دیا۔ سوپ تو کچھ دیر بعد ہی آگیا۔ البتہ کھانا میز پر لگنے میں دس پندرہ منٹ صرف ہو گئے۔

"یار پاکستان بہت یاد آتا ہے"۔ ارشد نے سوپ کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں، تمہیں کیا یاد آتا ہے؟"

"نہیں تم جس بارے میں سوچ رہے ہو میرا اشارہ اس طرف نہیں"۔

"بھلا کس طرف؟"

"تم فرزانہ کی بات کر رہے ہو نا؟"

"ہاں میرا دھیان اسی کی طرف گیا تھا، مگر تمہارا اشارہ اس کی طرف کیوں نہیں، کسی زمانے میں تو پاگل ہوئے جاتے تھے"۔

"وہ تو ٹھیک ہے" ارشد نے کہا "مگر تم پوری کہانی سے شاید واقف نہیں ہو؟"

"وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ اس پر اس نے یہ رام کہانی سنائی۔

"ہالینڈ روانہ ہونے سے ایک دن قبل فرزانہ اور میں گھنٹوں ایک ریستوران میں بیٹھے رہے۔ اس نے رو رو کر اپنی آنکھیں سجالی تھیں۔ وہ کہتی تھی مجھے یوں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے ان دنوں ہم سب پر باہر جانے کا جنون کس طرح سوار تھا۔ سو میں اپنا پروگرام کسی صورت تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ ایک سال کے اندر اندر میں واپس آجاؤں گا اور تم سے شادی کروں گا۔ یہ بات میں نے پورے خلوص



سے کہی تھی کیونکہ مجھے اس سے حقیقتاً محبت تھی بلکہ سچ پوچھو تو آج بھی ہے۔ بہر حال ہم اس شام سخت دل گرفتگی کے عالم میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ میں نے اپنے ایک عزیز دوست باسط کا پتہ دیا کہ میں اس کی معرفت خط لکھا کروں گا۔ وہ اس کے دفتر سے وصول کر لیا کرے۔ اور پھر میں ہالینڈ چلا آیا"!

"پھر؟"

"پھر کیا! ہوا یوں کہ چھ مہینے بعد ان دونوں نے آپس میں شادی رچالی!"

کہانی میں موجود المیہ عنصر کے باوجود انجام تک پہنچتے پہنچتے بے ساختہ میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"تم دانت کیوں نکال رہے ہو"۔ ارشد نے غصے سے پوچھا۔

"اس لئے کہ میں عرصہ ہوا ایک بات کی تہہ تک پہنچ چکا ہوں"۔

"کس بات کی تہہ تک پہنچے ہو ذرا پتہ تو چلے؟"

"بات یہ ہے کہ جس طرح جوان ہونے پر لڑکوں کا سب سے بڑا مسئلہ نوکری کا حصول ہوتا ہے اسی طرح بالغ ہونے پر لڑکیوں کی سب سے بڑی خواہش گھر بسانے کی ہوتی ہے جسے ہم "عشق" سمجھ بیٹھتے ہیں۔ وہ دراصل قدرے CHOICE کا مسئلہ ہوتا ہے اور اس CHOICE میں بوقت ضرورت ردوبدل بھی ہو سکتا ہے"۔

"بات تو تم کچھ ٹھیک ہی کہہ رہے ہو"۔ ارشد نے کچھ سوچ کر کہا "بلکہ یہ اصول دنیا کے ہر ملک کی لڑکیوں پر لاگو ہوتا ہے"۔

"ہوتا ہوگا، تم یہ بتاؤ، جواد کیسا ہے۔ میں کل سے آیا ہوں مگر ابھی تک اسے دیکھ ہی نہیں سکا"۔ میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے"۔ اس ذکر سے ارشد کے چہرے پر رونق آگئی۔ دفتر سے تھکا ہوا لوٹتا ہوں تو اسے پنگھوڑے میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھ کر سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ ہالینڈ

میں وہی میرا ایک رفیق ہے"۔

بات کا رخ پھر اسی سمت کو مڑنے لگا تھا جس سے میں گریز چاہتا تھا مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ ارشد کا دھیان ایک بار پھر گزشتہ رات کے واقعے کی طرف چلا جائے اور اس کے چہرے کی اداسیاں عود کر آئیں۔ سو میں نے ارشد سے اٹھنے کے لئے کہا۔ اس نے بل ادا کیا اور تھوڑی دیر بعد ہم دوبارہ گھر کے راستے پر تھے۔

گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہم کمرے میں داخل ہوئے تو سامنے ڈرائنگ روم میں ایلس کھڑی نظر آئی۔ جواد پنگھوڑے میں لیٹا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے اسے ہلا رہی تھی اس نے ہمیں دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کی طرف گیا اور قریب پہنچ کر "ہیلو" کہا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور ہیلو کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ ارشد دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی...... اس نے آگے بڑھ کر ایلس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر اسے کھٹ سے بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد دونوں کی آوازیں باہر سنائی دینے لگیں۔ ارشد کا لہجہ منت سماجت کا تھا اور ایلس زور زور سے چیخ رہی تھی "نہیں...... نہیں...... نہیں" کافی دیر تک یہ شور سنائی دیتا رہا۔

پھر یہ آوازیں آہستہ آہستہ کم ہوتی گئیں اور پھر کمرے میں مکمل سکوت طاری ہو گیا۔

ارشد نے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ میں کمرے میں ایک میگزین پر نظریں جمائے اپنا دھیان اس جھگڑے سے ہٹانے کی کوشش میں مشغول تھا مگر شدت احساس کے باعث میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ ارشد میرے سامنے بچھی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"عطا ایک بات کہوں برا تو نہ مانو گے؟" اس کی آنکھیں ایک بار پھر ویرانیوں کے کھنڈر میں بھٹک رہی تھیں۔

"کہو" میں نے میگزین سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔



"ایلس تمہارے بے وقت آنے پر کل سے کچھ خفا ہے...... تم......"

"پہلے ایک بات بتاؤ"۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "اس کی خفگی کی صرف یہی ایک وجہ ہے یا اس کا باعث تمہارے اپنے الجھے ہوئے خانگی حالات ہیں؟"

"کچھ سمجھ لو۔ میں تم سے صرف یہ گزارش کرنے لگا تھا...... مگر پہلے وعدہ کرو کہ برا نہیں مانو گے!"

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہ ہو گی"۔ میں نے مظلومیت کی اس تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم ایلس سے معذرت کر لو۔ اس کا غصہ فرو ہو جائے گا گو وہ بہت سنکی عورت ہے مگر دل کی صاف ہے۔" ارشد منمنایا۔

"مگر کس بات کی معذرت!" میں نے اس سارے عرصے کے دوران پہلی بار غصے سے بے قابو ہو کر کہا۔

"یہی رات کو لیٹ پہنچنے کی خدا کے لئے میری خاطر" اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور لہجے میں بے چارگی رچی ہوئی تھی۔

میں نے اٹھ کر اپنا بکھرا ہوا سامان ایک کونے میں جمع کیا اور ارشد کا بازو پکڑ کر کہا۔

"آؤ"

ایلس اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی تھی اور چیخنے چلانے کے باعث اترے ہوئے میک اپ کو درست کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا تو منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر اسے مخاطب کیا۔ "ایلس مجھے افسوس ہے میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف پہنچی۔ میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں"۔

اور اس کے ساتھ ہی میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

دوسرے کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنا سامان اٹھایا اور واپس ارشد کے پاس آ کر کہا

"میں اب چلتا ہوں، مجھے اجازت دو"۔

"نہیں اب تم نہیں جاؤ گے" ایلس نے آگے بڑھ کر کہا اس کے چہرے پر فتح و کامرانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی طمانیت جھلک رہی تھی۔

ارشد بت بنا کھڑا تھا۔

"نہیں ایلس میں نہیں رک سکتا۔ مجھے بہر حال آج ہی جانا ہے۔ بہت بہت شکریہ"!

"میں تمہیں نہیں روکوں گا"۔ اچانک ارشد نے آگے بڑھ کر بھیگی آنکھوں سے کہا "آؤ۔ میں تمہیں خدا حافظ کہوں"۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے گلے سے لپٹا لیا......

میرے شانوں پر آنسوؤں کے دو قطرے جذب ہوئے اور تیر کی طرح دل میں اتر گئے!

اس شام ایمسٹرڈیم کو جانے والی ٹرین میں بیٹھا میں لہلہاتے کھیتوں اور مہکتے پھولوں کی اس بستی کو اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آپل دارن کے خوبصورت قصبے نے مجھے وہی کچھ دیا تھا، جو خوبصورت لوگ چاہتوں کے صلے میں دیتے آئے ہیں!



## ایمسٹرڈیم میں

آپل دارن سے ایمسٹرڈیم تک پہنچتے پہنچتے رستے کے خوبصورت مناظر اور ہنس مکھ ڈچ ہمسفروں کے سبب دل گرفتگی کی وہ کیفیت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی تھی، جس نے آپل دارن میں میرے قیام کو "قید با مشقت" بنا کر رکھ دیا تھا۔ اب میں دونوں ہاتھوں میں ایک ایک وزنی سوٹ کیس اور اتنے ہی وزن کا ایک بیگ گردن میں لٹکائے ایمسٹرڈیم کے سٹیشن کے باہر کھڑا تھا۔ میرے ساتھ سیاح لڑکے لڑکیوں کا ایک پورا جتھا تھا، جن میں سے اکثریت زرد روپیوں کی تھی جو مختلف ممالک سے غالباً ابھی ابھی یہاں پہنچے تھے مگر وہ میری طرح سامان سے لدے پھندے نہیں تھے۔ انہوں نے مختصر سی کٹ کمر کے ساتھ باندھی ہوئی تھی اور وہ ہاتھوں میں ستار یا گٹار اٹھائے ہوئے تھے۔ ان میں ایک تیس بتیس سالہ خاتون بھی تھی، جس نے سامان کی کٹ کی جگہ اپنا چار ماہ کا "بے بی گلیکسو" قسم کا ایک خوبصورت سا بچہ کمر کے ساتھ ایک ٹوکری میں لٹکایا ہوا تھا اور اپنا سامان ایک ٹرالی نما چیز میں لادے لئے جا رہی تھی، میں نے اسے دیکھ کر سوچا یہ لوگ بھی عجیب ہیں، زندگی کے ہر مرحلے اور جکڑے ہوئے حالات میں بھی زندگی کا رسیلا رس پینا چاہتے ہیں۔ جب کہ ہم لوگ جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھنے سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی عورتیں تو اس معاملے میں مردوں سے دو چار ہاتھ آگے ہیں، ادھر شادی ہوئی اور ادھر ہم نے دیکھا کہ اچھی خاصی لڑکیوں نے بھی خود کو بڑی بوڑھیوں میں شمار کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ان کے شروع کے چند ماہ تو دولہے کے ساتھ گزرتے ہیں اور پھر بقیہ تمام

عمر چولہے کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ بہر حال ہمارے قافلے میں زیادہ تعداد ہپیوں کی تھی اور یہ تو ایمسٹرڈیم میں دو دن بسر کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ شہر پر اصل قبضہ تو دنیا کے مختلف ممالک سے آئے ان میلے کچیلے ہپیوں کا ہے۔ مقامی لوگ تو پنجابی محاورے کے مطابق "گم شدہ گائے" کی طرح پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب لوگ ایک دوسرے سے زیادہ متعارف نہ ہونے کے باوجود یوں گھل مل گئے تھے، جیسے یہ ایک ہی کنبے کے افراد ہوں! چنانچہ اب یہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں رہائش کے لئے کوئی سستی سی جگہ ڈھونڈنے کی فکر میں تھے۔ میرے گروپ میں تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ ان میں جان امریکی اسکے ساتھ ننھی لڑکی ماریا سوس، اسکاٹ رابرٹ نامی لڑکا آسٹریلین اور اس کی سفری گرل فرینڈ ارسلا جرمن تھی۔ پانچواں شخص آسٹریلیا کا "جیک" تھا۔ اس کا اصل نام تو اور تھا مگر تمام تر کوششوں کے باوجود جب اسے اپنے نام کی ادائیگی کے ضمن میں میرے "شین قاف" کا گلا ہی رہا تو میں نے اسے جیک کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ چھٹا میں تھا۔ میرے اور جیک کے علاوہ باقی سب اپنی شکل و شناخت کے اعتبار سے ایمسٹرڈیم کے "صحیح" سیاح تھے۔ بائیس سالہ جان کی بھورے رنگ گھنی داڑھی تھی اور اس نے آنکھوں پر ہمارے ہاں کے بڑے بوڑھوں جیسی عینک سے ملتی جلتی قسم کا چشمہ چڑھایا ہوا تھا۔ اس کی انیس سالہ ہم سفر ماریا ڈھلکے ہوئے جسم کی مالک تھی اور چرس پی پی کر اس کی آنکھیں یرقان زدہ لگتی تھیں۔ سکاٹ کے سر پر گھنی زلفیں تھیں اور اس کی مونچھیں "ادھار کا انجام" مارکہ تھیں۔ اس کی جرمن گرل فرینڈ ارسلا مشرقی طرز کی کڑھی ہوئی میکسی میں ملبوس تھی اور دلکش تھی۔ جیک کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری لکیریں تھیں تاہم وہ لباس وغیرہ کے معاملے میں خاصا خوش ذوق واقع ہوا تھا۔ ایک میں اور وہ تھے جو ایمسٹرڈیم میں فی الحال "چھڑے" تھے ورنہ ہمارے گروپ کے بقیہ سبھی ساتھیوں کے "چولہوں میں آگ جل رہی تھی"۔



جان نے جیب سے ایک کتابچہ نکالا اور ہوٹلوں کی فہرست پر نگاہ ڈالنے لگا۔ بالآخر اس نے اپنی انگلی ایک جگہ روک لی اور کتاب بند کر کے جیب میں ڈال لی۔ تم سب میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ"۔ اس نے قائد کے انداز میں ہم عوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے شہر کا سستا ترین ہوٹل تلاش کر لیا ہے"۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم شہر کے اس سستے ترین ہوٹل کے سامنے کھڑے تھے۔ ایک پرانے طرز کی چھوٹی سی دو منزلہ عمارت میں داخل ہو کر ہم نے زیریں منزل میں کاؤنٹر پر اپنے نام درج کرائے اور پھر اپنے اپنے کمروں کی چابیاں لے کر ہوٹل کے ملازم کی رہنمائی میں دوسری منزل پر آ گئے میں اور جیک ایک کمرے میں جان اور ماریا برابر والے کمرے میں اور اسکاٹ ارسلا کے ساتھ ایک تیسرے کمرے میں منتقل ہو گیا۔

"رات کو سوتے وقت دروازہ اندر سے مقفل کرنا نہ بھولئے ورنہ آپ اپنے سامان کے خود ذمہ دار ہوں گے"۔ ہوٹل کے ملازم نے کمرے کا بلب روشن کرتے ہوئے مجھے اور جیک کو ہدایات جاری کیں۔ "اور ہاں آپ کے کمرے کا دروازہ باہر سے صحیح طور پر مقفل نہیں ہوتا، میں اسے ابھی ٹھیک کرائے دیتا ہوں"۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کمرے کے دروازوں پر ایک نظر ڈالی اور یوں اس دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا۔ دیواریں ایک عرصہ سے سفیدی نہ ہونے کے باعث سیاہ پڑ چکی تھیں۔ چھتوں پر جالے لٹک رہے تھے اور "نوشتہ دیوار" دو ایک جملوں کے بعد پڑھنے کی ہمت ہی نہ رہی۔ یہاں عجیب عجیب "ملفوظات" درج تھے جن کا بیان اخلاقیات کی تمام حدود پھلانگ کر ہی کیا جا سکتا ہے اور ان میں سے کچھ ملفوظات باتصویر بھی تھے۔ کمرے میں دو کھٹولے پڑے تھے جن کی "خمیدگی" اس امر کی گواہی دیتی تھی کہ یہاں آج تک صرف کپلز COUPLES ہی ٹھہرتے رہے ہیں۔ ایک عجیب طرح کی سڑاند کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے تازہ ہوا کے لئے کمرے کی بند

کھڑکی کھولنے کی کوشش کی اور بالآخر اس کوشش میں کامیاب ہو گیا- کھڑکی ایک تنگ سی گلی کی طرف کھلی، جہاں رہائشی مکانات کا ایک سلسلہ دکھائی دیا- یہ چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں اور ڈھلوان چھتوں والے پرانے طرز کے مکانات تھے جن کے روشن دانوں سے پراسرار سی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی- اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر اندر آ گیا- یہ جان تھا اور اس کے ساتھ یرقان زدہ آنکھوں اور بھدے جسم کی ماریا تھی-

"گڈ نیوز گائیز" اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے چہک کر کہا- "اس ہوٹل کے غسلخانے غیر متوقع طور پر اچھے خاصے ہیں- جی چاہتا ہے- بستر وہاں جمالیں اور کمروں کو غسل خانے کے طور پر استعمال کریں-!"

جان یہ خوش خبری غالباً اسکاٹ اور ارسلا کو بھی سنا آیا تھا کیونکہ کچھ دیر بعد وہ بھی ہمارے کمرے میں موجود تھے- اس پر میں نے سوٹ کیس میں سے نہانے کا سامان نکالا اور ان کے ساتھ غسل خانے کی طرف چل پڑا- جیک سامان کی حفاظت کے لئے کمرے ہی میں موجود رہا کیونکہ ہوٹل کے ملازم نے ابھی دروازے کو باہر سے مقفل کرنے کا انتظام نہیں کیا تھا- راہداری سے دائیں جانب مڑتے ہی غسل خانوں پر نظر پڑی- سب لوگ غالباً نہانے کے لئے بہت بے تاب تھے کیونکہ انہوں نے باہر ہی سے کپڑے اتارنا شروع کر دیئے- ارسلا نے مشرقی طرز کی کڑھی ہوئی میکسی اتاری اور خراماں خراماں غسل خانے میں داخل ہو گئی- ڈھلکے ہوئے جسم والی ماریا نے بوشرٹ کے بٹن کھولے اور پھر یوں لگا جیسے کوئی چھت نیچے آن گری ہو- اسکاٹ اور جان نے بھی ایک ایک کر کے کپڑے اتارنے اور پھر ننگ دھڑنگ میرے سامنے آن کھڑے ہوئے- باقی تو خیر ٹھیک تھا مگر میں نے اس منظر سے آنکھیں چرا لیں- اسکاٹ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا- اور اب صرف میں اور جان باہر رہ گئے، کیونکہ غسل خانے صرف تین تھے- اگر ان کا طول و



عرض دو آدمیوں کو بیک وقت اپنے اندر سمیٹنے کی گنجائش رکھتا تو شاید جان، ماریا کے ساتھ غسل خانہ شیئر SHARE کر رہا ہوتا- سو اس نے سگریٹ سلگایا اور عریاں حالت میں میرے سامنے آن کھڑا ہو گیا- تاہم اسے شرم و حیا کا کچھ نہ کچھ پاس ضرور تھا کیونکہ اس نے بہر حال گول گول چشمہ نہیں اتارا تھا- مشرع داڑھی اور چہرے کو حد درجہ ثقہ بنا دینے والی اس عینک کے ساتھ وہ جس صورت میں میرے سامنے کھڑا تھا- اس پر ضبط کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی- دراصل ایک بار پھر میری نظروں کے سامنے ایک عظیم سیاسی رہنما کی شبیہہ گھوم گئی تھی-

"کیا بات ہے، ہنس کیوں رہے ہو؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا- وہ بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا-

"کچھ نہیں-!" میں نے ہنسی ضبط کر کے بات بدلتے ہوئے کہا"- ان لوگوں نے نہانے میں اتنی دیر لگا دی ہے، گویا غسل خانوں کو رہائشی کمروں کے طور پر استعمال کرنے کی تمہاری تجویز انہیں واقعی بہت پسند آئی ہے"-

"ہاہاہا!" جان نے بھرپور قہقہہ لگایا" مجھے بھی کچھ ایسے ہی لگتا ہے"-

پھر اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے پرے پھینکا اور ماریا والے غسل خانے کی طرف بڑھا- ان غسل خانوں کے دروازے تین چار فٹ سے زیادہ چوڑے نہیں تھے- ان میں چٹخنی بھی نہیں تھی بلکہ یہ اندر اور باہر دونوں طرف کھلتے تھے- چنانچہ بالائی حصے سے نہانے والوں کے شانے اور نچلے حصے کے خلاء سے پاؤں سے پنڈلی تک کے حصے باہر سے نظر آتے تھے- جان نے آگے بڑھ کر غسل خانے کے دروازے کو باہر کی طرف کھولا اور ماریا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے باہر کھینچ لایا-

"یہ تمہاری زندگی کا آخری غسل نہیں ہے!" اس نے ہنستے ہوئے کہا"- فی الحال اتنے ہی پر اکتفا کرو"-

ماریا سر کے بال اور منہ دھو چکی تھی اور اس کے بقیہ جسم پر صابن کا جھاگ تھا، جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نہانے کے عمل سے ابھی فارغ نہیں ہوئی سو اس نے مصنوعی غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور "ڈونٹ بی سلی (DONT BE SILLY)" کہہ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دوبارہ غسل خانے میں داخل ہو گئی- جان نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور پھر اسی ہیئت کذائی میں میرے سامنے کھڑا ہو کر عالمی سیاسیات پر گفتگو کرنے لگا مگر میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا- تھوڑی ہی دیر میں اسکاٹ سیٹی بجاتا ہوا غسل خانے سے اسی عالم میں برآمد ہوا- جس حالت میں داخل ہوا تھا- میں نے جان کے لئے کوئی "کرٹسی" دکھائے بغیر جلدی سے دروازہ کھولا اور غسل خانے میں داخل ہو گیا-



# کون ہے...... کون ہے؟

نہا دھو کر فارغ ہوئے تو میں نے کمرے میں پہنچ کر لباس تبدیل کیا اور ہوٹل سے باہر نکلنے کی ٹھانی- ایمسٹرڈیم میں مجھے صرف آج کی رات قیام کرنا تھا- میرا ارادہ پرسوں یہاں سے پیرس روانگی کا تھا- یوں میں چاہتا تھا کہ اس مختصر سے وقت کو زیادہ سے زیادہ استعمال میں لا سکوں- میں ابھی دروازے سے باہر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ کاؤنٹر کلرک نے زیر لب تبسم کے ساتھ دوستانہ لہجے میں میرے "عزائم" کے بارے میں پوچھا- میں نے اسے بتایا کہ ایمسٹرڈیم کی گلیوں کی خاک چھاننے جا رہا ہوں-

"رات بہت گزر چکی ہے، اس وقت سڑکوں پر مدہوش شرابیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا"- اس نے خوش مزاجی سے کہا "اور اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو ہیوائے گڈ ٹائم!"

"گڈ ٹائم اور مدہوش شرابیوں کے ساتھ؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور باہر جانے کا ارادہ تبدیل کر دیا- اس کے ساتھ ہی میں کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا اور سونے کے لئے "کھٹولے" میں دراز ہو گیا- مگر کیفیت کچھ یوں تھی کہ میرا سر بلندی کی طرف تھا، کمر کا حصہ قریباً زمین کو چھو رہا تھا اور ٹانگیں ایک بار پھر بلندی کی طرف چلی گئی تھیں، جیک کو چارپائی کی "اتنی بلندی اتنی پستی" سے غالباً کوئی شکایت نہیں تھی، کیونکہ وہ مطالعے میں مشغول تھا- ایسے مقاصد کیلئے یہ چارپائی کسی "آرام دہ کرسی" سے کم نہیں تھی- میں نے سونے کی کوشش کی مگر میرے سر کے قریب تیز بلب روشن تھا- جس کی روشنی آنکھوں سے ہو کر تیر کی طرح میرے دل و دماغ میں اتر رہی تھی-

دار ورسن کے ان مراحل سے شاید کچھ دیر بعد میں بخیر و خوبی گزر جاتا اور نیند کی دیوی، بادل نخواستہ ہی سہی، مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی کہ برابر والے کمرے سے گٹار کا بے ہنگم شور سنائی دیا- یہ یقیناً جان تھا اور لگتا تھا، اس نے کھٹولے سے انتقام کا ذریعہ اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کے اس نوع کے اظہار میں ڈھونڈ لیا ہے، اس کے باوجود میں نے ایک بار پھر سونے کی کوشش کی اور جب ہزاروں لاکھوں بھیڑوں کی ٹانگیں گننے کے باوجود اس میں کامیابی نہ ہوئی تو میں نے اس گڑھے سے نکلنے کا "منصوبہ" تیار کر لیا- چنانچہ میں آہستہ آہستہ پیچھے کو سرکتا ہوا سر کو مزید بلندی کی طرف لے گیا اور جب میرے پاؤں کھٹولے کے سطح زمین والے حصے کے بالکل قریب ہو گئے تو میں ایک دم کھڑا ہوا اور باہر کود گیا- دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے ایک نظر جیک پر ڈالی- اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار تھے اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی تھی اور وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا-

"اس عالم میں نیند نہ آنے یا کتاب پرے دھر کر جھنجلانے سے بہتر ہے کہ ہم بھی اس دھما چوکڑی میں شریک ہو جائیں!" میں نے دروازے کے قریب کھڑے کھڑے اسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی-

"نہیں تم جاؤ-" اس نے بے نیازی سے کہا- "چند لمحوں بعد یہ شور میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گا!" اس پر میں نے دروازہ کھولا اور جانے کو مڑا- جاتے جاتے میں نے ایک پھچھلتی سی نظر اس پر ڈالی- اس نے کتاب دوبارہ ہاتھوں میں تھام لی تھی اور ایک بار پھر مطالعے میں یوں غرق تھا گویا لائبریری کے کسی پر سکون گوشے میں بیٹھا ہو!

جان کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا- اندر داخل ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کچھ دیر میں میرا دم گھٹ جائے گا- چرس کی بو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور بے شمار لڑکے لڑکیاں چارپائیوں اور فرش پر دراز تھے- ان میں اسکاٹ، ماریا، جان اور ارسلا کے علاوہ باقی



سبھی چہرے میرے لئے انجانے تھے- تاہم یہ سب کے سب ہپی تھے اور بعد میں معلوم ہوا کہ یہ "دیوانے" اسی ہوٹل کے دوسرے کمروں میں مقیم ہیں اور گٹار کی آواز پر یہاں مل بیٹھے ہیں کہ خوب گزرے گی- ان میں سے کچھ نے سرسری سی نگاہوں سے ایک بار مجھے دیکھا اور پھر اپنی دھن میں کھو گئے- اکثر نے سرے سے نوٹس ہی نہ لیا- میں نے فرش کے ایک کونے میں جگہ تلاش کی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا- کمرے کی دونوں چارپائیاں لڑکے لڑکیوں سے ٹھنسی ہوئی تھیں- ان "عرش" مکینوں کے علاوہ کچھ "فرش" مکین بھی تھے جو ایک دوسرے کی رانوں پر سر دھرے لیٹے تھے یا دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے- ان میں سے اکثریت کی رنگت زرد تھی اور ان کے چہروں سے خون نچڑے ہوئے تھے- سامنے والے گوشے میں جان گٹار لئے بیٹھا دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک کے بعد دوسری دھن بجانے میں مشغول تھا- میں نے اپنے برابر دائیں جانب نگاہ ڈالی تو ماریا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے پڑی تھی- میں نے آہستہ سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور "ہیلو" کہا- اس پر اس نے گردن موڑ کر اپنی یرقان زدہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ "ہیلو" کہہ کر میرے بازوؤں میں جھول گئی-

"تم نے بہت اچھا کیا- جو یہاں آ گئے"- اس نے اپنا سر میرے شانوں پر رکھتے ہوئے کہا

"اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا"- میں نے پہلو بدلنے کے بہانے اسے خود سے جدا کرتے ہوئے کہا- خدا جانے مجھے کیوں یہ خدشہ ہو گیا تھا کہ یہ ابھی ڈریکولا کی طرح اپنے دانت میری گردن میں گاڑ دیگی اور پھر میری گردن سے ابلتے خون کا ذائقہ اس کی زبان پر ہو گا-

"کیا تمہیں یہ سب کچھ پسند نہیں؟" اس کا اشارہ اردگرد کے ماحول کی طرف تھا" مجھے

بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" میں نے بدبودار دھوئیں سے بھرے ہوئے اس کمرے میں نتھنے کھول کر سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تمہارے جواب سے لگتا ہے، تم اس سے خوش نہیں ہو"۔ ماریا جرح پر اتر آئی تھی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔ "دراصل میں کسی چیز سے خوش نہیں ہوں۔ کسی پر ناراض نہیں ہوں کیونکہ جانتا ہوں فرد کو کسی اچھے یا برے فعل کی طرف دھکیلنے والی طاقت وہ خود نہیں"۔

"کیا مطلب؟" ماریا نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ سارا مسئلہ CONDITIONING کا ہے۔ اس کے تحت افراد جو راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کا کریڈٹ یا ڈس کریڈٹ ان کی بجائے اس ماحول کو جاتا ہے جس میں وہ بڑھتے، پلتے اور جوان ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات سے نکلنا بھی چاہیں تو نکل نہیں سکتے"۔ میں نے جواب دیا۔

"کیا تم یہ بات بطور کلیہ کہہ رہے ہو؟" ماریا نے گٹار کے شور اور بدبودار دھوئیں کے دوران ہونے والی اس گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ جو میرے لئے اتنی دلچسپ نہیں تھی۔

"ہاں! مگر ہر دور میں اس کلیے سے خود کو مستثنیٰ قرار دینے والے کچھ لوگ پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو انسان کی پیدائش سے اب تک دنیا میں ایک ہی نظام نافذ ہوتا"۔

جب میرے اور ماریا کے مابین گفتگو ہو رہی تھی، ایک سگریٹ گردش کرتا ہوا ماریا تک پہنچا۔ اس نے فوراً آنکھیں میچے ہوئے اسے انگلیوں میں دبوچ کر ایک لمبا کش لیا اور پھر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے "کفران نعمت" کا ارتکاب کرتے ہوئے سگریٹ برابر میں موجود اپنے ساتھی کے گھٹنوں پر سر دھرے لیٹی ہوئی لڑکی کو تھما دیا۔ پرانی جین سے



بنائی گئی نیکر میں ملبوس اس قبول صورت مگر تہہ در تہہ میل میں دبی ہوئی دوشیزہ نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور اپنی رانیں کھجلاتے ہوئے ایک طویل کش لے کر سگریٹ اپنے ساتھی کو سونپ دیا، اور پھر اطمینان سے اپنی ٹانگیں میرے گھٹنوں میں پھیلا دیں۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

"کیا تمہیں" حشیش پسند نہیں آیا؟" ماریا غالباً مجھ سے ایسے سوالات کرنے پر تلی ہوئی تھی جن کے جواب دینے پر اس وقت طبیعت راغب نہیں تھی۔

"نہیں" میں نے مختصراً جواب دے کر گلو خلاصی کرانے کی کوشش کی۔

"پھر تو تم ہم لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتے ہو گے!" ماریا نے گٹار کے شور میں ایک اور سوال پوچھا۔ اس کے لہجے میں ایک عجیب سا کرب چھپا تھا۔

"تمہارا خیال درست نہیں۔ میں تم سے یوں نفرت نہیں کر سکتا کہ جانتا ہوں کہ ہم سب نے برائیوں کا انتخاب کر رکھا ہے۔ میں نے اگر ایسا کرتے وقت اپنے لئے چرس یا مارفیا کا انتخاب نہیں کیا اور تم نے کر لیا ہے، تو اس پر میں تمہیں پتھر نہیں مار سکتا۔ اور پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں اور مجھے ان اندھے کنوؤں کی طرف دھکیلنے والا کون ہے؟"

ماریا کے ساتھ اس گفتگو کے دوران میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو ارد گرد ہپیوں کے نچڑے ہوئے چہرے دکھائی دیئے۔ جان نے نڈھال ہو کر گٹار ایک طرف رکھ دی تھی اور اب وہ مدہوشی کے عالم میں فرش پر لیٹ گیا تھا۔ میرے قریب لیٹی دوشیزہ نے اپنی میل جمی ٹانگیں میری ٹانگوں پر سے اٹھالی تھیں اور اپنے ساتھی کے ہونٹوں کا زہر چوسنے میں مشغول تھی۔ ماریا نے ویران ویران آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے۔ میرا سر گھومنے لگا تھا۔ میں نے آہستگی سے اسے خود سے الگ کیا اور ایک دوسرے سے چپکے ہوئے جوڑوں کو پھلانگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ اس پر ماریا اپنی جگہ سے اٹھی، نیند کے عالم میں چلتی ہوئی جان کے قریب پہنچی اور

پھر اس نے یکدم گٹار کے تاروں کو جھنجوڑنا شروع کر دیا۔ ایک بار پھر اس میں سے چیخیں سنائی دیں اور پھر اس کمرے میں مجھے ہر طرف سے دردناک آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"کون ہے، کون ہے، کون ہے؟ ہمیں ان اندھے کنوؤں کی طرف دھکیلنے والا کون ہے؟"

ماریا دیوانگی کے عالم میں گٹار کے تار بھنبھوڑ رہی تھی اور نچڑے ہوئے چہروں والے ہپّی بے سدھ پڑے تھے۔ میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ میرے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ میں نے سونے کے لئے آنکھیں بند کیں مگر یہ دردناک آوازیں دبے پاؤں چلتی میرے دماغ میں در آئیں اور ایک بار پھر تیز چیخوں میں بدل گئیں۔

"کون ہے، کون ہے، کون ہے؟" ہمیں ان اندھے کنوؤں کی طرف دھکیلنے والا کون ہے؟"

میں نے گھبرا کر جیک کی طرف دیکھا، وہ کتاب سینے سے چمٹائے سکون کی نیند سو رہا تھا!

------



# نہروں کا شہر

صبح آنکھ کھلی تو خود کو تروتازہ محسوس کرنے کی بجائے جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور غسل وغیرہ کے لئے چل پڑا۔ جیک نہا دھو کر اور شیو وغیرہ سے فراغت حاصل کر کے اپنے بال سنوارنے میں مشغول تھا۔ غسل خانے خالی پڑے تھے۔ شاید اس لئے کہ نہانے والے برسوں بعد کل اس فریضہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ واپس کمرے میں آیا تو جیک ایک اسٹائلش چیک شرٹ اور دھاری دار پتلون پہنے باہر جانے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

"کدھر کی تیاریاں ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"گھومنے پھرنے کا ارادہ ہے، تم بھی ساتھ چلو"۔ اس نے اپنے سنجیدہ گھمبیر لہجے میں کہا

"میں ابھی دو منٹ میں تیار ہو کر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ ویسے کہاں کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" میں نے جلدی جلدی سوٹ کیس میں سے اپنی بلیو جین، ایک رف سی شرٹ اور کاٹن کی ایک جیکٹ نکالتے ہوئے پوچھا۔

"آج صرف میوزیمز، کتابوں کی دکانوں اور دو ایک لائبریریوں میں جانے کا پروگرام ہے"

"اللہ آپ کو یہ سفر مبارک کرے"۔ میں نے سوٹ کیس میں سے نکالے ہوئے کپڑے دوبارہ اندر دھرتے ہوئے مسکرا کر کہا"۔ آج کا پروگرام تو آپ اکیلے بھگتیے، اور

اس کے بعد میں انشاءاللہ ویسے ہی پیرس میں نہیں ہوں گا"۔

"کیوں، تمہارا کدھر جانے کا ارادہ ہے؟" اس نے غالباً زندگی میں پہلی اور آخری بار مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں...... میں اچھے برے لوگوں میں گھوموں گا!"

"اور......؟"

"اور یہ کہ اس کے بعد باقی مقامات کی "زیارت" کے لئے بھی وقت نکال ہی لوں گا!"

جیک کے ساتھ باہر جانے کا پروگرام ملتوی ہونے پر میں نے شیو کا سامان نکالنے کے لئے دوبارہ اٹیچی کیس کھولا اور اس دوران جیک کی نظر اس کھلونے پر جا پڑی جو میں نے نیویارک سے شاید تین یا چار ڈالر میں خریدا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پلاسٹک کی بنی ہوئی اس چھوٹی سے ڈبیا پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

یہ "لافنگ ٹائے LAUGHING TOY ہے اس میں انتہائی مضحکہ خیز قہقہوں کی ٹیپ ہے جو بٹن دبانے پر آن ہو جاتی ہے اور پھر کئی منٹ تک قہقہے بغیر کسی وقفے کے سنائی دیتے ہیں"۔

"اوہ۔ آئی سی!" جیک نے کہا "مگر تم اسے ساتھ ساتھ کیوں لئے پھرتے ہو؟"

"کوئی خاص مقصد نہیں، بس جب ذرا ہنسنے کو جی چاہتا ہے اس کا بٹن دبا دیتا ہوں پھر اس میں سے نکلنے والے مضحکہ خیز قہقہے ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دیتے ہیں۔"

"خوب!" جیک نے سنجیدگی کی گہری لکیریں پیشانی پر کھینچتے ہوئے کہا "یہ کھلونا ہم سب کے پاس ہونا چاہئے!" اور اس کے ساتھ ہی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

شیو اور ناشتے وغیرہ سے فراغت پا کر جب میں ہوٹل سے نکلا، تو دروازے پر ماریا سے ملاقات ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ جان، ارسلا اور اسکاٹ



کے علاوہ وہ جانے پہچانے چہرے بھی تھے جن سے گزشتہ رات جان کے کمرے میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سب رات والے کپڑوں میں ملبوس تھے اور لگتا تھا جیسے انہیں صبح منہ تک دھونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں نے انہیں "ہائے" کہا اور جواباً "ہائے ہائے" کی آوازیں سنائی دیں۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکلا تو ماریا کی نگاہیں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ باہر نکلتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کئی سال بعد زنداں کی کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی سے رہا ہوا ہوں۔

اگست کے اوائل میں یہاں موسم یوں بھی خوشگوار ہوتا ہے، مگر آج کچھ زیادہ ہی خوشگوار تھا یا کم از کم مجھے محسوس ہو رہا تھا، میں گلی سے نکل کر ایک قدرے چوڑی سڑک پر آ گیا جہاں چھوٹی دکانوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ یہاں تھوڑی دیر بعد سائیکل کی گھنٹی سنائی دیتی اور پھر کوئی ڈچ خوبصورت سائیکل پر بیٹھا آہستہ آہستہ پیڈل چلاتا قریب سے گزر جاتا۔ امریکہ میں قیام کے دوران لمبی لمبی کاروں کے جھرمٹ میں میری آنکھیں اس سواری کو دیکھنے اور کان اس کی گھنٹی کی آواز کو سننے کے لئے ترس گئے تھے۔ مجھے یہاں سے اس علاقہ کی جانب جانا تھا جہاں سے ایمسٹرڈیم کی سیر کے لئے لانچیں چلتی ہیں۔ اس خوبصورت شہر میں نہروں کا جال بچھا ہوا ہے اور یہ نہریں شہر کے پُر رونق بازاروں کے علاوہ تنگ گلی کوچوں میں سے ہو کر گزرتی ہیں۔ چنانچہ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد میں ایک بس میں بیٹھ کر ریلوے سٹیشن کے قریب واقع منزل مقصود تک پہنچ گیا۔ یہاں بے شمار سیاحوں کا ہجوم تھا اور ان کا تعلق کسی ایک ملک سے نہیں تھا بلکہ شوقِ سیاحت انہیں دنیا کے مختلف خطوں سے کھینچ کر یہاں لے آیا تھا تاہم ان میں سے صرف چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور کاغذ پر لگے انگوٹھے کی طرح چپٹی ناکوں والے جاپانی یا سیاہ رنگ نیگرو الگ پہچانے جاتے ورنہ ایک نظر دیکھنے پر بقول شخصے باقی سبھی "انگریز" لگتے تھے۔ ان سب کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں، کلچر مختلف تھے تاہم ان سب کا لباس ایک سا تھا یا

پھر بحیثیت انسان ان کی جبلتیں یکساں تھیں- سیاحت کے دوران یہ دوسری یکساں خصوصیت میری دلچسپی کا خاص مرکز رہی- چنانچہ نیویارک کے ٹائم سکائر پر میری ملاقات اگر سٹر نارمن نامی شخص سے ہوئی تو پہلی ملاقات میں مجھے نارمن ہی لگا مگر تیسری یا چوتھی ملاقات میں یہ عقدہ کھلا کہ یہ نارمن دراصل بھاٹی گیٹ کا عبدالرحمٰن ہے کیونکہ انسانی برادری کا ایک فرد ہونے کے ناطے سے اس میں محبت، نفرت، مسرت اور غم کے جذبات بھاٹی گیٹ کے عبدالرحمٰن سے کسی طرح بھی مختلف نہیں تھے- بہرحال یہاں دنیا کے سبھی خطوں کے لوگ موجود تھے، تاہم ان کی اکثریت اپنے ہاں کے رائج الوقت اخلاقی نظام کی پابند تھی- باغی نسل کے افراد یعنی ہپی یہاں بہت کم تعداد میں نظر آئے-

میں ٹکٹ خرید کر لانچ میں داخل ہونے لگا تو غالباً کسی اخبار کے فوٹوگرافر نے "جسٹ اے منٹ پلیز" کہہ کر میری توجہ اپنی طرف مبذول کی اور پھر ایک "ٹک" کی آواز کے ساتھ اس نے میری تصویر کھینچ لی۔ شاید اسے گمان گزرا تھا کہ میں اپنے ملک کی کوئی اہم شخصیت ہوں- میں نے سر کی ہلکی سی جنبش سے شکریہ ادا کیا اور لانچ میں داخل ہو گیا دروازے کے قریب براؤن منی سکرٹ پر چوڑی بیلٹ باندھے اور سفید رنگ کے ٹائٹ بلاوز میں ملبوس ایک بلانڈ BLOND دوشیزہ نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے کھڑکی کے قریب ایک نشست ڈھونڈی اور اس پر براجمان ہو گیا- آرام دہ نشستوں اور شیشے کی چھت والی یہ خوبصورت لانچ رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ تھی ۔کچھ ہی دیر بعد لانچ مسافروں سے بھر گئی- کیپٹن نے بھونپو بجا کر اس کے چلنے کا اعلان کیا، انجن کے ہلکے سے شور کے ساتھ لہروں میں ارتعاش سا پیدا ہوا اور پھر ہم آہستہ آہستہ ساحل سے دور ہوتے چلے گئے- پُررونق بازار کی عمارتیں پیچھے رہ گئی تھیں- لانچ کھلے پانیوں میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک مقام پر اس نہر کے وسیع دریا میں تبدیل ہونے کا گمان گزرا، مگر یہ شائبہ تھوڑی ہی دیر



کے لئے تھا- کیونکہ اب اس نے دوبارہ نہر کی شکل اختیار کر لی تھی اور اب یہ شہر کے ایک پررونق بازار میں سے گزر رہی تھی- ایک بوڑھا ڈچ گیٹس والی پتلون میں ملبوس پل کی ریلنگ پر دونوں بازو جمائے جھکا ہوا تھا- ایک سڑک نہر کے برابر سے گزر رہی تھی جس پر ٹریفک رواں تھا- میں نے اپنے کیمرے کے ساتھ سر اور بازو باہر نکالے اور ابھی تصویر کھینچنے ہی کو تھا کہ لانچ ایک پل یا سرنگ نما رہ گزر میں داخل ہو گئی- میں نے فوراً خود کو اندر داخل کر لیا- لانچ میں ایک لمحہ کے لئے رات ہوئی اور تھوڑی دیر میں دن طلوع ہو گیا- میری برابر والی دو نشستوں پر ایک ادھیڑ عمر اطالوی دیہاتی اور اس کی بیوی عجیب سرخوشی اور مسرت کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہے تھے- ہمارا گائڈ مقامی باشندہ تھا جو رواں کمنٹری میں مصروف تھا اور بیچ بیچ میں ہنسانے کی کوشش بھی کر رہا تھا- کیونکہ کچھ لوگ واقعی ہنس رہے تھے اور کچھ لوگ ہنسنے کی کوشش میں مصروف تھے- سامنے والی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے انگریز کو گونجدار قہقہے لگاتے دیکھ کر میں نے بھی اس کی باتوں پر کان دھرا- اس کے لب و لہجے سے پہلے تو گمان گزرا کہ وہ انگریزی کی بجائے کوئی اور زبان بول رہا ہے- اور پھر غور کرنے پر یہ گمان یقین میں نہ بدل سکا، تو اپنے انگریز آقا کی تقلید میں اس کی گلابی انگریزی پر ایک زوردار قہقہہ لگانے کے بعد میں نے اپنا سر دوبارہ کھڑکی کے باہر کیا اور نہر کے کنارے کھڑے نیلے پیلے پھولوں والے درختوں کے عکس پانی میں دیکھنے لگا- اب نہر ایمسٹرڈیم کے ایک محلے میں داخل ہو گئی تھی جس کے دونوں جانب رہائشی مکانات تھے- نیکروں میں ملبوس گول مٹول بچے گلی میں کھیل رہے تھے- اس اثناء میں سجے ہوئے پل کی دوسری سمت سے ایک اور لانچ آتی دکھائی دی، جس پر ہماری لانچ کے کیپٹن نے رفتار تیز کر دی اور اس سے پہلے پل کراس کر لیا- جب وہ لانچ ہمارے برابر سے گزری تو دونوں کشتیوں کے مسافروں نے مسکراتے چہروں اور ہاتھ کے اشاروں سے ایک دوسرے کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا- آگے چل کر نہر ایک قدرے کھلے

علاقے میں بہنے لگی- یہاں عمارتوں کی دیواروں پر جرمن زبان میں لاتعداد پوسٹر چسپاں تھے-اس کھلے محلے کے بیچ میں بہتی ہوئی نہر کی ایک جانب کچھ کاریں پارک تھیں، جبکہ دوسری جانب کچھ لوگ آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ میں مشغول تھے-اس اثنا میں میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو قدرے دور سے پھر وہی علاقہ دکھائی دیا-جہاں سے لانچ نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا-گویا ہم گھوم پھر کر وہیں پہنچنے کو تھے جہاں سے چلے تھے کچھ ہی دیر بعد لانچ کنارے پر کھڑی تھی-ڈرائیور نے آخری بار بھونپو بجایا اور پھر انجن بند کر دیا-پھٹ پھٹ کی دم توڑتی آواز سنائی دی اور پھر فضا میں سکون سا پیدا ہو گیا- مسافر اپنی نشستوں سے اٹھے اور ایک ایک کر کے باہر کو جانے لگے-دروازے پر بلانڈ دوشیزہ نے اپنے چہرے پر الوداعی مسکراہٹ بکھیری اور پھر نئے مسافروں کے لئے اپنی مسکراہٹ تیز کرنے لگی-

باہر نکلتے ہی ایک نوٹس بورڈ قسم کی چیز پر نظر پڑی جس کے گرد مسافروں کا جمگھٹا تھا- قریب جا کر دیکھا تو اس پر متعدد انسانی تصویریں چسپاں تھیں جن میں سے ایک میری بھی تھی اور یہ وہی تھی جو لانچ میں میرے داخل ہونے پر اتاری گئی تھی-مسافر پاس کھڑے ایک شخص کو کچھ رقم ادا کرتے اور اپنی تصویر حاصل کر کے رخصت ہو جاتے-میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بے دلی سے تصویر حاصل کر کے سڑک پر آ گیا-اس جاہل "پریس فوٹو گرافر" کو میری طرح کشتی کے سبھی مسافروں پر اپنے اپنے ملک کی اہم شخصیت ہونے کا گمان گزرا تھا-

یہاں سے گھومتا گھومتا "کالور سٹراٹ" کی جانب نکل گیا-جہاں بے پناہ رونق تھی- اس علاقے میں کچھ دیر چہرے پڑھنے کے بعد میں نے "جوڈن پریس سٹراٹ" کا رخ کیا- اس "گلی" میں یورپ کے عظیم مصور ریمبرانت کا گھر ہے جسے حکومت نے اسی صورت میں محفوظ کیا ہوا ہے جس صورت میں وہ اس کے انتقال کے وقت تھا-یہاں عظیم



ریمبرانت کا بستر اور دیگر اشیاء اسی طرح سجی سجائی دھری تھیں-یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی دروازہ کھلنے پر وہ اندر داخل ہوگا اور اپنے کمرے میں اجنبی لوگوں کی موجودگی پر حیرت سے ٹھٹک کر رہ جائے گا-ادھر سے فراغت پا کر میں نے کچھ وقت رائک میوزیم اور میونسپل میوزیم میں گزارا-اس اثناء میں شام ہو چکی تھی-اور اب میرے قدم "تھاربک پلان چوک" کی طرف رواں تھے جس کے گردونواح میں شبینہ زندگی عروج پر تھی!

# ایک گلی سڑی لاش

یہاں قطار اندر قطار شراب خانے، عریاں فلمیں دکھانے والی دکانیں اور سٹرپٹیز سے کچھ زیادہ دکھانے والے نائٹ کلب آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنیوں کے ساتھ گاہکوں کے لئے اپنے بازو واکئے ہوئے تھے- یہاں کھوے سے کھوا چھل رہا تھا- ایک نائٹ کلب کے باہر کچھ اس طرح کا انتظام تھا کہ ایک دھندلائے ہوئے شیشے میں سے سٹرپٹیز کا مظاہرہ کرنے والی "مستورات" کے عکس نظر آتے تھے- اکثر کے باہر ان حسیناؤں کی عریاں تصویریں چسپاں تھیں جو اندر اپنے "فن" کا مظاہرہ کر رہی تھیں- کسی شراب خانے کا دروازہ کھلتا تو اندر سے پر شور موسیقی کی ایک لہر تیزی سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی اور دروازہ بند ہوتے ہی یوں لگتا جیسے کسی نے اس جرم میں یکدم اس کا گلا دبا دیا ہو- یہاں ہر عمر کے شرابی اپنی ہم عمر گرل فرینڈز کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے لڑکھڑاتے ہوئے ادھر سے اُدھر جاتے دکھائی دیتے- عریاں فلمیں دکھانے والی دکانوں میں بوڑھے جوان غیر ملکی سبھی قسم کے لوگ آ جا رہے تھے- گاہکوں کے قریباً برابر تعداد ان ایجنٹوں کی تھی جو ان مقامات کے باہر کھڑے حلق پھاڑ پھاڑ کر لوگوں کو "رازہائے درونِ خانہ" سے آگاہ کر رہے تھے- رات گئے تک باہر ہی سے یہ میلہ لوٹنے کے بعد جب چلتے چلتے پاؤں تھک گئے تو میں ایک ریستوران میں داخل ہو گیا اور قد آدم شیشوں والی ایک کھڑکی کے پاس میز تلاش کر لی- ریستوران کی چار دیواری میں مقید ہوتے ہوئے بھی میں ایسی جگہ پر بیٹھا تھا کہ باہر کی زندگی سے میرا رشتہ منقطع نہیں ہو سکا تھا-



سیاہ رنگ کی بو اور سرخ جیکٹ میں ملبوس ویٹر نے آرڈر وصول کرنے کے کچھ ہی دیر بعد کافی میز پر لا کر رکھ دی اور اب وہ سینڈوچ لینے جا رہا تھا- تھکا دینے والی آوارہ گردی کے بعد اس وقت گرم گرم کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے جسم میں زندگی سرایت کر رہی ہو- اس چھوٹے سے ریستوران میں صرف چند لوگ بیٹھے نظر آ رہے تھے- چنانچہ اکثر میزیں خالی پڑی تھیں- البتہ باقی میزوں پر پڑے ہوئے خالی برتنوں کو اٹھانے میں مصروف ویٹروں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کچھ دیر قبل یہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا میں نے ایک نظر باہر ڈالی جہاں آہستہ آہستہ رونقیں ماند پڑ رہی تھیں اور بازار خالی ہونا شروع ہو گیا تھا- اتنے میں دروازہ کھلا اور ہاٹ پینٹ میں ملبوس ایک دوشیزہ گھبرائی سی اندر داخل ہوئی- اسی عالم میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس کی نظریں مجھ پر ٹھہر گئیں اور پھر وہ میرے قریب آن کر کھڑی ہو گئی-

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" اس خوبصورت ڈچ دوشیزہ نے نہایت ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گھبرائے ہوئے انداز میں مجھ سے پوچھا-

"مائی پلیشر-" میں نے شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے لئے برابر والی کرسی کھسکاتے ہوئے جواب دیا-

"ابھی ابھی ایک شخص یہاں آئے گا، تم اس سے کہنا کہ الریک شناپ فاگن میری دوست ہے"- اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے التجا کی-

"یہ الریک شناپ فاگن کون بلا ہے؟" میرے لئے اس کی آمد کا انداز ہی ایک معمہ تھا اور اب اس ڈرامے میں ایک نئے کردار کا اضافہ میرے لئے مزید باعثِ حیرت تھا-

"یہ میرا نام ہے، تم صرف الریک کہہ لو وہ آئے تو پلیز میرے کہنے پر عمل کرنا"-

اتنے میں اس نے خوفزدہ نظروں سے سامنے کی طرف دیکھا اور کہا "وہ آ رہا ہے"-

میں نے دروازے کی طرف نظریں اٹھائیں- ایک گنجا اور انتہائی موٹا شخص اندر داخل

ہو رہا تھا- اس کے پیٹ میں جڑواں بچے لگتے تھے اور وہ نشے میں لڑکھڑاتا ہوا میری میز کی جانب بڑھ رہا تھا- پیشتر اس کے کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع ملتا اس نے میرے قریب پہنچ کر الریک کو بازو سے گھسیٹتے ہوئے کہا- "اٹھو میرے ساتھ چلو"-

"اس کا بازو چھوڑ دو"- میں نے اس بدنما شخص کو قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ مجھے معاملے کی نوعیت کا علم نہیں تھا تاہم مجھے اس کا یہ انداز برا لگا تھا-

"تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے"- اس نے بڑی مشکل سے لڑکھڑاتی زبان میں یہ جملہ ادا کیا-

"الریک میری دوست ہے اور تم میری موجودگی میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے"- میں نے ایک جھٹکے سے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا- کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اب میں نے اس معاملہ کو اپنی ذاتی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا- شاید اس لئے کہ یہاں کچھ کچھ مردانگی کا مسئلہ بھی آن پڑا تھا- اس نے ایک بار مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور پھر نجانے کیوں چپ چاپ واپس چلا گیا- میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا- وہ خالی سڑک پر دائیں بائیں آگے پیچھے قدم اٹھاتا ہوا کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں تھا اور پھر وہ آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو گیا-

"تھینک یو ویری مچ" الریک نے ممنونیت کے انداز میں کہا-

"اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں، میرے لئے یہ کیا کم ہے کہ اسی بہانے تم ایسی خوبصورت لڑکی سے تعارف ہو گیا"- میں نے اس عرصے میں پہلی بار اس ہرنی ایسی آنکھوں اور چہرے پر بلا کی معصومیت رکھنے والی دوشیزہ کے حسن کو سراہتی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا-

"اب تم جاننا چاہو گے کہ یہ سب کچھ کیا تھا؟" اس نے کہا- "اور یہ کہ میں کون ہوں" "گو اب اس کی خاص ضرورت نہیں تاہم جان لینے میں بھی کوئی حرج نہیں!" میں



نے مسکراتے ہوئے جواب دیا-

الریک نے ہولے سے اپنا سر اوپر اٹھایا اور پھر بھولے بھولے لہجے میں کہا "میں طوائف ہوں!!"

مجھے یوں لگا میری کرسی کے عین نیچے کوئی بم پھٹا ہو- میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر کافی کا ایک گھونٹ حلق میں اتار کر سر کو کرسی کے ساتھ ٹکا دیا-

"کیا تمہیں یہ جان کر دکھ ہوا ہے؟" الریک نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا-

"ظاہر ہے یہ کوئی ایسی خبر نہیں جس پر مسرت کا اظہار کیا جا سکے!" میں نے اس دھچکے کے اثرات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا جس سے ابھی ابھی میں دوچار ہوا تھا-

"ابھی جو شخص میرے پیچھے آیا تھا، وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا- میں کافی انکار کرتی رہی مگر پھر وہ دھمکیوں پر اتر آیا-" اس نے مجھے معاملے کی نوعیت سمجھاتے ہوئے کہا-

"تمہیں اس کے ساتھ جانے پر کیا اعتراض تھا، چلی گئی ہوتیں-" میں نے جل کر کہا-

"اس کے ساتھ نہ جانے کی کئی وجوہ ہیں- مثلاً مجھے اس قسم کے شرابیوں سے سخت نفرت ہے، نیز اتنے بدنما شخص کے ساتھ شب بسری کے خیال ہی سے مجھے وحشت ہوتی ہے- تاہم ایک روز جب رات گئے تک کوئی گاہک میسر نہ آیا تو میں مجبوراً اس شخص کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں چلی گئی- اس کے بعد کئی دفعہ اس نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی مگر میں نے ہر دفعہ انکار کر دیا-"

"وہ کیوں؟" میں نے سب کچھ بھلا کر حیرت سے پوچھا-

"وہ یوں کہ اس رات اس نے مجھے بستر میں لٹا کر میرے ہونٹوں پر لپ سٹک ملی اور اسے چاٹنے میں مصروف ہو گیا- کچھ دیر بعد اس نے پھر یہی حرکت کی حتیٰ کہ صبح تک یہ

شخص ڈیڑھ پاؤ کے قریب لپ اسٹک کھا چکا تھا۔"

"واقعی؟" میرے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ کھل گئی۔

"ہاں! مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

اس دوران رات کافی گزر چکی تھی اور اب میں واپس ہوٹل جانا چاہتا تھا چنانچہ میں نے ویٹر سے بل منگوایا اور ادائیگی کے بعد الریک سے اجازت طلب کرنے کو ہی تھا کہ اس نے مجھے روک لیا۔

"میں شب بسری کے لئے اتنی بری نہیں ہوں"۔اس نے مجھے دعوت عمل دیتے ہوئے کہا"صرف ڈیڑھ سو گلڈر میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں"۔

"گو میں لپ اسٹک پر گزارا کرنے والوں میں سے نہیں ہوں مگر طوائفیں میری کمزوری کبھی نہیں رہیں"۔میں نے بھولے بھالے چہرے والی اس دوشیزہ سے یہ بات کہی جس نے پہلی نظر میں میرے لطیف جذبات میں ہلچل مچادی تھی مگر اب وہ ایک خرانٹ طوائف کے روپ میں میرے سامنے کھڑی تھی۔

"ڈیڑھ سو کی بجائے سو گلڈر میں بھی سودا ہو سکتا ہے!"وہ بھاؤ تاؤ پر اتر آئی۔

"نہیں مجھے یہ بھی منظور نہیں"میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو سنو! اس نے میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے ایک اور "آفر" کی...... "تم اگر چاہو تو "یونانی ذوق" بھی پورا کر سکتے ہو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا"۔

"نہیں!" مجھے ابکائی سی محسوس ہوئی اور میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ذرا ایک لمحے کے لئے رُک جاؤ!" اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر کہا"بازار بند ہونے کو ہے اور میں نہیں چاہتی کہ آخری گاہک ہاتھ سے جانے دوں سو میں جو آخری پیش کش کرنے والی ہوں، وہ اتنے پیسوں میں میں نے آج تک کسی کو نہیں کی۔اس کے لئے میں نے ہمیشہ بڑی رقم وصول کی ہے"۔



"وہ کیا؟" تجسس کے جذبے نے میرے اندر سر ابھارا، اور میں نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہ کہ تمہارے ہر دو ذوق پورے کرنے کے علاوہ کوئی زائد رقم وصول کئے بغیر میں تمہارے برہنہ جسم پر پیشاب کی گرم گرم دھار بھی مارنے کو تیار ہوں۔یہ میری سپیشیلیٹی SPECIALITY ہے اور اس کا نشہ ایک عرصے تک تمہارے ذہن میں رہے گا! نیز یہ کہ یہی عمل تم میرے ساتھ بھی دہرا سکتے ہو!"

میرے سامنے سفید دستانوں والے قاتل نظام کی ایک اور گلی سڑی لاش پڑی تھی جسے خوبصورت ملبوسات میں ڈھانپ دیا گیا تھا! میں نے اس پر آخری نظر ڈالی اور باہر نکل آیا۔

--------

# ماریا کی کہانی

صبح مجھے پیرس کے لئے روانہ ہونا تھا، سو میں نے ہوٹل میں پہنچ کر اپنے بکھرے ہوئے سامان کو یکجا کیا اور سونے کی تیاریاں کرنے لگا- جیک اپنی "آرام دہ کرسی" میں پڑا تھا- اس نے مجھے بستر کی طرف جاتے دیکھا تو کتاب ایک طرف رکھ دی"- تم اس شہر میں پہلی مرتبہ آئے ہو؟" اس نے کتابوں کی دنیا سے نکل کر پہلی بار اپنے برابر میں موجود کسی شخص کے ساتھ مکالمے کا آغاز کیا-

"نہیں- امریکہ جاتے ہوئے کچھ روز یہاں قیام کر چکا ہوں"- میں نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا-

"ان بدبودار ہپیوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" جیک غالباً باتیں کرنے کے موڈ میں تھا- چنانچہ اس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پوچھا-

"یہی کہ ان کی ایک تعداد EXTRA SENSATION کے لئے بھٹک رہی ہے کیونکہ وہ زندگی میں بتدریج میسر آنے والی تمام SENSATIONS سے عمر کے ابتدائی دور ہی میں دوچار ہو جاتے ہیں- کچھ اپنے بزرگوں کی حد درجہ منافقت کے رد عمل میں اور کچھ نے محض چرس وغیرہ کی اسمگلنگ کے لئے یہ روپ دھار رکھا ہے- ویسے یہ بدبودار ہپی بدبودار نظام ہی کا نتیجہ ہیں!" میں نے گفتگو کو فلسفیانہ رنگ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا-

"چلو چھوڑو، ان باتوں کو!" جیک کو غالباً مجھ سے اتفاق نہیں تھا، سو اس نے بیزاری



سے کہا" یہ کہو تمہیں امریکہ کیسا لگا"-

"جیسا اسے ہونا چاہئے" میں نے جمائی لیتے ہوئے جواب دیا-

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہاں دولت کی ریل پیل ہے اور لوگ بہت سکھی نظر آتے ہیں، مگر ان کے کچھ مسائل بھی ہیں"- میں نے کہا-

"وہ مسائل کیا ہیں؟" جیک نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا-

میری آنکھوں میں نیند تیر رہی تھی اور میں سونا چاہتا تھا- سو میں نے سبق سنانے کے انداز میں وہ مسائل گنوانے شروع کر دیئے- مثلاً یہ کہ انہیں سونے کے لئے نیند کی گولیاں استعمال کرنا پڑتی ہیں- ائر کنڈیشنڈ کار، ائر کنڈیشنڈ مکان اور زندگی کی دیگر سہولتوں سے بہرہ ور لوگ ڈیپارٹمنٹل سٹورز سے ہر سال کروڑوں ڈالر کی اشیاء چرا کر لے جاتے ہیں- تمام تر جنسی آزادی کے باوجود کوئی لڑکی رات کو پیدل سڑک پر نکلنے کی جرات نہیں کرتی- علاوہ ازیں جنسی تسکین کی تلاش میں وہ لواطت سے لے کر اپنے عضو کو بلیڈ سے چھیلنے تک کے مراحل طے کر جاتے ہیں- دولت کی ریل پیل کے باوجود کچھ لوگوں کو رات بھوکے رہ کر بھی بسر کرنا پڑتی ہے- کرپشن نچلی سطح پر قدرے کم مگر اوپر کی سطح پر بے انتہا موجود ہے- جرائم اپنی انتہا کو پہنچ چکے ہیں- پریس کے اجارہ دار مالکان کو اپنے مفادات کے مطابق پالیسیاں بنانے کی مکمل آزادی ہے- کالوں کی بستیاں اب بھی الگ ہیں اور اگر ان میں سے کوئی سفید لوگوں کی کسی بستی میں رہائش اختیار کر لے تو وہاں جائیداد کی قیمتیں گر جاتی ہیں- اخلاقی معیار دوغلے ہیں- ازدواجی زندگیوں میں انتشار ہے- بچے سڑکوں پر جوان ہوتے ہیں اور بوڑھے اولڈ پیپلز ہوم میں سسکتے دم توڑتے ہیں؟"

بات ختم کر کے میں نے جیک کی طرف دیکھا تو وہ اس گفتگو سے بے نیاز کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا- اسے امریکہ کی یہ تصویر غالباً یورپ سے مختلف دکھائی نہیں دی

تھی- سو میں نے ایک لمبی جمائی لی اور بستر میں دراز ہو گیا! رفتہ رفتہ غنودگی طاری ہوتی گئی اور پھر کچھ دیر بعد میں نیند کی آغوش میں تھا!

صبح آنکھ کھلنے سے پیشتر میں نے محسوس کیا کہ دو گرم گرم قطرے میری پیشانی پر گرے ہیں اور پھر گرتے ہی چلے گئے ہیں- اس کے ساتھ ہی دبی دبی سسکیاں سنائی دیں اور پھر آہستہ آہستہ سسکیاں ہچکیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں- اس پر گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں- ماریا میرے سرہانے بیٹھی تھی اور اس کی پیلی پیلی آنکھون سے آنسو بہہ بہہ کر بارش کے قطروں کی طرح میرے چہرے پر ٹپک رہے تھے۔ میں پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور آنکھیں ملتا ہوا اس کے برابر میں آن بیٹھا-

"کیا بات ہے؟" میں نے اپنی قمیض کے دامن سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا-

"کچھ نہیں! صرف رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ تمہارے پاس چلی آئی کیونکہ مجھے تمہارے بارے میں اطمینان تھا کہ دوسروں کی طرح تم ان آنسوؤں پر ناگواری کا اظہار نہیں کرو گے"

"نہیں صرف اتنی بات نہیں، تم یقیناً مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو!" اس نے ہچکیاں لیے ہوئے اپنا سر میرے شانوں پر رکھ دیا...... مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اب کے پہلو بدلنے کے بہانے اسے خود سے جدا کر سکوں!

"تم مجھے اپنا دوست سمجھو اور سب کچھ کہہ دو، میں تمہارے غم میں شریک ہونا چاہتا ہوں"- میں نے پیار سے اس کے شانوں پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا- ہمدردی کے اس اظہار پر اس کا دل مزید بھر آیا اور اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا- اس کے آنسو خشک ہونے میں نہیں آ رہے تھے اور وہ روتے چلی جا رہی تھی-

"اب خدا کے لئے چپ ہو جاؤ نہیں تو میں بھی تمہارے ساتھ رونا شروع کر دوں گا"- میں نے گلوگیر لہجے میں کہا- سچی بات ہے مجھ سے اس کی یہ حالت نہیں دیکھی جا رہی



تھی-

"کیا تم واقعی میرا دکھ جاننا چاہتے ہو" ماریا نے پیلی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا-

"ہاں ہم ایک دوسرے کے لئے یہی تو کر سکتے ہیں"- میں نے چارپائی سے نکل کر فرش پر بیٹھتے ہوئے کہا-

اس پر اس کی ہچکیاں آہستہ آہستہ سسکیوں میں تبدیل ہوئیں اور پھر وہ بالکل خاموش ہو گئی- وہ بھی چارپائی سے اٹھ کر فرش پر میرے ساتھ آن بیٹھی تھی-

"میرا باپ مسیحیوں کے پینٹی کاسٹ نامی فرقے کا ایک کٹر پیروکار ہے"- ماریا کی آنکھیں کسی بنجر زمین کی طرح ویران اور خشک ہو چکی تھیں اور اب اس کی زبان تپتی ریت کی طرح جھلنے لگی تھی- "فرقے کے عقائد کی رو سے مرد اور عورتوں کیلئے سگریٹ نوشی کی قطعی ممانعت ہے- فلم دیکھنا حرام ہے- عورتوں کے لئے حکم ہے کہ وہ خود کو پوری طرح ڈھانپ کر رکھیں- شادی سے پہلے کسی مرد کا ہاتھ تھامنا گناہ کبیرہ ہے- نیز دوسرے مذہب میں تو کیا، کسی دوسرے فرقے کی عورت یا مرد کے ساتھ شادی بھی از روئے شریعت جائز نہیں- میرا باپ ان عقائد پر سختی سے ایمان رکھتا تھا، مگر دوسری طرف وہ تین مختلف ملازمتوں سے ہیر پھیر کے الزام میں نکالا جا چکا تھا- وہ میری نیک دل ماں کو بھی اکثر پیٹتا تھا- بہر حال میں نے اپنے والد کے گھر میں عمر کے سولہ سال گزارے-

قصبے میں اس فرقے کے پیروکار صرف چند ایک ہی تھے۔ تاہم میرا باپ سمجھتا تھا، میں اس کی ہدایات پر پوری طرح عمل پیرا ہوں- مگر جب ایک روز اس نے یہ خبر سنی کہ میں حرامی بچے کی ماں بننے والی ہوں تو اس پر دل کا دورہ پڑ گیا- میرے لئے اس گھر کی دیواریں پہلے ہی بہت تنگ تھیں اور ایک حرامی بچے کی ماں بننے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے چاروں طرف سے یہ دیواریں آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی ہیں اور جلد ہی میری

ہڈیاں تک ریزہ ریزہ ہو جائیں گی- چنانچہ ایک روز میں نے وہ گھر چھوڑ دیا- جہاں میرے دو چھوٹے بھائی، ایک گڑیا سی بہن اور میری شفیق ماں رہتی تھی- قصبے سے نکلنے کے بعد میں نے یہ حمل گرایا اور اس وقت سے اب تک میں مختلف لوگوں کے ساتھ نگر نگر بھٹک رہی ہوں- جب پیسے ختم ہونے کو آتے ہیں تو کسی ادارے میں کچھ عرصے کے لئے ملازمت کر لیتی ہوں مگر اکثر لوگ ہمیں نوکری دینے سے گریز کرتے ہیں- اس دوران میں نے ہر اس چیز سے سکون تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ اس میں تمہاری بے چینیوں کا علاج پوشیدہ ہے، مگر میں اب بھی اتنی ہی مضطرب ہوں، جتنی اپنے والد کے گھر میں تھی- مجھے کسی نے محبت نہ دی حتی کہ اس نے بھی جس کی خاطر مجھے اپنا قصبہ اور گھر چھوڑنا پڑا- اب تو کبھی کبھی مجھے خود پر طوائف ہونے کا گمان گزرنے لگتا ہے!" اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں پھر سے بہہ نکلیں- اس نے اپنا سر میرے شانوں پر رکھ دیا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی- میری قمیض ان آنسوؤں سے تر ہوتی چلی گئی جو آج تک ماریا کی آنکھوں سے بہہ کر اس کے اپنے دامن ہی میں خشک ہو جاتے تھے- جیک اس دوران کمرے میں داخل ہوا اس نے ایک نظر ادھر دیکھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا-

"میں زندگی سے تنگ آ گئی ہوں- اب میں سکون کی تلاش میں صرف ایک سفر اور کرونگی"- اس نے میرے شانوں سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا"- میں افغانستان سے ہوتی ہوئی پاکستان اور انڈیا جاؤں گی- میں نے سنا ہے وہاں کے لوگ بہت پر سکون ہیں اور ان کی زندگیوں میں کوئی پیچیدگی نہیں"-

یہ سن کر میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سینے میں ایک بھاری سل رکھ دی ہو-

"کیا وہاں بھی شانتی نہیں ہے؟" میری یہ کیفیت دیکھ کر ماریا کی آواز کسی کنویں سے



آتی ہوئی سنائی دی-

میں نے کھوئے کھوئے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا"وہاں...... وہاں سکون ہی سکون ہے- ہر کوئی سکھی ہے- ہم تو کبھی ہنسنا بھی چاہیں تو بھی ہنسنے کا سامان پیدا کر لیتے ہیں یہ دیکھو!" اور پھر میں نے پاس دھرا اٹیچی کیس کھول کر لافنگ ٹوائے کا بٹن آن کر دیا- کمرے کی مغموم فضا میں ایک زبردست قہقہہ گونجا اور پھر اس میں ایک مضحکہ خیز تسلسل پیدا ہوتا چلا گیا- اس ٹین سے نکلنے والے قہقہوں نے اس پرانی عمارت کی خاموش فضاؤں میں ارتعاش سا پیدا کر دیا- قہقہوں کے اس مضحکہ خیز تسلسل کے دوران میں نے بھی ہنسنا شروع کر دیا......

......ماریا کے آنسو خشک ہو چکے تھے- اور اب وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی، گٹار کے زخمی تاروں پر دکھی انگلیوں کا رقص ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ ستار کے نوحے اداس شام کی چاپ کی طرح فضاؤں میں پھیل گئے تھے-

باہر سڑک پر خانہ بدوش ہپی سوکھے پتوں کی طرح انجانی منزلوں کی طرف رواں تھے- ایک سایہ ہوٹل کی راہداری سے نکلا اور اس بھیڑ میں شامل ہو گیا جس کا رخ پیرس کی طرف تھا-

------

# کوچہ حیدر پہلوان کا بھولا

ایمسٹراڈیم کے بارونق سٹیشن پر پیرس جانے کے لئے گول مول سی چھت، مٹیالے رنگ اور بڑے بڑے شیشوں والی ٹرین میری منتظر تھی- یہاں آنکھیں وہی منظر دیکھ رہی تھیں، جو دنیا کے کسی بھی ریلوے سٹیشن پر نظر آسکتا ہے، وہی مسافروں کا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنا، چہروں پر قدرے گھبراہٹ کے آثار، مناسب بوگی کی تلاش اور تلاش میں کامیابی پر سامان محفوظ جگہ پر رکھنے کے بعد یوں اطمینان سے سر سیٹ کے ساتھ ٹکا کر بیٹھنا، گویا ابھی ابھی بچہ جننے کے عمل سے فارغ ہوئے ہوں۔ ہوٹل سے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے میرے ایک سوٹ کیس کی "مٹھ" ٹوٹ گئی تھی چنانچہ اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ میں نے گلے میں ایک بھاری بھرکم بیگ لٹکایا ہوا تھا، ٹوٹی ہوئی "مٹھ" والا سوٹ کیس کاندھے پر تھا، جسے میں نے اپنے ہاتھ سے سہارا دیا ہوا تھا- جبکہ دوسرا سوٹ کیس میرے دوسرے ہاتھ میں تھا۔ جس کاندھے پر سوٹ کیس تھا، بیگ کا وزن بھی اسی جانب تھا، جس سے نہ صرف یہ کہ میری گردن ایک جانب کو ٹیڑھی ہو گئی تھی بلکہ اس طرف وزن بھی زیادہ ہو گیا تھا اور یوں میں چلتے وقت اس پتنگ کی طرح "کنّی" کھا رہا تھا- جس کی "تڑانویں" صحیح نہ ڈالی گئی ہوں- دوسری طرف ایسی چال چلنے کے باعث میرے لئے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا چنانچہ چلتے وقت ہاتھ میں پکڑا ہوا سوٹ کیس بار بار میری ٹانگ سے آٹکراتا جس سے مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا میں پنجاب کے کسی میلے میں رسے پر چلنے کے فن کا مظاہرہ کر رہا ہوں اور نیچے کوئی بچہ جمورا کھڑا ہے جو



مسلسل "ڈھول" بجانے میں مشغول ہے- اگر وطن عزیز میں مجھے کوئی اس ہیئت کذائی میں دیکھ لیتا تو میرا نام معززین کی فہرست سے ہمیشہ کیلئے خارج ہو جاتا، مگر یہاں تو ایسے معاملات میں راوی "ستے ای خیراں" لکھتا ہے- چنانچہ میں ارد گرد سے بے نیاز بوگی کی تلاش میں افتاں و خیزاں آگے بڑھتا ہی چلا گیا اور بالآخر ایک جگہ پائیدان پر پاؤں رکھ کر ٹرین کی راہداری میں داخل ہو گیا- یہ راہداری والی بات یوں ہے کہ یورپ میں چلنے والی ٹرینوں میں شروع سے آخر تک ایک طویل راہداری کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کمپارٹمنٹ بنے ہوتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں یہ سسٹم ائرکنڈیشنڈ یا فرسٹ کلاس کی بوگیوں میں نافذ ہے۔ بہرحال میں کچھ دیر راہداری میں چلنے کے بعد بائیں جانب ایک ڈبے میں داخل ہو گیا- یہ یقیناً ایک بہتر کمپارٹمنٹ تھا کیونکہ اس میں گنتی کے چند لوگ تھے، سو میں نے اپنا سامان، سامان کے لئے مخصوص جگہ پر رکھا اور دوسرے لوگوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی اطمینان کا سانس لے کر سر کو سیٹ کے ساتھ ٹکا کر بیٹھ گیا- مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک نہیں بیک وقت دو بچوں کو جنم دے کر فارغ ہوا ہوں!

سگریٹ کا ایک طویل کش لگانے کے بعد میں نے ارد گرد نظر دوڑائی تو اپنے ہاں کے کسی خوش ذوق شخص کے ڈرائنگ روم جیسے صاف و شفاف اور خوبصورت کمپارٹمنٹ میں ایک بوڑھا، اس کے ساتھ تیرہ چودہ سال کا ایک گول مٹول سا بچہ، دو نوجوان اور ایک خاتون بیٹھے نظر آئے، تاہم ان میں سے دو افراد بالکل خاموش تھے۔ ان میں سے ایک میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا، جس نے ایک اخبار نہ صرف یہ کہ دونوں ہاتھوں سے پوری مضبوطی سے تھاما ہوا تھا بلکہ اسے اتنی بلندی پر رکھا تھا کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا- دوسری اسی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون تھی جس کی گردن کھڑکی کی جانب تھی اور وہ بھی خاموش تھی کیونکہ اس کے ساتھ بیٹھا ایک ہینڈسم ڈچ نوجوان خاصی مضبوطی سے اس کا منہ بند کئے ہوئے تھا- اتنے میں انجن نے وسل دی اور وہ نوجوان دوشیزہ کی کمر میں

ہاتھ ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا تاہم اس نے اپنے ہونٹ اسی طرح داخل دفتر کیے ہوئے تھے۔
انجن نے دوسری وسل دی تو نوجوان نے آخری بار اپنی محبت پر مہر تصدیق ثبت کی اور راہداری کو تیزی سے عبور کر کے نیچے پلیٹ فارم پر آ گیا۔ دوشیزہ اپنے کمپارٹمنٹ کے باہر بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکی کے ساتھ ناک چپکائے کھڑی تھی۔ چند ہی لمحوں میں ٹرین کے تمام بیرونی دروازے خود بخود بند ہو گئے اور پھر ٹرین پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔ اس پلیٹ فارم پر کھڑے ڈچ نوجوان نے آہستہ آہستہ گاڑی کے ساتھ رینگنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص اسی انہماک کے ساتھ اخبار کے دونوں سروں پر اپنے پنجے گاڑے اور اپنا چہرہ اس کے پیچھے چھپائے بیٹھا تھا۔ یہ اخبار مقامی تھا اور یوں اس میں درج عبارت میری سمجھ سے بالا تھی مگر اچانک میری نظر ایک تصویر پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی میرے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی کیونکہ اس نے اخبار الٹا پکڑا ہوا تھا۔ اس پر میرے دل میں اس عجوبہ روزگار شخص کو دیکھنے کے لئے پیدا شدہ تجسس میں اضافہ ہو گیا۔ اب گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی تھی اور پلیٹ فارم پر ڈچ نوجوان ایک جگہ کھڑا ہو گیا تھا اور اب وہ رومال ہلا رہا تھا، خاتون اسی طرح اپنی ناک شیشے سے چپکائے جھکی ہوئی تھی اور جب رومال کے ساتھ ہی نوجوان کا چہرہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو یہ خاتون سیدھی کھڑی ہو گئی اور پھر مضمحل قدموں اور اداس اداس چہرے کے ساتھ واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور اب وہ پرس میں سے رومال نکال رہی تھی۔ اس کے برابر والا مسافر اسی طرح الٹے اخبار کو تھامے چہرہ چھپائے بیٹھا تھا اور اب مجھے اس پر جیمز بانڈ کا شبہ ہونے لگا تھا۔

"اللہ تیرا شکر ہے!!!" میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بچپن سے ذہن پر نقش یہ کلمات عادتاً ادا کیے!

"ہیں جی!!!؟" سامنے والے مسافر نے سخت گھبراہٹ کے عالم میں یکدم اخبار چہرے



سے نیچے کرتے ہوئے یہ لفظ خالص پنجابی لہجے میں ادا کئے، اس پر میری نظر فوراً اس چہرے پر گئی یہ ایک پاکستانی شکل و صورت تھی۔ اس نے بھی میری طرف دیکھا اور پھر فرط مسرت سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے لاہوری لہجے میں "ساما علیکم" کہا اور خیر خیریت پوچھتے ہوئے کہنے لگا۔ "بھا، جی۔ تُسی وی اپنے لاہور دے ای لگدے او" (بھائی جان، آپ بھی اپنے لاہور ہی کے لگتے ہیں) جب میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا تو وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کمال بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے ایک ہاتھ میری بغل میں دیا اور پھر مجھے قدرے اوپر اٹھا کر بھینچ لیا۔ اس پر میں نے گھبرا کر کنکھیوں سے اپنے ہم سفروں کی طرف دیکھا۔ جو "یہ فحش" منظر بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ میں نے خود کو اپنے پر خلوص ہم وطن کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی جو نہیں جانتا تھا کہ یورپ میں عورت اور مرد تو پوری آزادی کے ساتھ شارع عام پر گلے مل سکتے ہیں مگر یہاں مرد کا مرد کے ساتھ یوں معانقہ کرنا "قابل دست اندازی پولیس" جرم ہے اور ایسے جوڑوں کو "شارع عام پر فحش حرکات" کے الزام میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اس اثناء میں میرے ہم وطن نے معانقے کے دو "پھیرے" مکمل کر لئے تھے اور پھر اس نے تیسرا پھیرا مکمل کر کے مجھے بازو سے کھینچ کر سیٹ پر بٹھا دیا اور خود بھی میرے برابر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر وہ محبت اور مسرت تھی جو کسی ہمدم دیرینہ کو مل کر محسوس ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے رویے میں کچھ خود اعتمادی بھی پیدا ہو گئی تھی، جیسے وہ محسوس کر رہا ہو کہ اب وہ اکیلا نہیں، اس کا کوئی رفیق بھی اس کے ساتھ ہے۔

"میرا نام رشید بٹ ہے اور میں کوچہ حیدر پہلوان میں رہتا ہوں"۔ اس سرخ و سفید اور صحت مند نوجوان نے نام کے ساتھ "بٹ" کے اضافے سے کشمیری نژاد ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔

"میں بھی کشمیری نژاد ہوں تمہاری رنگت اور نقوش دیکھ کر پہلے ہی اندازہ ہوا تھا کہ

تم اپنی ہی برادری سے تعلق رکھتے ہو"۔ میرے اندر کی اس عصبیت نے سر اٹھایا جو انسان کو ایک وسیع برادری کا فرد ہوتے ہوئے بھی خود کو چھوٹے چھوٹے خانوں میں بانٹ کر نجانے کیوں تسکین پاتی ہے۔ میں نے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے "تم" سے مخاطب کر کے بے تکلفی کا رویہ بھی اپنالیا تھا۔

"واقعی؟" اس نے مسرت سے سیٹ پر سے اچھلتے ہوئے کہا "پھر تو ہماری نانی بھی ایک ہو گی۔ بے جی کہا کرتی ہیں کہ کشمیریوں کی نانی ایک ہوتی ہے"۔

"تم چہرے کو اخبار سے کیوں چھپائے بیٹھے تھے؟" میں نے اس کی بات سے لطف اندوز ہونے کے باوجود گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔ یہ الجھن مجھے مسلسل تنگ کر رہی تھی اور میں اسے بہر حال رفع کرنا چاہتا تھا۔

"او جی، بات یہ ہے کہ میرے ماموں جان نے چلتے ہوئے سمجھایا تھا کہ ٹرین میں کسی سے بات نہ کرنا اور چہرہ بھی چھپائے رکھنا"۔

"مگر کیوں؟" اس کی اس وضاحت سے میری حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"جی! دراصل بات یہ ہے کہ میرے ماموں ایمسٹرڈیم میں آباد ہیں۔ میں نے لاہور سے انہیں کئی خط لکھے کہ وہ میرے لئے ورک پرمٹ کا بندوبست کریں تاکہ میں بھی یہاں آسکوں، مگر وہ مجھے ٹرخاتے رہے۔ پھر جی ایک دن میں گھر والوں کی اجازت سے خود ان کے پاس پہنچ گیا۔ انہوں نے دو مہینے مجھے اپنے پاس رکھا۔ پھر کہا کہ تمہارے لئے یہاں نوکری کا انتظام نہیں ہو سکتا، پیرس جا کر قسمت آزمائی کرو لہٰذا اب میں پیرس جا رہا ہوں......"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے اخبار سے اپنا چہرہ کیوں چھپایا ہوا تھا؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"او جی، ماموں جان نے بتایا تھا کہ ایمسٹرڈیم میں قیام کے لئے تمہارا ویزا صرف ایک ماہ



کا تھا، جب کہ تم نے یہاں دو مہینے قیام کیا ہے لہٰذا رستے میں کسی سے فری نہ ہونا، کوئی پاسپورٹ چیک کرنے آئے تو چہرے پر پریشانی ظاہر نہ ہونے دینا اور اس کے لئے یہ ہے کہ کوئی اخبار وغیرہ سامنے رکھ لینا چنانچہ ڈبے میں داخل ہوتے ہی میں نے اخبار تھام لیا تھا خدا جانے کب کوئی آجائے!" بائیس تیئیس برس کے اس صحت مند خوبرو مگر سادہ لوح نوجوان نے ہچکچاتے ہوئے کہا اور اس پر ضبط کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی۔

"تمہیں علم ہے کہ تم نے اخبار الٹا پکڑا ہوا تھا؟"

"تو کیا فرق پڑتا ہے جی، سیدھا بھی پکڑا ہوتا تو کون سا پڑھا جانا تھا۔ وہ تو بس یونہی تھا جی"۔ اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"لاہور میں تمہارا کیا شغل تھا؟" میں نے خالص پاکستانی ہونے کا ثبوت دینے کیلئے ایک خالص ذاتی سوال پوچھا!

"گرمیوں میں شربت لگاتا تھا اور سردیوں میں ریوڑیاں بیچتا تھا"۔ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک بار پھر ندامت کے آثار نمودار ہوئے، جیسے اسکا پیشہ محنت نہیں راتوں کو نقب لگانا تھا۔

"بہت خوب!" میں نے بھی منافقت سے کام لیتے ہوئے اس طرح سر ہلایا گویا اس کے پیشے کی بابت سن کر میرے دل میں اس کی قدر بڑھ گئی ہے۔ حالانکہ ہم انسانی محنت کو تحقیر کی نظروں سے دیکھنے والے جس معاشرے کے فرد ہیں وہاں اس صحت مند رویے کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی، تاہم میرے دل میں اس نوجوان کے لئے ہمدردی سی پیدا ہو گئی تھی اور یہ غالباً اس کے بھولے پن کی وجہ سے تھی!

"تم بہت بھولے اور مجھے بہت اچھے لگے ہو، عیار لوگ مجھے زہر لگتے ہیں!" میں نے دلی جذبات اس تک پہنچائے۔ میری خواہش تھی کہ اس نوجوان میں کچھ خود اعتمادی پیدا ہو۔

"جی، مجھے گھر میں اور باہر سبھی بھولا ہی کہتے ہیں، رشید بٹ کے نام سے تو مجھے کوئی جانتا ہی نہیں، یہ تو میں یونہی آپ پر رعب ڈال رہا تھا! آپ کا کیا نام ہے؟" اس نے کچھ بے ساختگی سے یہ بات کہی کہ میرے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔

"گھر والے "شہزادہ" کہتے ہیں، باہر لوگ قاسمی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں"۔

"لیکن میں آپ کو بھاء جی کہوں گا!"

"جو جی چاہے کہو" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"بھا جی، بھا جی، اچانک اس نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے مجھے کہنی سے متوجہ کرتے ہوئے کہا"۔ وہ لڑکی آپ کو دیکھ رہی ہے!"

میں نے کنکھیوں سے سامنے والی سیٹ پر دیکھا تو وہ پرس میں سے رومال نکال کر اپنی چشم تر کو دھیرے دھیرے پونچھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ ابھی تک حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا اور لگتا تھا اس کا محبوب اس کی آنکھوں سے بہت دور ہوتے ہوئے بھی عکس بن کر اس "پانی کے گھر" میں رہتا ہے۔

"بھولے، بے وقوف بنا رہے ہو" میں نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے کہا

"نہیں، بھاء جی، خدا کی قسم وہ ابھی آپ کو دیکھ رہی تھی"۔

"دیکھو بھولے......"

"جی، میں آپ کی بات کاٹنا اچھا تو نہیں لگتا، لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں"۔

"ایسی کونسی بات ہے جس کا میں برا مانوں گا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "جی، وہ بات یہ ہے کہ آپ میرے بھائیوں جیسے ہیں آپ مجھے مار بھی لیں تو میں آنکھ نہیں اٹھا سکتا لیکن جی ایک بات کا ذرا خیال رکھیں!"

"وہ کیا؟" میری حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔



"وہ جی جب پاسپورٹ والا آئے تو اس کے سامنے مجھے بھولا نہ کہیں، "بٹ صاحب" کہیں، عزت کا معاملہ ہے؟"

یہ سن کر میرے حلق سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ نکلا۔ اس پر بھولے نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر ندامت کے آثار ابھرے۔ یہ دیکھ کر مجھے اپنے رویے پر شرمندگی سی محسوس ہوئی اور میں نے اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بھولے میں معافی چاہتا ہوں، میرا مقصد تیرا دل دکھانا نہیں تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ پاسپورٹ والے کے سامنے اگر میں تمہیں "بٹ صاحب" بھی کہوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا کیونکہ وہ ہماری زبان نہیں جانتا"۔

"آپ کی بات درست ہے!" میری وضاحت پر اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا اور اس نے سر جھکا لیا۔ "لوگ اگر مجھے بھولا کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں!"

# نام میں کیا رکھا ہے؟

اس دوران میں شام ہو چکی تھی اور کمپارٹمنٹ میں بجلی کے قمقمے جل اٹھے تھے۔

بھولے کے برابر والے مسافر نے اپنے بیگ میں سے سینڈوچ نکالے، بیئر کی بوتل کا کاک کھولا اور ضرورت سے زائد ایک سینڈوچ یورپین بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے بھولے کی طرف بڑھایا اور اسے کھانے کی دعوت دی۔ بھولے کے چہرے پر ممنونیت کے آثار نمایاں ہوئے اور پھر اس نے بے ساختہ کہا۔ "بس جی بسم اللہ کرو" اور اس کے ساتھ ہی اپنی غلطی کا احساس ہونے پر عجیب رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ باقی مسافر غالباً خاصے تھکے ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے ابھی سے آنکھیں موندلی تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان کے سر ایک دوسرے کے شانوں سے جالگتے تھے۔ سامنے والی دوشیزہ اب خاصی پر سکون نظر آرہی تھی۔ اس نے ایک کتاب کھولی ہوئی تھی اور خاصے انہماک سے محو مطالعہ تھی۔ لگتا تھا اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے بلکہ اس کے چہرے پر طمانیت کی لہریں یہ ظاہر کرتی تھیں گویا کچھ دیر پہلے کی جذباتی کیفیت یکسر ختم ہو گئی ہے اور اب وہ قطعی نارمل ہے۔ میں نے گردن پھیر کر بھولے کی طرف دیکھا جو نیند بھری آنکھوں کے ساتھ سامنے بیٹھے ہوئے تیرہ چودہ سالہ لڑکے کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیکھنے کے بعد آنکھیں موندلیتا تھا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سونا تو چاہتا ہے مگر تکلفاً ایسا نہیں کر رہا، تب میں نے اسے کہا کہ اگر نیند آئی ہوئی ہے تو سو جاؤ، میں بھی کچھ دیر بعد سوؤں گا۔ یہ سن کر وہ اٹھا، سوئے ہوئے لڑکے پر ایک نگاہ ڈالی



اور ٹائلٹ کی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹا تو اس نے پینٹ قمیض کی بجائے کرتا اور دھوتی پہنی ہوئی تھی اور دھوتی کا پلو ایک ہاتھ سے اسی طرح اوپر اٹھایا ہوا تھا جس طرح اسے اٹھایا جانا چاہئے یا یوں کہہ لیں کہ جس طرح ہمارے ہاں ارد گرد سے نظریں بند کر کے اٹھایا جاتا ہے۔ دوغلے اخلاقی معیاروں کے حامل یورپی معاشرے میں یہ لباس فحاشی کی ذیل میں آتا ہے اور میں بھولے کو یونہی لوگوں کی چبھتی نظروں کا نشانہ بنتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی حساس طبیعت کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی بات کسی اور طریقے سے کہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا بھولے! تمہیں دھوتی میں نیند آجاتی ہے؟"

"کیا مطلب جی، مجھے تو نیند ہی دھوتی میں آتی ہے"۔ اس نے حیرت سے جواب دیا "اگر آپ کو بھی ضرورت ہو تو لادوں۔ میرے پاس دو تین ہیں"۔

"نہیں یار، مجھے اس کی عادت نہیں" میں نے کہا "ایک بار دھوتی پہن کر سویا تھا، صبح جب آنکھ کھلی، تو دیکھا، اوپر لی ہوئی تھی!"۔

ہاہاہا! بھولے نے پہلی بار کھل کر بے تکلفی سے قہقہہ لگایا "اس لباس میں سہولت بہت ہے جی!"

"وہ تو ٹھیک ہے" مین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مگر دیکھو یہاں ایک بی بی بھی بیٹھی ہوئی ہے اور نیند میں آدمی آدھا مرا ہوا ہوتا ہے۔ سو اگر تمہارے پاس کوئی شلوار ہو تو پہن لو"۔

وہ یہ سن کر بولا "بھاء جی آپ ٹھیک کہتے ہیں، بہنیں اور بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں!" اور پھر وہ شلوار پہننے کے لئے چلا گیا۔ میں نے بھی کپڑے تبدیل کئے اور پھر ٹانگیں پھیلا کر اپنی ایک کٹر مذہبی قسم کی دوست لوری کی طرف سے دی ہوئی بائبل کھول کر بیٹھ گیا جس کے پہلے صفحے پر اس نے لکھا تھا۔

ATA,THE ONLY THING I CAN GIVE YOU IS THIS BIBLE

بھولا کچھ ہی دیر بعد خراٹے لینے لگا تھا اور خدا جانے خراٹوں کی یہ کونسی قسم تھی؟ سامنے والی دوشیزہ نے اس دوران کتاب بند کر کے اپنے پہلو میں رکھی اور پھر سونے کی نیت سے اپنا سر کھڑکی کے ساتھ ٹکا دیا۔ مگر لگتا تھا بلب کی روشنی میں وہ سونے کی عادی نہیں ہے، کیونکہ وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ دو ایک بار اس نے رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا بھی مگر میں "بھولا" بن گیا، کیونکہ مجھے اس وقت تک نیند نہیں آتی جب تک کسی کتاب کے کچھ صفحے نہ پڑھ لوں یا کم از کم سونگھ نہ لوں۔

"ایکسکیوزمی" بالآخر اس نے مجھ سے براہ راست مذاکرات کا آغاز کیا "اگر تم برا نہ مانو تو بتی گل کر دوں؟" اس کا لہجہ خاصا خوشگوار تھا۔

"ضرور ضرور" میں نے اس کے لہجے سے حوصلہ پا کر شرارت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری موجودگی میں کتاب پڑھنے کے لئے میں بلب کی روشنی کا محتاج نہیں ہوں"!

میں جانتا تھا کہ یہ فلیٹرنگ ریمارکس دنیا کے کسی بھی حصے کی خاتون کا خانہ خراب کرنے کے لئے کافی ہیں، چنانچہ اس نے خوشدلی سے چہکتے ہوئے کہا "واقعی"؟

"ہاں" میں نے ہاتھ والی کتاب پرے دھرتے ہوئے سامنے والی کتاب پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا "بلکہ خوبصورت چہروں کی روشنی میں مطالعہ کرنے سے بینائی بھی درست رہتی ہے، ورنہ میں جتنا کتابوں کا کیڑا رہا ہوں۔ ابھی تک میرے چہرے پر کئی عینکیں چڑھی ہوتیں، مگر دیکھ لو ایک بھی نہیں!"

"تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم خاصے پروفیشنل قسم کے مطالعہ کرنے والے ہو"۔ اس نے اپنے گھٹنوں پر دونوں کہنیاں جماتے ہوئے آگے کی طرف جھک کر کہا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "البتہ کفرانِ نعمت کا کبھی



مرتکب نہیں ہوا"۔

"تم خاصے کی چیز ہو، کہاں سے آ رہے ہو؟" اس نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"جہاں سے تم آ رہی ہو!"

"میں تو امریکہ سے آ رہی ہوں، تم بھی ادھر ہی سے......"

"ہاں۔ میں بھی ادھر ہی سے آ رہا ہوں اور اب اپنے وطن کو واپسی ہے"۔

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ میں امریکی ہوں؟"

"جس طرح ہر احمق شخص کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے کہ حضرات! میں احمق ہوں، اسی طرح ہر امریکی اپنے امریکی ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے"۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے، امریکی احمق ہوتے ہیں؟" اس نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، بعض نہیں بھی ہوتے۔ ویسے اگر تم چاہو تو میں تمہارا نام بھی بتا سکتا ہوں"۔

"سچ مچ"؟ اس نے حیرت سے کہا "اگر تم میرا نام بتا دو تو میں تمہیں مان جاؤں!"

"یہ کونسی مشکل بات ہے" میں نے کہا "تمہارا نام لنڈا، شیری، ڈیبرا، باربرا، نینسی اور میری وغیرہ کی پیٹنٹ فہرست سے باہر نہیں ہو سکتا"۔

"اوہ خدایا!" اس نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "میرا نام واقعی نینسی ہے!"

"اب اگر تم کہو تو اس کا نام بھی بتا دوں، جو تمہیں اسٹیشن پر چھوڑنے آیا تھا" میں نے صورت حال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔

"کیا تم اب کے بھی مذاق تو نہیں کر رہے؟" نینسی کے چہرے سے جوش و خروش جھلکنے لگا۔

"ارے نہیں، یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"۔

"تو پھر جلدی سے اس کا نام بتاؤ" نینسی نے بے تابی سے کہا۔

"تو پھر سنو! اس کا نام "بی" (B) سے شروع ہوتا ہے!" میں نے یہ سوچ کر تکا لگایا کہ اگر تیر نشانے پر بیٹھا تو اپنی "ولایت" پکی ہے ورنہ کہہ دوں گا کہ پامسٹری میں بڑے بڑے ماہر بھی ٹھوکر کھا جاتے ہیں، کیونکہ غیب کا علم تو صرف خدا کو ہے!

لیکن ہوا یوں کہ "بی" کا لفظ سن کر اس ڈبل بی (بی بی) کے منہ سے "اوئی اللہ" قسم کی چیخ برآمد ہوئی اور وہ جوش جذبات میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے اور بھولے کے درمیان تنگ سی جگہ میں آ کر بیٹھ گئی۔ "اس کا نام اووے بنجمن ہے، تم نے کافی حد تک ٹھیک بتایا ہے، تم...... تم پامسٹری کے پروفیسر تو نہیں ہو؟"

"ہاں، میں پامسٹری کا پروفیسر ہوں" میں نے گڑبڑا کر کہا "اور سرکلر روڈ کے فٹ پاتھ پر طوطے سے توپ میں ہی چلاتا ہوں!"

"وہ بہت سویٹ ہے" نینسی نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا "میں کیلیفورنیا یونیورسٹی میں فنون لطیفہ کی طالبہ ہوں، اپنے تھیسز کی تکمیل کے لئے ایمسٹرڈیم آئی تھی اور اب اسی سلسلے میں ایک روز کے لئے پیرس جا رہی ہوں، مجھے اسی روز واپس ایمسٹرڈیم پہنچنا ہے کیونکہ وہاں ابھی میرا کام باقی ہے۔ میری اس سے ملاقات دو روز قبل ایمسٹرڈیم کی آرٹ گیلری میں ہوئی تھی۔ ہم اس قلیل عرصے ہی میں ایک دوسرے کو بہت چاہنے لگے ہیں، مجھے اس کے بارے میں کچھ اور بتاؤ"۔

"میں اس کے بارے میں مزید کچھ نہیں جانتا"۔ میں نے خود پر نرم نرم سا دباؤ محسوس کرتے ہوئے قدرے سرک جانے میں عافیت سمجھی اور پھر کہا "البتہ تمہارے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہوں"۔

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے بے تابی سے اپنا سنہری ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ دیا۔



"پہلی بات یہ ہے کہ......" میں نے دماغ کو ایک جھٹکا دیا اور پھر پورے اعتماد سے کہا "تم بہت جذباتی ہو، فیصلے بہت عجلت میں کرتی ہو"۔

"بالکل ٹھیک ہے، میری ماں شروع سے مجھے اس پر ٹوکتی آئی ہے"۔

"دوسری بات یہ ہے کہ تم ایک بہت مخلص لڑکی ہو اور پیار کرنا تمہاری زندگی ہے"۔

"اوہ خدایا! تم تو میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو، مجھے تو تم سے ڈر لگنے لگا ہے"۔ اس نے ایک ادائے خاص سے مجھے قریباً انہی نظروں سے دیکھا، جن کی تاب لانے کے لئے خاصے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔

"ابھی تو کچھ بھی نہیں، اور سنو!" میں نے میدان صاف پا کر پیش قدمی کرتے ہوئے کہا "تم آج تک جس شہزادے کو ڈھونڈتی رہی ہو، اب اسے بہت جلد پا لو گی اور اس کے لئے تمہیں زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا، کیونکہ میرا نام شہزادہ ہے!"

"تم بہت شریر ہو" اس نے نزاکت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"جب تم کتاب پڑھ رہے تھے، اس وقت تو اتنے خطرناک نہیں لگتے تھے"۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ بھولا ٹھیک ہی کہتا تھا"۔

"یہ بھولا کون ہے اور وہ کیا کہتا تھا؟" نینسی نے پوچھا۔

"بھولا وہ ہے، جو اس وقت تمہارے کاندھوں پر سر رکھے سو رہا ہے اور وہ کہتا یہ تھا کہ تم اس خاکسار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی ہو!"

"ایسی تو کوئی بات نہیں" نینسی نے ایک زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میں نے تمہیں یونہی ایک سرسری سی نظر دیکھا تھا اور اس قسم کی نظر تو میں نے بھولے کے ساتھ والے بوڑھے پر بھی ڈالی تھی، جو اس وقت اپنے ساتھی کے کاندھوں پر سر رکھے یوں سو رہا ہے، جیسے برسوں سے اس کے ساتھ رومانس چل رہا ہو"۔

"خیر ماضی کی بات چھوڑو" میں نے ہنستے ہوئے کہا "یہ بتاؤ اب اس خاکسار کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے ؟"

"فیصلہ یہ کیا ہے کہ کل شام کی ٹرین سے مجھے واپس ایمسٹرڈیم جانا ہے، اتنا عرصہ ہم اکٹھے پیرس میں گھومیں پھریں گے اور دوسرا فیصلہ یہ کیا ہے کہ اب سویا جائے کیونکہ ایک بجنے کو ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی ایسا کرنے سے بھولا لڑھک کر مجھ پر آن گرا۔ کیونکہ ابھی تک اس کا سر نینسی ہی کے کاندھوں پر تھا۔ اس نے نیند کے عالم میں ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر مجسم شباب نینسی کو اپنے بالکل قریب پا کر گھبراہٹ کے عالم میں قمیض گھٹنوں تک سرکا لی، میں نے اس دوران نینسی کو الوداع کہا تو بھولے نے نیم خوابی کے عالم میں پوچھا "بھاجی، بھاجی پیرس آ گیا ہے ؟"

"نہیں، لیکن یہ سمجھو کہ ہم پیرس ہی میں ہیں" میں نے مسکرا کر اسے تھپکی دیتے ہوئے جواب دیا اور کچھ ہی دیر بعد اس کے خراٹوں کا کارواں پھر سے جادہ پیما ہو گیا۔ ٹرین رات کی خاموشی اور ظلمتوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور بوگیوں سے نکلنے والی روشنیوں میں درختوں کے جھنڈ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نمودار ہوتے تھے اور آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے!

اگلے روز صبح پانچ بجے ہم پیرس کے اسٹیشن پر تھے، ہم نے اپنا سامان اسٹیشن کے 'لاکر' میں محفوظ کر کے چابیاں جیب میں ڈالیں اور باہر نکل گئے۔ بھولے کو اس کے ماموں نے اپنے کسی دوست کا ایڈرس دیا تھا۔ چنانچہ وہ سٹیشن ہی سے ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس نے اپنا اڈریس اور ٹیلی فون نمبر مجھے لکھا دیا تھا۔ نینسی اپنے تعلیمی فرائض کے سلسلے میں کچھ دیر کے لئے اپنے ساتھ مجھے بھی ان مقامات پر کھینچتی پھری، جن سے مجھے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ البتہ بقیہ وقت باہمی دلچسپی کے امور پر مذاکرات میں صرف ہوا، اور پھر شام کو میں اسے الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھا۔ میں گاڑی



چلنے کے انتظار میں اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور اس کے ہونٹوں پر وہی پرانی خاموشی کی مہر ثبت تھی۔ سامنے والی سیٹ پر دو معمر خواتین بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ایک نوجوان فرانسیسی تھا، جس نے کتاب کھولی ہوئی تھی۔ انجن نے وسل دی تو میں سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور نیچے پلیٹ فارم پر آ گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی۔ نینسی راہداری میں کھڑکی کے شیشے کے ساتھ ناک چپکائے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی کی لکیریں نمایاں تھیں اور وہ اپنے پرس میں سے رومال نکال کر آنکھوں کو تھپتھپا رہی تھی۔ میں نے اپنی جیب میں سے رومال نکال کر ہلانا شروع کر دیا اور پھر رفتہ رفتہ اس کا خوبصورت چہرہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسے الوداع کرتے وقت مجھے یہ سمجھانا یاد نہ رہا کہ ایک تو اس سفر کے دوران رات ہونے پر سامنے والے فرانسیسی نوجوان سے بتی گل کرنے کو نہ کہنا اور دوسرے پامسٹری کے حوالے سے اس سے میرا نام جاننے کی کوشش نہ کرنا کہ شیکسپیئر نے کہا ہے نام میں کیا رکھا ہے ؟

# روشنیوں میں ڈوبا ہوا پیرس

پیرس میرے خوابوں کا شہر رہا ہے اور یہ اس وقت سے ہے جب نو دس برس کی عمر میں گلہ بکریانوالہ کے کوچہ لیر چونیاں میں ہمارے مکان کے برابر میں واقع ایک کھولے میں بنٹے کھیلتے ہوئے چھبے نے مجھے کہا تھا۔ ”شہزادے تمہیں پتہ ہے پیرس میں شیشے کی سڑکیں ہیں“۔

”اچھا!!!!“ میں نے ”کھتی“ میں بنٹے پھینکنے کے بعد گیٹس والا دھاری دار پاجامہ ہاتھ سے اونچا کرتے ہوئے حیرت سے کہا، جو میرے جھکنے سے خاصا نیچے کو ڈھلک گیا تھا۔

”تمہیں کیسے پتہ ہے؟“

”میرے خالہ کے لڑکے نے بتایا ہے، وہ چھ مہینے وہاں رہ کر آیا ہے“۔

”تو پھر وہاں لوگ چلتے کیسے ہوں گے؟“ میں نے ایک ہاتھ سے نشانہ لگاتے اور دوسرے ہاتھ کی کہنی سے بہتی ناک پونچھتے ہوئے کہا۔

”ایک دوسرے کو پکڑ کر چلتے ہوں گے اور کیا؟“ چھبے نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

اس وقت روشنیوں میں ڈوبا ہوا پیرس میرے سامنے تھا۔ اس کی سڑکیں تو شیشے کی نہیں تھیں البتہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں واقعی ایک دوسرے کو پکڑ کر چل رہے تھے اور چھبے کا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ تاہم میرے وہ تصورات درست ثابت نہیں ہوئے تھے جو میں نے ذرا بالغ ہونے پر سنی سنائی باتوں کی روشنی میں پیرس کے بارے میں قائم کئے تھے۔ مثلاً میرا خیال تھا کہ پیرس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی کچھ ایسے



مناظر دکھائی دیں گے کہ ہم مشرق کے باسی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیں گے اور کہیں گے۔

”نیک بیبیو! اور کچھ نہیں تو کم از کم چھوٹے کپڑے ہی پہن لو کہ اللہ تعالیٰ اتنی بے حیائی کو پسند نہیں کرتا، لیکن یہاں اس وعظ کی نوبت ہی نہ آئی، اس مہینے کے لئے فیشن ساز اداروں نے کچھ ایسے ملبوسات تیار کئے تھے جس پر جلی حروف میں ”مستورات کے لئے پردہ کا خاص انتظام ہے“ کی عبارت درج نظر آتی تھی...... اس شہر نے مجھے کچھ یوں بھی مایوس کیا تھا کہ میں کوچہ لیر چونیاں سے سیدھا یہاں نہیں پہنچا تھا بلکہ نیویارک، واشنگٹن اور شکاگو ایسے جلال و جمال کے مظہر شہروں میں خاصے اچھے دن بسر کر کے یہاں آیا تھا۔ چنانچہ رنگ و روغن سے بے نیاز سیاہ عمارتوں، چھوٹی چھوٹی دکانوں اور عام سی سڑکوں پر نظر ڈالتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں لاہور سے پنجاب کے کسی چک میں پہنچ گیا ہوں۔ یہ احساس مجھے یورپ میں قدم رکھتے ہی ہوا تھا کہ مادی ترقی اور اس ترقی کے نمائشی پہلوؤں کے لحاظ سے یورپ ابھی امریکہ سے بہت پیچھے ہے۔ لیکن پیرس پہنچ کر اس میں شدت یوں آ گئی کہ اس شہر کے بارے میں میرے جذبات خاصے نازک تھے۔ اوپر سے سٹیشن سے نکل کر جب کسی قہوہ خانے کی تلاش میں نکلا جہاں ایک کپ کافی پی سکوں اور زولا کو اپنی آمد کی اطلاع دے سکوں، تو ”ونڈو شاپنگ“ کے دوران پیرس کے بارے میں میرا وہ طلسم بھی پاش پاش ہو گیا جو فیشن کی دنیا میں اس کے سبقت لے جانے کے بارے میں تھا۔ روشنیوں سے معمور شوکیسوں میں میری نظر ٹائیوں، قمیضوں اور جیکٹوں وغیرہ ہی پر پڑتی تھی، لیکن یقین جانیں ان میں کوئی ناولٹی نہیں تھی کیونکہ ان شوکیسوں میں جو ملبوسات نظر آ رہے تھے، وہ سب پہلے ہی سے میرے ”ہنڈائے“ ہوئے تھے۔ تاہم اس کی توجیہ میرے ایک دوست نے یوں کی کہ بے شک نئے فیشن چشم زدن میں دنیا کے کونے کونے اور خصوصاً امیر ملکوں تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن یہ سب کے سب فرانسیسی ڈیزائنروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اس

کے لئے یہاں باقاعدہ بڑے بڑے مقابلے اور میلے منعقد ہوتے ہیں۔ ان سطور سے میرا مقصود اپنے قارئین کو یہ تاثر دینا ہرگز نہیں کہ پیرس اور بدوملہی میں کوئی فرق نہیں بلکہ میں تو صرف وہ تفاوت بیان کر رہا ہوں۔ جو مجھے اپنے ذہن اور آنکھ کے مابین نظر آیا۔ تاہم یورپ کے شہر اور خصوصاً پیرس زندگی کی چہل پہل کے لحاظ سے یقیناً امریکہ سے آگے ہیں۔ وہاں تو صرف PUSH BUTTON CULTURE ہے، جب کہ یہاں معاملہ کچھ اس سے الگ بھی ہے۔ امریکہ کے بیشتر شہروں میں شام ڈھلنے کے بعد عموماً سڑکیں سنسان نظر آنے لگتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ کچھ لوگ آپ کو کاروں میں "چہل قدمی" کرتے نظر آجائیں گے۔ لیکن یہاں زندگی پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے پر واقع قہوہ خانوں میں لوگ صرف بند دروازوں ہی میں مقید نہ تھے بلکہ فٹ پاتھ پر سایہ فگن سائبانوں کے نیچے کرسیاں ڈال کر بیٹھے تھے اور شرعی وغیر شرعی مشروبات سے دل بہلا رہے تھے، مجھے پیرس میں سب سے دلربا منظر یہی لگا کہ مشینوں نے یہاں کے انسانوں کو ابھی پوری طرح تسخیر نہیں کیا بلکہ فی الحال وہ انسانوں ہی کے "انڈر" کام کر رہی ہیں...... بہر حال مجھے زولا کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دینا تھی۔ زولا جس کے لئے میرے دل میں وہ محبت نہ تھی جسے میں بہت سنبھال سنبھال کر رکھنے کا عادی ہوں، لیکن نیویارک سے لکسمبرگ کے سفر کے دوران اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں جو تحریر میں نے پڑھی تھی اور پھر اس کے جسم میں دوڑتی بجلیوں کے جو کرنٹ میں نے جہاز میں محسوس کیے تھے، اس نے اس کی یاد کو دل سے محو نہیں ہونے دیا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے پسندیدگی کے خاصے شدید جذبات تھے اور اب میں جلد از جلد اسی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں دائیں ہاتھ پر واقع ایک ریستوران میں گھس گیا تاکہ اسے ٹیلی فون کر سکوں۔ کاؤنٹر پر بیٹھے فرانسیسی نے ایک کرخت مسکراہٹ کے ساتھ مجھے خوش آمدید کہا۔ میں نے اس سے ٹیلی فون کا "پتہ" پوچھنے کے لئے فوراً فرانسیسی زبان میں گفتگو کا آغاز "موسیو!" کہہ کر کیا اور اس کے ساتھ ہی میری فرانسیسی زبان کا کوٹہ ختم ہو گیا۔



# میں بھی زولا کا بوائے فرینڈ ہوں!

تاہم اس موقع پر میں نے کمال ہوشیاری سے ٹیلی فون کی "ٹ" کو "ت" میں تبدیل کیا اور کمال اعتماد سے دوبارہ فرانسیسی میں "گفتگو" کرتے ہوئے پوچھا۔ "تیلیفون؟" اور اس کے ساتھ ہی ذخیرہ الفاظ ایک بار پھر ختم ہو گیا۔ اس بار کاؤنٹر کلرک کے چہرے پر قدرے قابل اعتماد مسکراہٹ ابھری اور اس نے دائیں جانب دیوار سے لگے ٹیلی فون کی طرف اشارہ کیا...... میں نے ڈائل کے نمبر گھمائے، کچھ دیر گھنٹی بجتی رہی اور پھر دوسری طرف سے ایک خاصی گھمبیر مردانہ آواز ابھری "ہیلو!"

"مارے گئے!" میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا "یہ یقیناً زولا کا بھائی ہے اور مجھے "رانگ نمبر" کہہ کر ٹیلی فون بند کر دینا چاہئے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس احمقانہ خیال پر خود ہی ہنسی آگئی۔ یہ لڑکیوں کے بھائیوں کا خوف مغرب میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا!!!

"میں عطا ہوں، زولا کا بوائے فرینڈ!"

"میں بھی زولا کا بوائے فرینڈ ہوں، آگے بات کرو!" دوسری طرف سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی لیکن سالم لہجے میں جواب موصول ہوا۔

"بات تو مجھے زولا سے کرنی ہے" میں نے اس نازک صورت حال سے پیدا شدہ گھبراہٹ کے نتیجے میں ہکلاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ" دوسری طرف سے آواز آئی۔ غالباً یہ مرد حر اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو گیا تھا "اس کی ماں بیمار ہے اور وہ یہاں سے تیس پینتیس میل دور واقع اولڈ پیپلز ہوم

میں اس کی خبر گیری کے لئے گئی ہے۔ میں اسے فون پر تمہاری آمد کی اطلاع کر دیتا ہوں، تم مجھے دوبارہ فون کر لو“۔

میں نے کچھ دیر بعد فون کیا ”زولا کہتی ہے تم فوراً یہاں پہنچ جاؤ، وہ اولڈ پیپلز ہوم سے روانہ ہونے والی ہے اور گھنٹے پون گھنٹے میں واپس اپنے اپارٹمنٹ میں آجائے گی۔“ اس نے سخت ناگوار لہجے میں یہ پیغام مجھ تک پہنچایا اور پھر ایک جھٹکے سے ٹیلی فون بند کر دیا۔

یہ صورت حال جس سے میں بخیر وخوبی گزر گیا تھا، فارسی بولنے والوں کو بھی پیش آتی ہے اور وہ اس موقع پر ”رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت“ قسم کی بات کہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے دل میں آئندہ خدشات نے سر اٹھا لیا تھا اور میں انہی خیالوں میں گم ”بازار ڈی ہوٹل ڈی ویل“ پہنچنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ یہ ایک خاصی ماڈرن مارکیٹ ہے جس کے عقب میں پرانی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ پیرس شہر کی انتظامیہ ان پرانی عمارتوں کو مسمار کر کے ان کی جگہ نئی عمارات بنانا چاہتی ہے لیکن یہاں آباد نوجوان نسل انتظامیہ کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہیں دیتی، وہ مسلسل اس کے خلاف احتجاج کرتی رہتی ہے، بلکہ ایک آدھ دفعہ تو یہ لوگ اس سلسلے میں سڑکوں پر بھی نکل آئے ہیں۔ زولا کا فلیٹ بھی یہیں تھا۔ میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور پھر یہاں سے پیرس کے ”گارے دی ساں“ اسٹیشن سے اپنا سامان اٹھا کر ”بازار ڈی ہوٹل ڈی ویل“ پہنچ گیا۔

کچھ دیر بعد میں ایک پرانی عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ زولا یہیں رہتی تھی۔ ایک انتہائی قدیم گھر کی چمگادڑوں کے مسکن جیسی گول سیڑھیاں طے کرنے کے بعد میں دوسری منزل پر پہنچا تو بیل (BELL) دی۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور میرے سامنے ایک قوی ہیکل، چوڑی چکلی چھاتی، دراز قد، بھرے بھرے ڈولوں اور گھنی بھوری مونچھوں اور بڑے بڑے بالوں والا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور ناک قدرے اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ وہ پتلون پر ٹی شرٹ پہنے تھا، جس سے اس کی چوڑی چکلی چھاتی کچھ



اور نمایاں ہو گئی تھی۔

”میرا نام کلاڈ ہے!“ اس نے تاثرات سے عاری چہرے کے ساتھ میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میرا نام وہی ہے، جو میں نے ٹیلی فون پر بتایا تھا“۔ میں نے اس TENSE صورت حال کو خوشگوار بنانے کے لئے بے تکلفی کے مظاہرہ کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی“ کلاڈ نے مشینی انداز میں کہا۔

”مجھے بھی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی“ میں نے بھی اپنا ”ٹیپ ریکارڈر“ آن کر دیا۔

اور یقیناً ہم دونوں ”تقیہ“ کر رہے تھے......!

لکڑی کے فرش کا ڈرائنگ روم چند کرسیوں، ایک چوکور میز، کونے میں پڑے ہوئے ایک ریکارڈ پلیئر اور ایک بک شیلف پر مبنی تھا۔ نیچے رگ بچھا تھا۔ دیواروں پر کچھ تجریدی تصویریں تھیں اور ایک کونے میں بڑی سی گٹار لٹک رہی تھی۔ میں نے اپنا سامان زمین پر رکھا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کلاڈ نے ایک نظر میری طرف دیکھا، پھر باہر کے دروازے کی طرف بڑھا اور آگے بڑھ کر کنڈی لگا دی۔ مجھے ایک دم جسم میں سنسنی سی محسوس ہوئی اور میں آئندہ خطرات کا تصور کر کے خود کو صورت حال کے مقابلے کے لئے تیار کرنے لگا۔ کلاڈ برابر والے کمرے میں چلا گیا، دو ایک بار اندر سے کچھ کھڑاک سا سنائی دیا اور پھر وہ واپس ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بیئر کے دو ”ٹن“ تھے اس نے ایک میری طرف سرکایا اور دوسرے کو منہ سے لگا لیا۔ میں نے اس پر اطمینان کا ایک طویل سانس لیا اور اپنے حصے کی بیئر اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری اس میزبانی کا شکریہ مگر افسوس کہ میں شراب نہیں پیتا“۔

واقعی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا اور پھر منہ لگا کر اسے بھی لسی کی طرح غٹا غٹ پی گیا۔!

# سیاہ آنکھوں کی میزبانی

اتنے میں دروازے پر گھنٹی ہوئی اور کلاڈ لپک کر دروازے کی طرف گیا۔

"یہ یقیناً زولا ہے" مجھے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کلاڈ نے آہستگی سے قریباً آدھا دروازہ کھولا۔ سامنے ایک دراز قد، بھاری چھاتیوں اور چوڑے جسم والی کچھ اس قسم کی عورت کھڑی تھی جس سے پنڈت کوکا نے اپنی کتاب میں مردوں کو بار بار خبردار کیا ہے۔ کلاڈ نے جلدی سے دروازہ باہر کو بند کیا اور کمرے میں واپس آنے کی بجائے نیچے سیڑھیوں کی جانب جاتے ہوئے مجھے میرے نام سے پکارا اور کہا "اندر سے دروازہ بند کرلو، میں جارہا ہوں"۔ میں نے اٹھ کر اس کی ہدایت پر عمل کیا اور پھر مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے سینے پر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا ہو، میں نے واپس ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اٹیچی کیس کھولا، کرتا پاجامہ نکالا اور پھر اطمینان سے میز پر پاؤں رکھ کر ستانے لگا۔ رات کی بے آرامی اور دن بھر کی تھکن کی وجہ سے مجھ پر غنودگی سی طاری ہوگئی، مگر کچھ ہی دیر بعد گھنٹی کی آواز پر مجھے اٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا اور اس بار بڑی بڑی کالی آنکھوں والی، سرخ وسفید رنگت اور متناسب جسم میں برجی باردت کی حریف زولا میرے سامنے کھڑی تھی، اس نے مجھے اپنے سامنے پایا تو وارفتگی کے عالم میں آگے بڑھی اور اپنے بازو میرے گلے میں ڈال دیئے۔ میرے ہونٹوں پر شہد کا ذائقہ تھا!

"عطا، تمہیں اندازہ نہیں میں تمہیں یہاں دیکھ کر کتنی خوش ہوں"۔ اس نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی اور یہ کیفیت وہ ہے جو



چھپائے نہیں چھپتی اور ظاہر کرنے کی کوشش میں ظاہر نہیں ہوتی۔ مجھے کھرے اور کھوٹے سکے پہچاننے میں عموماً دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اور میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کی ہیجانی انداز میں متحرک پتلیاں سچ بول رہی تھیں۔

"تم نے مجھے بہت انتظار کرایا ہے، یاد ہے تم نے کہا تھا کہ تم میرے پیچھے پیچھے یہاں پہنچ جاؤ گے، میں اتنے روز دفتر اور گھر کے علاوہ کہیں نہیں گئی۔ آج اپنی ماں کے پاس جانے سے پہلے کلاڈ کو تاکید کر گئی تھی کہ اگر تمہارا فون آئے تو فوراً مجھے اطلاع کردے۔ یہ کلاڈ کہاں مر گیا ہے!" زولا نے میرا ہاتھ تھامے ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک بڑی خونخوار عورت کے ساتھ باہر گیا ہے!" میں نے جواب دیا۔

"حرامزادہ" زولا کے چہرے پر نفرت کے آثار نمایاں ہوئے "میری زبان سے تمہارا ذکر سن کر آگ بگولا ہو گیا تھا، لیکن خود بازاری عورتوں کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔ ایک آدھ بار تو وہ میری موجودگی میں بھی انہیں یہاں لایا ہے"۔

"عجیب بات ہے" میں نے حیران ہو کر کہا "اگر اس طرح کی صورتحال ہے تو تم لوگ ایک مکان میں کس طرح رہتے ہو......؟"

"ہم ایک دوسرے کی ضرورت بہت اچھی طرح پوری کرتے ہیں" زولا نے مغربی لڑکیوں ایسی بے باکی سے جواب دیتے ہوئے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر کہا "اور پھر مجھے اس کے باعث کچھ تحفظ کا احساس بھی ہوتا ہے...... لیکن اب کچھ عرصے سے میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ بہت جلد اس سے الگ ہو جاؤں گی!"

"خیر چھوڑو" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "تمہاری ماں اب کیسی ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے" زولا نے جواب دیا۔ "دراصل اولڈ پیپلز ہوم میں وہ گھبرا جاتی ہے اور پھر اس عالم میں وہ مجھے فون کردیتی ہے کہ جلد چلی آؤ۔ میں مرنے والی ہوں"۔

"ہونہہ!" مجھے زولا کی یہ بات سن کر دکھ ہوا مگر میں اس وقت یہ موضوع چھیڑنا نہیں

چاہتا تھا۔ سو میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا" مجھے سخت بھوک لگی ہے!"

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا" زولا نے اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف آتے ہوئے ایک بار پھر اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے "آؤ باہر چل کر کچھ کھاتے ہیں"۔

"نہیں، میں سخت تھکا ہوا ہوں، اس وقت جو کچھ گھر میں ہے، لے آؤ"۔

"گھر میں تو کچھ سینڈوچ ہیں۔ تم تھوڑی دیر انتظار کرو، میں کوئی اور چیز بھی تیار کر لیتی ہوں" اس نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"میں انتظار نہیں کر سکتا۔ کچھ سینڈوچ اور پانی کی بوتل لے آؤ اور اس دوران میرے سامنے بیٹھی رہو، میں سیر ہو جاؤں گا"۔

زولا نے محبت بھری نظروں سے مڑ کر دیکھا اور پھر دودھ کا گلاس اور ایک پلیٹ میں کچھ سینڈوچ لے آئی۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم کافی دیر وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے، حتیٰ کہ میری آنکھوں میں نیند تیرنے لگی اور میں نے ایک جماہی لیتے ہوئے فضا میں اٹھے ہوئے ہاتھ واپسی پر زولا کے شانوں پر رکھ دیئے۔ "تم جانتے ہو مجھے بہت نیند آئی ہوئی ہے" میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں مجھے اچھی طرح اندازہ ہے، آؤ تمہیں بیڈ روم دکھاؤں"۔

بیڈ روم ایک ڈبل بیڈ اور کپڑوں کی ایک الماری پر مشتمل تھا۔ دیواروں پر غالباً کلاڈ نے برش سے عریاں اور مضحکہ خیز جنسی اشاروں پر مشتمل تصویریں بنائی ہوئی تھیں، بستر کے عین اوپر ایک تختی آویزاں تھی۔ جس کی عبارت میری سمجھ سے بالا تھی۔ میں نے زولا سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس پر MINORS ARE NOT SERVED یعنی "ہم نابالغوں کی خدمت کرنے سے معذور ہیں" کے الفاظ درج ہیں، یہ تختی شراب خانوں میں نصب ہوتی ہے اور بیڈ روم میں اس کا استعمال واقعی نادر اور دلچسپ تھا۔ میں اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پا سکا۔



"تم بہت تھکے ہوئے ہو، لیٹ جاؤ، میں تمہاری کمر ملتی ہوں"۔

رات کے پچھلے پہر جاگتی خوشبوؤں نے بازوؤں کا حلقہ تنگ کیا اور کہا "تمہیں تو سخت نیند آ رہی تھی!" اس کے چہرے پر طلوع صبح کا حسن تھا اور آواز میں پہاڑی نالوں سے گزر کر میدان میں بہتے ہوئے پانیوں جیسا ٹھہراؤ اور ترنم تھا۔ میں نے ٹھنڈی کرنوں والے سورج کو بوسہ دیا اور پھر اس وقت آنکھ کھلی جب کمرے کی کھڑکیوں کے باہر پرانی عمارتوں کے کلسوں پر دھوپ چمک رہی تھی اور زولا میرے لئے باورچی خانے میں ناشتہ تیار کرنے میں مشغول تھی۔!

کلاڈ تمام رات باہر گزارنے کے بعد میرے جاگنے سے کچھ ہی دیر پہلے واپس پہنچا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے اور لگتا تھا کچھ دیر قبل زولا اور اس کے درمیان کچھ جھگڑا بھی ہوا ہے کیونکہ وہ دونوں آپس میں گفتگو نہیں کر رہے تھے، میرے لئے اس کا رویہ حیرت انگیز نہیں تھا کیونکہ دنیا بھر کے مردوں کا وطیرہ یہی ہے کہ وہ دوسری عورتوں کے ضمن میں تو "نیشنلائزیشن" کے قائل ہیں لیکن اپنے معاملات میں "نجی ملکیت" کے سختی سے قائل نظر آتے ہیں۔ سچی محبت کے لئے اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ لوگ محبت کے مکان کے وہ کرائے دار ہیں جو کرایہ بھی ادا نہیں کرتے اور مکان بھی خالی کرنے کا نام نہیں لیتے۔ کلاڈ بھی اسی ذہنیت کا مالک تھا۔ وہ شہر کے مقبول موسیقاروں کے ایک طائفے میں شامل تھا۔ جب کہ زولا دن کو کسی فرم میں سیکرٹری کے طور پر کام کرتی تھی اور شام کو کالج جاتی تھی، کالج میں اس کا آخری سال تھا۔ اسے موسیقی سے خاصا لگاؤ تھا اور وہ شروع شروع میں اس کی گٹار کی دھنوں پر ہی فریفتہ ہوئی تھی، بعد میں وہ ایک دوسرے کے خاصے قریب آ گئے اور اب ایک عرصہ سے کلاڈ کے متذکرہ رویئے کے سبب دونوں کے تعلقات خاصے کشیدہ تھے۔ یہ لڑکیاں بھی خوب ہوتی ہیں۔ بقول شفیق الرحمان انہیں چہرے کا ایک تل پسند آتا ہے، لیکن رشتہ سالم مرد سے جوڑ بیٹھتی ہیں۔ بہر

حالانکہ کلاڈ اس وقت سونے کے موڈ میں تھا کیونکہ آج فرائی ڈے نائٹ تھی اور اسے رات بھر کلب میں گٹار کی دھنیں بکھیرنا تھیں۔ زولا آج دفتر اور کالج سے ناغہ کرنا چاہتی تھی، لیکن میں نے اسے منع کر دیا...... تھوڑی دیر بعد زولا تیار ہو کر میرے سامنے کھڑی تھی۔

وہ غالباً دفتر سے خاصی لیٹ تھی کیونکہ بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پھول کی طرح ترو تازہ تھا۔ میں نے رات کو سورج نکلتے دیکھا تھا اور اب دن کو چاند طلوع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ تاہم آج اس کے شانوں پر ریشم کی طرح ملائم بالوں کی گھٹائیں نظر آ رہی تھیں، کیونکہ اس نے سنہری وگ پہنی ہوئی تھی۔ وہ میرے سامنے آن کر کھڑی ہو گئی اور تحسین طلب نظروں سے دیکھنے لگی

"سینٹ لوئیس میں ایک بوڑھی کیتھولک عورت نے مجھے بتایا تھا کہ قیامت عنقریب آنے والی ہے اور وہ ٹھیک کہتی تھی کیونکہ اس وقت وہ میرے سامنے کھڑی ہے!"

"سچ"؟ اس کے چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"ہاں۔ اور یہ کہ تمہاری وگ بہت خوبصورت ہے، لیکن تمہاری اصل زلفیں اس سے کہیں زیادہ دلکش ہیں"!

"لیکن دفتر میں تو سبھی لوگ کہتے ہیں کہ تم اس وگ میں بہت خوبصورت لگتی ہو، میں نے تو آج خاص تمہارے لئے پہنی تھی"۔

"مجھے پھولوں کی پینٹنگ سے زیادہ اصل پھول پسند ہیں!"

زولا یہ سن کر اپنے کمرے کی طرف مڑی اور کچھ دیر بعد وہ دوبارہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اب کے سنہری وگ کی بجائے اس کے شانوں پر ریشمی زلفیں لہرا رہی تھیں۔

"تم نے وگ کیوں اتار دی، میرا مطلب یہ تو نہیں تھا!"

"مجھے تمہاری پسند اپنی پسند سے زیادہ عزیز ہے" زولا نے میرے قریب آ کر محبت بھرے لہجے میں کہا اور پھر "الوداع" کہہ کے دروازے کی طرف مڑی۔ دروازہ کھولتے



ہوئے اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا "میری عدم موجودگی میں اگر کوئی عورت آئے تو تمہیں میزبانی کے فرائض انجام دینے کی ضرورت نہیں، کلاڈ کو جگا دینا" اور اس کے ساتھ ہی وہ باہر نکل گئی۔!

# سیرِ گلستان

میں نے نہادھو کر کپڑے تبدیل کیے اور بھولے کو ٹیلی فون کرنے لگا، خدا جانے مجھے یہ شخص اپنے چھوٹے بھائیوں جیسا کیوں لگنے لگا تھا۔ مجھے اس خیال سے تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ اجنبی گھر میں اکیلا کسی کونے میں پڑا ہوگا اور اس کے لئے پیرس ایک ان دیکھا خواب ہی رہے گا۔ دوسری طرف سے جو آواز ابھری وہ کسی پاکستانی ہی کی تھی۔ ”اوئے بھولے، تیرا ٹیلی فون ای“ اور پھر بھولے نے ریسیور تھام لیا۔ وہ میرے ٹیلی فون کرنے پر بہت خوش نظر آ رہا تھا، اور اس کے ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ غالباً پہلی بار کسی سے ٹیلیفون پر مخاطب ہے۔ کیونکہ وہ اتنی زور سے بول رہا تھا کہ ریسیور ایک فاصلے پر رکھ کر بھی اس کی آواز بخوبی سنائی دیتی تھی۔ اس پر میں نے مذاق سے اسے کہا۔ ”بھولے اگر تم ٹیلی فون بند کر کے بات کرو تو بھی تمہاری آواز مجھے صاف سنائی دے گی“۔ اس نے میری بات کو سچ جانا اور دوسری طرف سے حیرت بھرے لہجے میں بولا ”سچ بھاجی“۔ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ کہیں سچ مچ ٹیلی فون بند ہی نہ کر دے۔ چنانچہ میں نے جلدی سے کہا۔

”ارے نہیں نہیں، تم یہ کہو کتنی جلدی تیار ہو جاؤ گے ہم ذرا گھومنے پھرنے چلیں گے“۔

”میں تو جی صبح کا تیار بیٹھا ہوں، آپ حکم کریں“۔

”جس سٹیشن پر ہم اترے تھے تمہارا گھر اس کے بہت قریب ہے یا دور ہے؟“

”اس کے بہت قریب ہے اور مجھے سٹیشن کا راستہ آتا ہے“!

”تو پھر تم فوراً وہاں پہنچ جاؤ اور سیڑھیوں کے قریب میرا انتظار کرو“ اور پھر میں ٹیلی



فون بند کر کے بیڈروم کی طرف ہو لیا۔ جہاں کلاڈ بھینسے کی طرح پڑا ڈکرا رہا تھا۔ میں اس کے قریب گیا اور بازو سے ہلاتے ہوئے کہا ”میں باہر جا رہا ہوں، دروازہ اندر سے بند کر لو“۔ اور اس کے ساتھ ہی میں باہر نکل گیا۔ سٹیشن کی سیڑھیوں پر بھولا میرا منتظر تھا۔ اس نے تنگ مہری کی پتلون، چونچ دار جوتے، بوسکی کی قمیض اور اس پر ازار بند جیسی ایک ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ بالوں کا سٹائل وہی تھا جو دلیپ کمار اور اندرون لاہور کے بیشتر نوجوانوں کا ہے۔ میں نے اسے یوں بنا ٹھنا پایا تو کہا ”بھولے آج تو بڑی ”ٹوریں“ نکالی ہوئی ہیں“۔ وہ خوش ہوا، اور شرمایا۔ میرا پروگرام سب سے پہلے آئفل ٹاور جانے کا تھا، سو میں نے اسے ساتھ لیا اور آئفل ٹاور جانے کے لئے بس سٹاپ کا کھوج لگانے لگا۔ اسٹیشن کے باہر خاصی گہما گہمی تھی، اور ذرا آگے چل کر کئی سڑکیں ایک دوسرے کو کراس کرتی تھیں۔ میں نے دو ایک راہگیروں کو روک کر معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی، لیکن سب نے انگریزی سمجھنے سے صاف انکار کر دیا۔ سورج کی کرنوں میں بڑی تیزی تھی اور مجھے اپنے گرمیوں کے ہلکے پھلکے لباس میں بھی خاصی گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اتنی دیر میں میں نے ایک تیز تیز چلتے فرانسیسی نوجوان کو ”موسیو“ کہہ کر روکا اور اس سے آئفل ٹاور جانے والی بس کے بارے میں پوچھا، وہ بھی ”نہ“ میں سر ہلا کر آگے بڑھنے ہی کو تھا کہ میں اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ (آخر صبر کی بھی حد ہوتی ہے)

”آئفل ٹاور“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ بس کی نقل و حرکت کا تھوڑا بہت عملی مظاہرہ کر کے بس کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے اپنی طرف سے بات سمجھا دی تھی کہ آئفل ٹاور جانے والی بس کہاں سے ملتی ہے؟ لیکن اس غبی شخص نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلایا۔ اس پر میں نے ایک ہاتھ کو بہت نیچا اور دوسرے ہاتھ کو فضا میں بہت اونچا لے جاتے ہوئے آئفل ٹاور کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی کہ پہلے یہ مسئلہ حل ہو جائے، بس کا بعد میں پوچھ لیں گے۔ جواب میں اس نے ایک بار

پھر گردن ہلائی کیونکہ اس نے میرے ہاتھوں کے اشارے سے اندازہ لگایا ہوگا کہ یہ شخص آئفل ٹاور کے بارے میں یقیناً نہیں پوچھ رہا۔ کیونکہ اس ٹاور کی لمبائی دو تین گز ہرگز نہیں ہے۔ جب عدم ابلاغ کی انتہا ہو گئی تو میں نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور پنسل سے آئفل ٹاور کی تصویر بنائی۔ سکول میں ڈرائنگ کے پیریڈ کے دوران میرا تمام وقت بنچ پر کھڑے گزرتا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ بہر حال نہیں تھا کہ آئفل ٹاور کی تصویر کشی کرتے ہوئے میں اپنے مخاطب کو اس قدر ناراض کرلوں گا کہ وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا آگے چل پڑے گا" بہر حال آئفل ٹاور تک پہنچنے کا یہ مرحلہ کسی نہ کسی طور طے ہو گیا۔ بعد میں زولا نے یہ واقعہ سننے کے دوران ہنستے ہوئے بتایا کہ فرانسیسی میں آئفل ٹاور کے لئے کوئی اور لفظ ہے۔ بہر حال بس سے اترنے کے بعد سڑک عبور کر کے ہم ایک بہت بڑے پارک میں آ گئے، جس کے درمیان میں آئفل ٹاور آسمان کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ ذرا پرے دریائے سین بہہ رہا تھا۔ پیرس کا یہ علاقہ اور میلوں دور تک پھیلی ہوئی سڑکیں اور عمارتیں اس پیرس کا نقشہ پیش کر رہی تھیں جو اپنے حسن اور زیبائی میں بے مثال ہے۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں واقعی پیرس میں ہوں۔ آئفل ٹاور کی "زیارت" کرنے والوں میں زیادہ تعداد غیر ملکی سیاحوں کی تھی۔ البتہ ذرا ذرا فاصلے پر پڑے بنچوں پر بوڑھے فرانسیسی اپنی اپنی "میڈموزیل" کے ساتھ ماضی کی یادوں میں گم سم بیٹھے تھے، میں نے سوچا کہ یہ لوگ عنفوان شباب میں:

عجب کچھ لطف دیتا ہے شب خلوت میں دلبر سوں
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ!

کی عملی تفسیریں پیش کرتے ہوں گے۔ لیکن اب کم سنائی دینے کی بناء پر شب خلوت میں انہیں لاؤڈ سپیکروں پر رومانی گفتگو کرنا پڑتی ہو گی۔ بلکہ اس امر کا زیادہ امکان ہے کہ رومانی گفتگو کی بجائے یہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہوں کہ تمہاری گنٹھیا کی تکلیف کا کیا



حال ہے اور وہ جواب میں کہے کہ بحمد اللہ، پہلے سے خاصا افاقہ ہے۔ پارک کے درمیانی حصے میں کچھ کیاریاں بنی تھیں اور اس میں شوخ رنگوں کے پھول ایک خاص ترتیب سے لگے تھے۔ جس سے یہ مقام انتہائی نظر نواز ہو گیا تھا۔ گراؤنڈ میں ریڑھیوں پر اشیائے خوردنی فروخت کی جا رہی تھیں، لیکن یہ ہمارے ہاں کی ریڑھیوں جیسی نہیں تھیں بلکہ انہیں "چیزے دیگر است" ہی کہا جا سکتا ہے۔ بھولا کچھ کھویا کھویا سا لگ رہا تھا، اس کے قریب سے قیامتیں گزر رہی تھیں مگر یہ ان سے بے نیاز کسی اور طرف دیکھنے میں مشغول تھا۔ میں نے مڑ کر ادھر دیکھا تو ایک خوبرو لڑکا نیکر میں ملبوس اپنے ساتھی کے ساتھ کھیل رہا تھا اور بھولے کی نظریں اس کی ٹانگوں پر تھیں۔

"بھولے ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

بھولے کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہوئے، جیسے میں نے بالآخر اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ چنانچہ اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا "کچھ نہیں بھاجی، بس یونہی اس لڑکے کو دیکھ رہا تھا"۔

مجھے اس کے مسئلہ کی کچھ کچھ سمجھ...... آ گئی تھی۔ میں نے جنگلے کے ساتھ بچھے بنچ پر اسے بیٹھنے کو کہا۔ گرمی کی شدت میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا، چنانچہ میں نے اون کی جیکٹ اتار کر جنگلے پر رکھ دی۔ "بھولے تم نے کبھی کسی لڑکی سے محبت کی ہے؟"

"توبہ استغفراللہ بھاجی، میں ایسا آدمی نہیں ہوں" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں؟" میں نے پوچھا۔

"زہر لگتی ہیں جی، پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہیں۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو بس ایک گڈو تھی جو مجھے اچھی لگتی تھی۔ حالانکہ وہ مجھ سے خاصی بڑی تھی۔ گرمیوں میں وہ اپنے کوٹھے پر سے اشارے کر کے مجھے بلایا کرتی تھی اور مجھے سیڑھیوں میں بھی ملتی تھی

لیکن کچھ عرصے بعد وہ حرامزادی رفیق ٹیڈی کے ساتھ بھاگ گئی"۔ وہ کچھ اداس اداس سا نظر آنے لگا۔

"تو کیا تم نے پھر کسی سے پیار نہیں کیا؟"

"وہ تو بہت سوں سے کیا ہے جی" اس نے شرماتے ہوئے رک رک کر کہا۔

"ہمارے محلے میں ایک لڑکا بابر ہے، اس سے، نوید سے، ایک لڑکا منیر ہے اس سے بھی، بلکہ ایک بار تو میں پکڑا بھی گیا تھا"۔ بھولا آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں "لاحول ولا قوۃ" پڑھا اور سوچا کہ اس نے ٹرین میں "بہنوں، بیٹیوں کی عزت سانجھی ہوتی ہے" والی بات خاصی سوچ سمجھ کر کہی تھی۔ اس دوران بھولے نے باتیں کرتے کرتے اچانک گردن اکڑا لی اور یوں پوز بنا کر بیٹھ گیا جیسے تصویر بنا رہا ہو۔ میں نے سامنے کی طرف دیکھا تو ایک فوٹوگرافر اپنا پولورائڈ کیمرہ درست کر رہا تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ بٹن دباتا اور پھر گردن پر گھٹنا رکھ کر ہم سے اس کے پیسے وصول کرتا، میں نے بھولے کو صورت حال سمجھا کر اٹھنے کے لئے کہا اور پھر ہم آئفل ٹاور کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ فوٹوگرافر نے فن کی اس بے قدری پر برا سا منایا اور پھر اپنے فن کے مظاہرہ کے لئے کوئی مناسب سے افراد تلاش کرنے لگا...... میرے سامنے مختلف ملکوں کے انسان ایک جیسے تحیراتی جوش و خروش کے ساتھ آئفل ٹاور کو دیکھنے میں مشغول تھے۔ یہ ٹاور اٹھتر لاکھ فرانک سے تعمیر شدہ ہے اور 984 فٹ اونچا ہے۔ سٹیل کے اس بلند و بالا مینار میں لفٹ کے ذریعے لوگ اوپر جاتے ہیں جہاں ایک عمدہ سا ریستوران بھی ہے۔ یہاں سے پیرس کا نظارہ بہت دلفریب ہے۔ بلکہ اس کے نیچے کھڑے ہو کر دیکھنے سے یہ جتنا بلند و بالا لگتا ہے اس سے تو یہ گمان گزرتا ہے کہ انسان اوپر جا کر خدا کی شان کا نظارہ کرنے کے علاوہ خدا کا قرب بھی حاصل کر لیتا ہے۔ تاہم میرا ارادہ اوپر جانے کا نہیں تھا۔ سو نیچے کھڑے کھڑے ایک نظر سیاہ رنگ کی اس پُر جلال تخلیق پر ڈالی اور ٹہلتے ٹہلتے دریائے سین



کی طرف نکل گیا۔ جہاں سیاحوں کے لئے سجے سجائے اسٹیمر تیار کھڑے تھے۔ مگر ہم کبھی ٹیکسی پر اور کبھی پیدل پیرس کی سڑکیں ماپتے رہے۔ چلتے چلتے ہم کلیسائے نوٹراڈیم کی طرف نکل گئے۔ عظیم میناروں، ہیبت ناک مجسموں والی اس عمارت میں گھڑیال پر نظر پڑتے ہی مجھے وکٹر ہیوگو کے ناول پر مبنی فلم "ہنچ بیک آف ناٹراڈیم" یاد آ گئی!

"بھولے، تم نے کبڑا عاشق فلم دیکھی ہے؟" میں نے بھولے سے پوچھا جو اس وقت خلاء میں نظریں جمائے نجانے کیا سوچ رہا تھا۔

"ہاں جی، میں تو پورے سات مرتبہ یہ فلم دیکھنے گیا تھا"۔

"وہ سامنے بڑا سا گھڑیال دیکھ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی، کیا ہے اس میں؟"

"وہ کبڑا عاشق فلم میں یہی گھڑیال بجاتا تھا!"

"اچھا جی" بھولے نے حیرت اور مسرت سے کہا اور پھر وہ پوری توجہ سے اس جانب دیکھنے لگا! چلتے چلتے پاؤں دکھنے لگے تھے اور بھوک بھی محسوس ہونے لگی تھی، سو ہم ادھر سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور ایک ریستوران میں دو ہاتھ لمبی ڈبل روٹی پنیر کے ٹکڑوں اور دودھ کے گلاس سے بھوک مٹانے کے بعد ایک بار پھر سڑک پیمائی کرنے لگے۔ سہ پہر تک ہم لوگ آئفل ٹاور اور ناٹرا ڈیم کے علاوہ دریائے سین کے پار نپولین کا انولیہ، لودھر کا عجائب گھر، اس کے ایک حصے میں مونالیزا کی مشہور زمانہ تصویر، ہرکولیس کا مجسمہ اور نوٹراڈیم کے پہلو میں پھولوں کے بازار کے علاوہ مومارت کے علاقے کی ان گلیوں میں بھی گھوم آئے تھے، جنہیں دیکھ کر وطن عزیز کے گلی کوچے یاد آتے ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے "پگال" سے کچھ مزید ڈالر فرانسیسی سکے فرینک میں تبدیل کرائے تھے۔ بھولے کو میں نے رخصت کر دیا تھا اور اب میں ایک بار پھر "بازار ڈی ہوٹل ڈی ویل" کی طرف گامزن تھا۔ میں جانتا تھا زولا دفتر سے آ چکی ہوگی اور میری منتظر ہوگی۔

# رنگ میں بھنگ!

فلیٹ میں داخل ہوتے ہی میری نظر کلاڈ پر پڑی جو خاصی بے خودی کے عالم میں گٹار کے تار جھنجھوڑنے میں مشغول تھا، غالباً وہ ریاض کر رہا تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر گٹار سے دست و گریباں ہو گیا۔ میری نظریں زولا کو ڈھونڈ رہی تھیں اور میرے ہاتھوں میں وہ گلدستہ تھا جو میں نے نوٹرا ڈیم کے برابر میں واقع پھولوں کے بازار سے ستر فرانک میں خریدا تھا۔ میں نے پھول میز پر رکھے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے کلاڈ کو با آواز بلند اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کی۔ اس فرانسیسی تان سین نے ایک لمحے کے لئے سر اوپر اٹھایا جیسے کہہ رہا ہو کہ کیوں اس فنکار کو مکروہات دنیا میں الجھا رہے ہو، میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے زولا کے بارے میں پوچھا۔ اس نے انگلی کے اشارے سے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا اور ایک بار پھر گٹار کے تاروں میں "مقامات آہ و فغاں" تلاش کرنے لگا۔ میں نے بیڈ روم کا دروازہ رسماً نوک KNOCK کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ زولا آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ میرے دروازہ بند کرنے سے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی خوابناک آنکھیں پہلے سے زیادہ "ضرر رساں" ہو گئی تھیں۔ میں اس کے برابر میں پائنتی پر بیٹھ گیا۔ مگر اس نے میری طرف توجہ نہ دی۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار تھے۔ "تم بہت غلط انسان ہو، میں دو گھنٹے سے تمہارے انتظار میں اونگھ رہی ہوں، مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم مجھے کوئی اہمیت نہیں دیتے!"

"ایسی کوئی بات نہیں" میں نے بات بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "رستوں



سے ناواقفیت کی بنا پر دیر ہو گئی، ورنہ میں تو کب کا تمہارے پاس آنے کے لئے بے چین تھا"۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گلدستہ اس کی طرف بڑھایا اور کہا۔ "یہ میرے ان احساسات کی گواہی دینے کے لئے ہیں جو میں تمہارے لئے رکھتا ہوں"۔

"میرے ہاتھوں میں پھول دیکھ کر زولا ایک دم سب کچھ بھول گئی اور اس نے آگے بڑھ کر وہ گلدستہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ مغربی لڑکیاں غالباً اس تحفے کو سب سے قیمتی گردانتی ہیں اور اس صورت میں خصوصاً جب پیش کنندہ کے لئے ان کے دل میں خاص جگہ بھی ہو" میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں تمہیں نہیں سمجھ سکی۔ کبھی تم بالکل بے پروا نظر آتے ہو اور کبھی یوں لگتا ہے، جیسے تمہیں مجھ سے میری ہی جتنی محبت ہے"۔ زولا نے چارپائی سے اتر کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اس نے پھول بڑی احتیاط سے سرہانے کی طرف رکھ دیئے تھے اور اب آیئنے میں بال سنوارنے میں مشغول تھی۔

"میں وہی کچھ ہوں، جو نظر آتا ہوں، میرے پاس صرف ایک چہرہ ہے اور منہ میں صرف ایک زبان ہے۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو"۔

"اچھی تو میں تمہیں اس وقت بھی لگی تھی جب جہاز میں پہلی دفعہ تم سے ملاقات ہوئی تھی اس وقت سے اب تک اسی مرحلے میں ہو"۔ زولا نے میری طرف مڑ کر کچھ ایسی نظروں سے دیکھا گویا وہ اس ضمن میں پوری سنجیدگی سے میرے جواب کی منتظر ہو۔

"اب تم مجھے اور زیادہ اچھی لگتی ہو"۔ میں نے ایک بار پھر وہی کہا جو میں سچ مچ محسوس کرتا تھا۔ میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ میں اپنے عاشق زار ہونے کا اعلان کروں۔

"میریلین تمہیں کیسی لگی تھی؟" زولا نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے افسردہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ کانٹا ابھی تک اس کے سینے میں تھا اور اب اس سوال کی کسک میں بھی اپنے سینے میں محسوس کر رہا تھا۔

"میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں" میں نے زولا سے نظریں چراتے ہوئے

جواب دیا"۔ وہ فریڈرک سے محبت کرتی ہے اور میں زندگی میں اس کی خوشیوں کے لئے دعا گو ہوں"۔ میری نظروں میں ایک بار پھر میریلین کی من موہنی صورت گھوم گئی تھی۔

"تم یہ کیوں نہیں مانتے کہ تم اس پر مرمٹے تھے؟" زولا نے ایک بار پھر میری دلی کیفیت بھانپ کر وہ بات کہی جس کا اظہار دو بار پہلے ذرا مختلف انداز میں کر چکی تھی۔

"یہ تم کیا ہر بار اس کا قصہ لے کر بیٹھ جاتی ہو؟" میں نے گفتگو کا رخ موڑنے کے لئے خوشدلی سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "آؤ دوسرے کمرے میں چلتے ہیں!"

دوسرے کمرے میں کلاڈ ابھی تک گٹار سے خوش فعلیوں میں مشغول تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو ناگواری سے منہ بنا کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"میں محسوس کرتا ہوں میں نے یہاں آکر کچھ اچھا نہیں کیا!" میں نے زمین پر بچھے رگ RUG پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟" زولا نے میرے برابر میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے کلاڈ کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت نظر آتی ہے"۔

"تمہیں اس بارے میں متفکر نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور نہ اسے مجھ سے محبت ہے، ہم محض دوست ہیں اور کچھ عرصے سے دوست بھی اتنے اچھے نہیں ہیں"۔

"اگر ایسا ہے تو پھر وہ مجھے آدم خوروں جیسی LOOKS کیوں دیتا ہے؟"

"وہ سامراجی ذہنیت کا انسان ہے" زولا نے اس گفتگو کے دوران پہلی بار خوشگوار لہجے میں کہا "اپنی ایک نو آبادی کو ہاتھ سے جاتے دیکھ نہیں سکتا"۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میری طرف دیکھا اور کہا "کیا پاکستانی مرد بھی ایسے ہی ہوتے ہیں؟"

"ہاں، بلکہ دنیا بھر کے مرد اسی فہرست میں آتے ہیں"۔



"کیا تم بھی ایسے ہی ہو؟"

"ہاں، میں بھی ایسا ہی ہوں لیکن خاصا معتدل مزاج سامراجی ہوں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری نظروں کے سامنے "آزادی" کی تحریکیں نہ چلیں، انڈر گراؤنڈ سرگرمیوں پر مجھے کوئی اعتراض نہیں، مبتلائے محبت ہو جاؤں تو دوسری بات ہے کیونکہ اس صورت میں اپنی اور اس کی تمام آزادیاں داؤ پر لگا دیتا ہوں"۔

"تم کبھی مبتلائے محبت ہوئے بھی ہو؟" زولا نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"بھولے بسرے قصے نہیں چھیڑا کرتے، یونہی دل بیٹھنے لگتا ہے" میں نے اس تکلیف دہ سوال سے پیدا ہونے والی کیفیت پر پردہ ڈالنے کے لئے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم یہ بتاؤ آج شام کا کیا پروگرام ہے"؟

"تم نے آئس لینڈ میں مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ تمہیں سارا پیرس گھماؤں گی، لیکن یہ کام تم اکیلے ہی انجام دے آئے ہو۔ بہر حال آج فرائی ڈے نائٹ ہے، پہلے باہر جا کر کھانا کھائیں گے، پھر شانزالیزے پر چہل قدمی کریں گے اور پھر رات کو کسی کلب میں ڈانس کے لئے جائیں گے؟"

"بالکل ٹھیک ہے" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اب جلدی سے تیار ہو جاؤ" میں نے آج کی شب کے لئے سیاحوں والا لباس اتارا اور ایک قیمتی سوٹ میں ملبوس زولا کا انتظار کرنے لگا۔ زولا اپنے کمرے میں تیاریوں میں مصروف تھی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور پھر اسے دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ زولا نے انتہائی خوبصورت ایک کڑھی ہوئی پاکستانی قمیض پہنی ہوئی تھی، نیچے بل باٹم تھا اور وہ یوں میرے سامنے لجائی شرمائی کھڑی تھی کہ یادوں کے دریچے ایک بار پھر وا ہو گئے۔

"میں یہ آج ہی ہندوستانی سٹور سے خرید کر لائی ہوں، میں اس میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

"تم۔ تم اس میں قیامت لگ رہی ہو" مجھے اس پر یہ لباس اور اس کی یہ ادا اس قدر بھائی کہ میں اندر سے ڈانواڈول ہو گیا "کیا تم چاہتی ہو کہ میں یہاں ہی رہ جاؤں؟"

زولا کے چہرے پر مسرت کے آثار نمایاں ہوئے اور میرے قریب آ گئی۔ کچھ دیر کے لئے مجھے صرف ناک سے سانس لینا پڑا۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، زولا نے بڑھ کر ریسیور اٹھایا اور فرانسیسی زبان میں گفتگو کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی پیشانی پر پریشانی کی لکیریں ابھریں اور پھر وہ جھنجھلاہٹ کے عالم میں کچھ کہنے لگی۔ میں ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا کیونکہ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ اتنے میں زولا نے ٹیلی فون بند کیا اور اضطراب کے عالم میں پرس میں سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگی۔

"کیا بات ہے، تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو" میں نے پوچھا۔

"اولڈ پیپلز ہوم کی منیجر کا فون آیا تھا، اس نے بتایا ہے کہ میری ماں وہاں بہت بے چین ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی وہاں رہنا نہیں چاہتی۔ چنانچہ اب وہ اپنا سامان باندھ کر بیٹھی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے آ کر لے جاؤ"۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے کہا ہے کہ اسے روک کر رکھو۔ میں پھر کسی دن آ کر اس سے بات کروں گی"۔

"مجھے تمہارے معاملات میں دخل اندازی کا کوئی حق تو نہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا"۔ میں یہ سن کر واقعی ملول ہو گیا تھا اور اس کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔

"عطا تم نہیں جانتے، اس کا یہاں آنا اس کے حق میں بہتر نہیں ہے۔ وہاں اس کی ہر طرح نگہداشت ہوتی ہے، یہاں میں صبح کو کام پر جاتی ہوں اور شام کو مجھے کالج جانا ہوتا ہے، اس دوران اس کی دیکھ بھال کون کرے گا، اور پھر اس گھر میں زیادہ آدمیوں کی



گنجائش بھی تو نہیں ہے"۔

"کیا وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یوں دیکھنے میں تو وہ ٹھیک ٹھاک ہے، لیکن بوڑھے آدمی کا کیا اعتبار ہوتا ہے کسی وقت بھی بیمار پڑ سکتا ہے"۔

"تو کیا تمہارے ہاں سبھی لوگ اپنے بوڑھے والدین کو اسی طرح اولڈ پیپلز ہوم میں جمع کرا دیتے ہیں؟"

"ہاں...... اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں"۔

"میں تمہیں اگر ایک بات کہوں تو مانو گی؟" میں نے زولا سے پوچھا۔

"ہاں" اس کی آنکھوں میں خود سپردگی کی کیفیت ابھر آئی۔

"ہم آج کچھ وقت پیپلز ہوم میں تمہاری ماں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ تم اسے اپنی مجبوری سمجھانے کی کوشش کرو، نیز اسے تسلی وغیرہ بھی دو۔ ممکن ہے اس کا دل بہل جائے"۔

"اگر تم کہتے ہو تو ایسا کیے لیتے ہیں، ورنہ ماں کو سمجھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔" زولا نے بادل نخواستہ کہا۔ اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار تھے اور لگتا تھا بنا بنایا پروگرام خراب ہونے پر وہ خاصی ناخوش ہے۔

# اولڈ پیپلز ہوم میں!

شہر سے تیس پینتیس میل دور اولڈ پیپلز ہوم کی جدید طرز کی عمارت ایک سرسبز ٹیلے پر واقع تھی۔ جس وقت ہم قصبے میں داخل ہوئے شام ہو چکی تھی اور چھوٹے چھوٹے ڈھلوان چھتوں والے گھروں میں بتیاں روشن ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اولڈ پیپلز ہوم کے بڑے دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب معلومات کے کاؤنٹر پر ایک خوشنما لڑکی رجسٹر پر جھکی کام میں مشغول تھی، اس نے زولا کا استقبال مسکراہٹ کے ساتھ کیا اور پھر اس کے استفسار پر سامنے کی طرف اشارہ کر کے دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ برآمدے میں مکمل سناٹا تھا اور ہمارے پاؤں کی چاپ ایک عجیب ڈراؤنی سی صدا پیدا کر رہی تھی، یہاں تھوڑی دور چلنے کے بعد زولا نے ایک جگہ رک کر دائیں جانب پر واقع ایک دروازہ کھولا اور پھر ہم ایک بڑے ہال میں تھے۔

یہاں بے شمار بوڑھے ٹولیوں میں بکھرے مختلف قسم کی تفریحی سرگرمیوں میں مشغول تھے، بعض ایک کیرم بورڈ کھیلنے میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ بوڑھے ہاتھوں میں تاش کے پتے لئے بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں ایک ستر سالہ بوڑھا اپنی ہم عمر "گرل فرینڈ" کے ساتھ خاصے استغراق کے عالم میں محو گفتگو تھا۔ ہال میں ہمارے داخل ہوتے ہی سب کی نگاہیں ایک دم ہماری طرف اٹھ گئیں اور بیک وقت "ہے" "HAY" کی تحیر آمیز اور تحسین افروز آواز مختلف کونوں سے گونجی کیونکہ زولا جس لباس میں ملبوس تھی، ایک تو وہ ان سب کے لئے اجنبی تھا اور دوسرے وہ اس میں انتہائی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ ادھر میں



بھی چہرے مہرے سے غیر ملکی لگ رہا تھا۔ وہ غالباً سبھی زولا سے متعارف تھے کیونکہ زولا اور ان کے مابین ہیلو ہیلو کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ زولا کی نگاہیں اپنی ماں کو ڈھونڈ رہی تھیں اور پھر وہ ہال کے سب سے آخر میں ایک ریلیکسنگ چیئر پر رک گئی، جہاں اس کی ماں آنکھیں بند کئے نیم دراز تھی۔ زولا اس کے سرہانے کی طرف گئی اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی ماں نے آنکھیں کھولیں اور پھر زولا کو سامنے پا کر ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور زولا کو چمٹا کر چٹاخ پٹاخ گالوں پر بوسے لینے لگی۔ گو اس کے چہرے پر جھریاں بڑی نمایاں تھیں لیکن جہاں نین نقش یہ بتا رہے تھے کہ وہ جوانی میں زولا سے دو قدم آگے ہو گی، وہ جسمانی طور پر بھی اپنی عمر کے لحاظ سے خاصی صحت مند لگتی تھی۔ اس نے زولا کو دونوں بازوؤں سے تھاما ہوا تھا اور بڑے انہماک سے اس کے لباس کا جائزہ لینے میں مشغول تھی، یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں صدقے واری ہوتی جا رہی ہو۔ وہ ابھی تک میری موجودگی سے بے خبر تھی۔ زولا نے اس دوران غالباً اسے میرے بارے میں بتایا، کیونکہ اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر کرسی سے اٹھ کر میرے برابر آ گئی۔ میں نے اسے ہیلو کہا اور اس نے آگے بڑھ کر میری پیشانی کا بوسہ لے لیا۔

جب ہم ہال میں داخل ہوئے تھے اس وقت اس کے چہرے پر مردنی چھائی تھی، لیکن اب وہ ہم دونوں کو دیکھ کر یوں خوش ہو رہی تھی جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو، اس نے فرانسیسی میں زولا سے کچھ کہا اور زولا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس پر میں نے زولا کی جانب استفسار آمیز نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا "جانتے ہو ماں کیا کہہ رہی ہے؟"

"کیا؟" میں نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ پوچھتی ہے کہ تم دونوں نے شادی کر لی ہے یا عنقریب کرنے والے ہو؟"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے اسے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں، مگر اسے یقین نہیں آیا"۔

"تم میری طرف سے ماں سے پوچھو کہ اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟" میں نے گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی میں برابر میں موجود ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ زولا ماں کے پاس کھڑی رہی اور پھر وہ دونوں گفتگو میں محو ہو گئیں، دس پندرہ منٹ کی گفتگو کے بعد زولا کے چہرے سے یوں لگا جیسے اس کے دماغ پر سے کوئی بڑا بوجھ اتر گیا ہو اور اب وہ ہلکی پھلکی محسوس ہو رہی ہو۔ اس نے بتایا کہ ماں واپس گھر جانے پر بری طرح بضد تھی، مگر میرے سمجھانے پر اور تمہاری پیرس میں موجودگی کی وجہ سے وہ بمشکل اس امر پر راضی ہوئی ہے کہ وہ یہاں کچھ دن اور قیام کرے گی۔ میں نے اسے جھوٹ موٹ دلاسا دیا ہے کہ میں اگلے ہفتے اسے یہاں سے لے جاؤں گی۔ وہ کہتی ہے میں تمہارے فلیٹ کے سٹور روم میں پڑی رہوں گی اور نہ صرف یہ کہ تمہارے پروگراموں میں مخل نہیں ہوں گی بلکہ تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے لئے کھانا بھی پکا کر رکھوں گی اور بازار سے سودا سلف بھی لایا کروں گی"۔

"وہ اور کیا کہتی تھی؟" میں نے بجھے دل سے پوچھا۔

"وہ میرے بڑے بھائی کی شکایت کر رہی تھی کہ اس نے دو سال سے اپنی شکل نہیں دکھائی اور نہ وہ ایک عرصے سے اپنے پوتے پوتیوں کو دیکھ سکی ہے۔ ماں کو ان سے بے حد پیار ہے لیکن وہ بھی مجبور ہے، وہ پیرس سے سینکڑوں میل دور رہتا ہے اور مصروف بھی بہت ہے"۔

اتنی دیر میں زولا کی ماں کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس عمر میں بھی اس کی کاٹھی خاصی مضبوط لگتی تھی۔ اس نے اپنے جھریوں بھرے چہرے پر پاؤڈر کی تہیں جمائی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر سرخی کی تہہ تھی۔ وہ غالباً ہمیں اپنے ساتھیوں سے ملانا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے ہمیں ساتھ لیا اور ہم ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے بوڑھے بوڑھیوں کے درمیان جا کر بیٹھ گئے۔



میں نہیں جانتا میرا تعارف اس نے کس حیثیت سے کرایا تھا۔ لیکن وہ سب مجھ سے بہت گرمجوشی سے ملے۔ میں ان کی زبان نہیں جانتا تھا اور وہ میری زبان سے ناآشنا تھے۔ سو پہلے چند لمحے ہم نے اشاروں کنایوں میں گفتگو کی اور یقیناً اس گفتگو کی اپنی ایک لذت ہوتی ہے۔ اتنے میں گیٹس والی پتلون پہنے اور موٹی موٹی سفید مونچھوں والے ایک بوڑھے نے اپنی زبان ہلائی۔

"میں تھوڑی بہت انگریزی جانتا ہوں۔ میں نے عمر کا ایک حصہ ملک سے باہر فوج میں گزارا ہے اور وہاں میں نے یہ زبان سیکھی تھی"۔

"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی"۔ میں یہ "حرف آشنا" سن کر بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھا اور دوسرے سرے پر بیٹھے ہوئے اس بوڑھے سے مصافحہ کے لئے میز پر قریباً لیٹ گیا، اس پر بیک وقت کئی کھانسی آلود قہقہے بلند ہوئے۔

"نوجوان تم مجھے انڈین لگتے ہو۔ کیا میں درست ہوں؟"

"میں پاکستانی ہوں" میں نے ایک ہم زبان کو پانے کی خوشی میں اس کی یہ خطا معاف کرتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب! تمہاری قوم یقیناً اعلیٰ ذوق کی حامل ہے، کیونکہ تم نے اپنے انتخاب میں بہت اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیا ہے" بوڑھے نے زولا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی ایک آنکھ میچ کر کہا۔

"لیکن میں فرانسیسیوں کے ذوق جمال کا قائل نہیں ہوں۔ ثبوت کے لئے اسی مثال کو الٹا دینا کافی ہے"۔

یہ سن کر زولا اور بوڑھا دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس پر باقی عوام الناس نے بے بسی کے عالم میں چند لمحے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ بھی ہنسنے لگے۔

"کیا تم لوگوں نے بھی بوڑھوں کے لئے اس طرح کے گھر بنائے ہوئے ہیں؟" بوڑھا

ہنستے ہنستے اچانک خاموش ہو گیا اور اس نے کھڑکی سے باہر نگاہیں جماتے ہوئے پوچھا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا اور بوڑھے درخت جھکی ہوئی ٹہنیوں کا بوجھ سنبھالے ایک دوسرے کے سامنے ساکت کھڑے تھے۔

"نہیں ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ وہ شروع سے آخر تک ہمارے درمیان رہتے ہیں اور ہم ان کی خدمت کرتے ہوئے راحت محسوس کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسا نہیں کرتے، لیکن معاشرے میں انہیں بہر حال اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا"۔

"تم یقیناً ہم سے زیادہ مہذب لوگ ہو"۔ بوڑھے نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"تو کیا آپ کے بچے آپ سے ملنے کے لئے نہیں آتے؟" میں نے پوچھا

"شروع شروع میں جب وہ ہمیں یہاں داخل کراتے ہیں تو ہر ویکنڈ پر ملنے کے لئے آتے ہیں، اس کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ گیپ ڈالنا شروع کر دیتے ہیں، اور پھر ایک مہینے کے بعد اپنی شکل دکھاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ عرصہ طویل ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر ان سے صرف کرسمس کے موقع پر ملاقات ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے کہ کرسمس پر ان کی بجائے ان کی طرف سے کرسمس کارڈ موصول ہوتا ہے اور پھر ایک دن اطلاع ملنے پر وہ میت وصول کرنے آجاتے ہیں، جس کی آنکھیں اپنے بیٹوں کے انتظار میں مرنے کے بعد بھی کھلی ہوتی ہیں"۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا کلیجہ مسل دیا ہو۔ میں یہ گفتگو آگے نہیں بڑھانا چاہتا تھا، لیکن بوڑھے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا

"ہمیں گو یہاں ہر طرح کی سہولت اور آسائشیں حاصل ہیں، لیکن ہم اپنے بچوں کی شکلیں دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ پہلے پالتو جانور رکھنے کی اجازت تھی، چنانچہ ہم لوگ بلیوں وغیرہ کو وہ محبت دے کر سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے، جو ہمارے دلوں میں اپنی اولاد کے لئے ہے، لیکن اب انتظامیہ نے پالتو جانور رکھنے پر پابندی عائد



کر دی ہے۔ چنانچہ اب کئی مائیں یہاں رات کو اپنے ساتھ گڈیوں کو تھپکیاں دے دے کر سلاتی ہیں۔ ہم تمہیں ہنستے کھیلتے دکھائی دیتے ہیں، جب کہ ہمارے قہقہے کھوکھلے ہیں اور ہمارے سینوں میں چیخیں رکی ہوئی ہیں۔ جب یہاں کسی کا کوئی ملاقاتی آتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے ہمارے چہروں پر رونق آجاتی ہے اور اس کے بعد ہم پھر غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں"۔

اس لمحے مجھے بوڑھے کی آنکھوں میں ویرانیاں تیرتی نظر آئیں۔ اس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "بیٹے اگر تم لوگ بھی صنعتی ترقی کے دور سے گزرو، تو اس کی نعمتوں سے ضرور بہرہ ور ہونا، لیکن اس کے لئے ان نعمتوں کی قربانی نہ دینا جن کا کوئی بدل نہیں"۔

میں نے زولا کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر ندامت کے آثار تھے اور بوڑھے کی بات نہ سمجھنے کے باوجود اس کے لہجے کے درد نے اس میز کے گرد بیٹھے ہوئے بوڑھوں کے چہروں کو حزن و ملال کی تصویر بنا دیا تھا اور اس کمرے کی فضا کو ایسے ویران قبرستان میں تبدیل کر دیا تھا جہاں ہوا کی سرسراہٹوں میں روحوں کے چلنے کا گمان ہوتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے اولڈ پیپلز ہوم میں موجود ان بوڑھوں کے مصروف بیٹوں نے کام نمٹانے کے لئے اپنے والدین کو مرنے سے قبل غسل دے دیا ہے۔ انہیں کفن پہنا دیئے ہیں اور اب انہیں تجہیز و تکفین کرنے والے ادارے کے سپرد کر کے مطمئن ہو گئے ہیں۔

میں نے زولا کا بازو پکڑا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔ اس کی ماں دروازے تک چھوڑنے آئی، اس کے چہرے پر بے بسی اور عاجزی تھی جو زولا کو بار بار یاد دلا رہی تھی کہ اگلے ہفتے یہاں سے اسے اپنے فلیٹ میں لے جانا نہ بھولے، وہ اس کے سٹور روم میں پڑی رہے گی، نہ صرف یہ کہ اس کے پروگراموں میں حائل نہیں ہو گی بلکہ اس کے لئے بازار سے سودا سلف بھی لایا کرے گی۔ وہ بھکاریوں کی طرح پیچھے پیچھے چلتی آرہی تھی، زولا نے بیزاری سے اس کی طرف دیکھا اور میرا بازو تھام کر باہر نکل آئی۔

# اوہ، مارے گئے...... کھڑک!

میونخ ریلوے اسٹیشن پر اترتے ہی میں نے حسب معمول ٹوٹی ہوئی مٹھ والے اٹیچی کیس کو بائیں کاندھے پر رکھا کہ گناہوں کی رپورٹنگ کرنے والے فرشتے سے حساب چکانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ بیگ گلے میں لٹکایا اور دائیں ہاتھ سے دوسرا اٹیچی اٹھانے ہی کو تھا کہ مٹھ میرے ہاتھ میں رہ گئی اور اٹیچی زمین پر جا گرا۔ ثابت ہوا کہ دوسرے اٹیچی کی مٹھ بھی ٹوٹ گئی ہے۔ یک نہ شد دو شد۔ یہ اٹیچی میں نے دائیں کاندھے پر رکھا۔ جہاں نیکیاں نوٹ کرنے کے لئے ایک فرشتہ مامور ہے اور چونکہ عرصہ دراز سے کوئی نیکی سر زد ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ لہذا اس سرپلس SURPLUS فرشتے کو بھی زحمت دینے میں کوئی حرج نہ تھا۔ اب میرے کاندھوں پر ایک ایک اٹیچی کیس تھا اور بیگ گلے میں، جو دائیں بائیں اٹیچی کیس ہونے کی وجہ سے اپنے پورے وزن سمیت گردن کے پیچھے پشت کی جانب لڑھک گیا تھا اور اس کی ڈوری میرے حلق کے گرد پیوست ہو گئی تھی۔ میں چند قدم چلنے کے بعد سانس لینے کے لئے رکتا اور پھر یہ صلیبیں اٹھائے چل پڑتا۔ حتیٰ کہ پلیٹ فارم سے نکل کر ٹرام کی پٹڑی کراس کر کے افتاں وخیزاں سٹیشن کے قریب ایک ہوٹل کے لاؤنج میں داخل ہو گیا۔ اس کا نام FELD HUTTER تھا اور آثار بتاتے تھے کہ خاصا ٹھیک ٹھاک ہوٹل ہے اور اس کی تصدیق بھی ہوئی کیونکہ ایک دن کا کرایہ پچاس مارک تھا۔ تاہم مجھے یہ "وارا" کھاتا تھا۔ کیونکہ میرا اصول سفر یہ ہے کہ میں دوران سفر کچھ دن بچت کرتا ہوں اور پھر ایک دن آرام سے بسر کرتا ہوں۔ باوردی پورٹر نے میرا



سامان اٹھایا (کس طرح اٹھایا؟ اب یہ اس کا مسئلہ تھا) اور پانچویں فلور پر آ گیا۔ پھر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور سامان ایک کونے میں رکھ کر پسینہ پونچھنے کے لئے رومال جیب سے نکالنے لگا۔ میں نے جھٹ سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پیشتر اس کے کہ اس مزدور کا پسینہ خشک ہو کچھ رقم اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ اس نے سر کی جنبش سے شکریہ ادا کیا اور ہولے سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔

میرا کمرہ سڑک کی جانب واقع تھا۔ میں نے کھڑکی کھول دی اور اس کے ساتھ ہی اگست کی نم آلود ہواؤں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور لگتا تھا کہ بارش ہونے کو ہے۔ میں نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر پانچویں فلور سے نیچے سڑک پر نگاہ ڈالی تو تیز ٹریفک رواں دواں تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے انسان اتنے ہی چھوٹے دکھائی دے رہے تھے جتنے بلندیوں پر کھڑے لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں۔ میں چند لمحے پوری محویت کے ساتھ یہ منظر دیکھتا رہا اور پھر کپڑے تبدیل کر کے بڑے سلیقے سے سجے ہوئے اس کمرے کے آرام دہ بستر پر دراز ہو گیا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا تاہم چند لمحوں میں اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی "مٹھی چاپی" کرنے کے نتیجے میں میں نے خاصا ریلیف محسوس کیا۔ میرے لئے یہ امر اطمینان بخش تھا کہ میں اس اجنبی شہر میں بالکل اجنبی نہیں ہوں بلکہ پرویز اور انور جو ماڈل ٹاؤن میں میرے ہمسائے تھے، گزشتہ کئی برس سے یہاں مقیم ہیں۔ میں اسٹیشن سے اتر کر ان کی طرف اس لئے نہیں گیا تھا کہ جانتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے گوناگوں مشکلات خصوصاً رہائشی مسئلے سے دوچار ہیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے ان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو۔

پرویز اور انور اگرچہ آپس میں گہرے دوست تھے لیکن ان کے طبائع میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پرویز انتہائی مخلص، سخت جان اور دوستوں کی خاطر جان قربان کرنے والا شخص تھا۔ وہ سب کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا اور اپنا درد کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ وہ اپنے

والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی ماں بچپن ہی میں فوت ہوگئی تھی اور اس کے فوراً بعد اس کے لکھ پتی باپ نے دوسری شادی کرلی اور پھر وہ جوان بیوی کے ناز نخرے اٹھانے میں مشغول ہوگیا اور پرویز کو یکسر فراموش کردیا۔ دوسری بیوی سے جب اولاد ہوئی تو سوتیلی ماں نے باپ اور بیٹے کے درمیان دیواریں مزید اونچی کردیں تاکہ تمام جائیداد کی مالک تنہا اس کی اولاد بن سکے۔ اس کی یہ سکیم اس حد تک کامیاب ہوئی کہ ایک دن پرویز کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اس وقت اس کا ایف اے کا داخلہ جانے والا تھا تاہم اس نے ہمت نہ ہاری اور کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے کوکا کولا کے ایک ایجنسی ہولڈر کے ہاں ملازمت کرلی اور اب وہ ریڑھے پر بیٹھ کر بوتلوں کے کریٹ دکانداروں میں تقسیم کرنے کے لئے نکلتا تھا۔ وہ ریڑھا خود چلاتا تھا کبھی کبھار اس کا گزر اپنے باپ کی عظیم الشان کوٹھی کے سامنے سے بھی ہوتا۔ یہ صورت حال اس کے باپ کے لئے بظاہر خاصی تکلیف دہ تھی لیکن انسان ایک بار عورت کے سحر میں آجائے تو وہ ناقابل یقین حد تک بے غیرت ہو جاتا ہے۔ اس دوران دردر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے اس کے خیالات میں بڑی بنیادی تبدیلی آگئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ گزرنے والے اس المیے کا ذمہ دار دولت کو سمجھنے لگا تھا اور اس کے باعث رفتہ رفتہ وہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگا۔ مگر کچھ عرصہ بعد وہ اپنے ساتھیوں کی بے عملیوں سے دل برداشتہ ہوگیا اور اس نے ان سے کنارہ کشی کرلی تاہم اس علیحدگی کے باوجود اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ انور کا معاملہ بھی پرویز سے قدرے ملتا جلتا تھا۔ وہ ایک امیر باپ کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ ابھی وہ سات آٹھ برس کا تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بڑے بھائیوں نے شادیاں کرلیں بچے پیدا کئے اور اپنے اپنے کاروبار میں مست ہوگئے۔ کچھ عرصہ بعد ماں بھی فوت ہوگئی جو اس کی واحد غم خوار تھی۔ اب وہ بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی بے سہارا رہ گیا۔ اسے اپنی تعلیم بالکل آغاز ہی میں چھوڑنا پڑی اور وہ کاروبار کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے کئی کام شروع



کئے لیکن کم عمری، ناتجربہ کاری اور رہنمائی کے فقدان کے باعث ہر بار نقصان اٹھایا اب وہ COMPLEXES کا مجموعہ بن گیا تھا۔ وہ خود کو خاندان کے دیگر افراد کے مقابلے میں کمتر محسوس کرتا تھا اور اس احساس کو دبانے کے لئے اپنی برتری ظاہر کرنے میں لگا رہتا تھا۔ اس کا ایک کمپلیکس تعلیم بھی تھا چنانچہ وہ کچھ بھی نہ جاننے کے باوجود ہر چیز کے جاننے کا دعویٰ کرتا تھا جس سے متعدد بار طرفین کے لئے مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو جاتی۔ پرویز اور انور کے خاندانی حالات اور پس منظر میں مشابہت کے باوجود ان کا ردعمل دونوں پر جدا جدا تھا...... انور اپنے خاندان کے دیگر افراد کے سٹیٹس تک پہنچنے کے لئے پیسے کے جنون میں مبتلا ہوگیا تھا اور اب وہ ہمہ وقت اسے جمع کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ جب کہ پرویز کو اس صورت حال نے انتہائی دردمند بنا دیا تھا۔ پھر ایک روز نجانے کیا ہوا کہ ان دونوں نے سامان باندھا اور اجنبی عزیزوں سے دور مغربی جرمنی پہنچ گئے۔ اب یہاں پرویز ایک روسی کھانوں کے ریستوران "ڈاشر" میں باورچی کے عہدے پر تعینات تھا اور مسعود سامان سے بھرے ہوئے ٹرک "ان لوڈ" UNLOAD کرتا تھا۔

میں نے سرہانے پڑے ٹیلی فون کو مزید قریب کیا اور پرویز کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے ڈائل کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف کوئی جرمن تھا اور اپنی قومی روایت کے عین مطابق انگریزی جاننے سے صاف انکاری تھا۔ بہرحال اس نے "پرویز" کا لفظ سن کر میرا مدعا جان لیا اور چند لمحوں بعد مجھے پرویز کی محبت بھری آواز سنائی دی۔

"آپ کب آئے؟" وہ اگرچہ مجھ سے خاصا بے تکلف تھا مگر عمر میں چھوٹا ہونے اور اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے ہمیشہ "آپ" کہہ کر مخاطب ہوتا تھا۔

"کوئی ایک گھنٹہ پہلے پہنچا ہوں۔ تم سناؤ کیسے حال ہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہوں" اس نے افسردہ لہجے میں رسمی جواب دیا۔

انور کی کھرک (خارش) کا کیا حال ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تک ویسی کی ویسی ہی ہے وہ اس کے لئے کبھی نیم کے پتے گھوٹ کر پیتا ہے اور کبھی کچھ اور کرتا ہے مگر ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا۔ وہ پہلے سے زیادہ کنجوس ہو گیا ہے"۔

"کیا وہ اب بھی تم سب کو خارش میں مبتلا دیکھنے کے لئے بہانے بہانے اپنا ہاتھ تمہارے بازو اور گردن پر پھیرتا ہے؟" میں نے اس کی دیرینہ عادت کے بارے میں تازہ ترین صورت حال جاننے کے لئے پوچھا۔

"ہاں! وہ ابھی تک باز نہیں آیا۔ کئی دفعہ اشاروں، کنایوں میں اسے سمجھا چکے ہیں، صاف کہتے ہوئے لحاظ آتا ہے، مگر وہ سمجھتا ہی نہیں ہے"۔ پرویز نے ہنستے ہوئے کہا" ویسے آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

"میں اسٹیشن کے قریب FELD HUTTER میں مقیم ہوں اور اس وقت اپنے کمرے ہی سے بول رہا ہوں"۔

"آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں؟" اس نے پر خلوص لہجے میں شکایت کی "مجھے آپ کی اس حرکت سے دکھ ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مجھے بیگانہ سمجھتے ہیں"۔

"ارے نہیں یار! میں تمہیں بیگانہ کیسے سمجھ سکتا ہوں، میں نہیں چاہتا تھا کہ تم لوگوں کی مشکلات میں مزید اضافہ کروں"۔

"خیر ملاقات ہونے پر آپ سے نبٹ لوں گا۔ یہ بتائیں مل کب رہے ہیں؟"

"میں تو فارغ بیٹھا ہوں، جب کہو آجاؤں گا"۔

"آپ کو یہاں پہنچنے میں دشواری ہو گی، میں انور کو پیغام پہنچاتا ہوں کہ وہ آپ کو آکر لے جائے، میں اس وقت بہت بری طرح پھنسا ہوا ہوں، ورنہ خود آتا"۔

"تم کتنے بجے فارغ ہو جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ابھی تین چار گھنٹے لگیں گے"۔

"ٹھیک ہے تم انور کو بھیج دو۔ مجھے کچھ کام بھی کرنے ہیں۔ اس کے بعد ہم تمہارے



پاس پہنچ جائیں گے"۔

میں نے فون بند کر دیا۔ بستر سے اٹھ کر اٹیچی کیس میں سے گندے کپڑے نکالے اور دھونے کے لئے غسل خانے میں چلا گیا۔ سگھڑ بیویوں کی طرح یہ کام انجام دے کر میں ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کالی گھٹاؤں نے بارش کی شکل اختیار کر لی تھی اور سڑک پر لوگ چھتریاں لئے تیز تیز قدم چلتے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش میں تھے۔ دور تک پھیلی ہوئی بلند و بالا جدید عمارتیں دھل کر اور نکھر گئی تھیں۔ اتنے میں بغیر "ناک" KNOCK کئے کسی نے دروازہ کھولا اور میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ انور تھا۔ اس نے برساتی پہنی ہوئی تھی اور ہاتھ میں بند چھتری تھی جس میں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ ہاتھ کے بڑھے ہوئے ناخنوں سے گردن کھجلا رہا تھا۔ پھر اس نے چھتری ایک کونے میں رکھی اور مجھ سے لپٹ گیا۔

"مارے گئے..... کھرک"! میں نے سوچا! مجھے اگرچہ ایک عرصہ بعد مل کر بہت خوشی ہوئی تھی مگر یہ کھرک کا خوف میرے ذہن سے زائل نہیں ہوا تھا۔ دراصل میں نے ماڈل ٹاؤن میں اسے اپنے ملازم سے جھانویں کے ساتھ بہت بے دردانہ طور پر جسم کھجلواتے کئی بار دیکھا تھا۔

اب وہ کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا تھا اور ماضی کی یادیں دہرا رہا تھا۔ پھر اس نے میرے قیام امریکہ کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ "وہاں تمہارا وقت کیسا کٹا؟"

"بہت اچھا۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر واپس کیوں آگئے۔ یہاں ہم لوگ تو امریکہ جانے کے لئے ترستے ہیں"۔ "اگر ہو سکے تو ضرور جاؤ۔ تمہاری تمام خواہشیں وہاں پوری ہو جائیں گی"۔

"لیکن تم کیوں چلے آئے؟"

"میں اس دنیا کے ایک ایک کونے کو بوسہ دینا چاہتا ہوں لیکن میری سجدہ گاہ میرا وطن

ہے۔ان دو برسوں میں میری جبیں سجدوں کے لئے ترس گئی ہے“۔

”تم نے یہ بات کہہ کر دل خوش کر دیا ہے۔اس پر تمہارا بوسہ لینے کو جی چاہتا ہے“۔

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور میری طرف بڑھا۔

”کھرک“اس خیال سے میرے رونگٹے ایک بار پھر کھڑے ہوگئے“۔بس تم سمجھو کہ میں نے تمہارا بوسہ وصول کر لیا“۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے واپس کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اور ہنستے ہوئے کہا۔وہ خلاف توقع واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

”اب کیا پروگرام ہے“انور نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

بارش تھم گئی تھی اور اب قدرے حبس محسوس ہو رہا تھا۔

”مجھے دو کام کرنے ہیں، ایک تو اٹیچی کیس مرمت کرانے ہیں اور دوسرے پرسوں کے لئے استنبول کا ٹکٹ خریدنا ہے۔اس کے بعد پرویز کی طرف چلیں گے“۔

”ویسے پرویز کا سناؤ، یہاں آکر اس میں کوئی نئی تبدیلی نہیں آئی؟“

”بس ایک ہی تبدیلی آئی ہے اور وہ یہ کہ بے حساب پینے لگ گیا ہے۔نیز یہ کہ بن پیئے وہ افسردہ نظر آتا ہے اور پینے کے بعد وہ اتنا کھلنڈرا بن جاتا ہے کہ ایک مختلف انسان نظر آتا ہے...... رہا معاملہ اٹیچی مرمت کرانے کا تو یہ خیال دل سے نکال دو کیوں کہ اتنے پیسوں میں تم نئے اٹیچی خرید سکتے ہو اور ٹکٹ ابھی جا کر بنوا لیتے ہیں“۔

”چلو!“میں نے کہا اور پھر ہم اٹھ کر سڑک پر آگئے۔

ٹکٹ بنوانے کے بعد ہم اسٹیشن کے تہہ خانے میں واقع ایک ہال نما ریستوران میں چلے گئے۔اس تہہ خانے میں کئی ریستوران ہیں اور یہاں سے ”ایس بان“ (زیر زمین ٹرین) بھی چلتی ہے۔یہاں سیلف سروس تھی۔ میں نے اور انور نے لائن میں لگ کر روسٹڈ چکن ٹرے میں رکھے۔کاؤنٹر کلرک کو اپنے اور میرے چکن کی ادائیگی کرتے ہوئے انور نے پوچھا کہ ”تمہارے پاس کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے ہیں؟ مجھے مارک بھنوانا پڑے



گا“اور میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چینج ہتھیلی پر پھیلا دیا جو قریباً میری مرغی کی قیمت کے برابر تھا۔یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ امریکہ کی طرح یورپ میں بھی چکن غریبوں کی غذا ہے جب کہ بقول اشفاق احمد ہمارے ہاں امیر آدمی مرغی اس وقت کھاتا ہے جب وہ بیمار پڑتا ہے اور غریب آدمی اس وقت کھاتا ہے جب مرغی بیمار پڑتی ہے اور غالباً یہ غربا و مساکین و یتامیٰ ہی کا ریستوراں تھا کیونکہ یہاں ہر کسی کے ایک ہاتھ میں مرغی اور دوسرے میں بیئر کا گلاس تھا۔یہاں بے پناہ رش تھا اور بیٹھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا چنانچہ لوگ شانے سے شانہ ملائے کھڑے تھے اور خورد و نوش میں مشغول تھے۔ یہاں شائستگی مفقود تھی۔لوگ مرغی کو اس طرح ”چک“ مارتے تھے جس طرح انگریزی فلموں میں سفاک بادشاہوں کو دکھایا جاتا ہے۔ایک ادھیڑ عمر جرمن مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا متواتر مجھے گھورنے میں مشغول تھا پہلے میں سمجھا کہ مجھے محض شبہ ہوا ہے لیکن جب میں نے شعوری طور پر نوٹ کیا تو پتہ چلا کہ بغیر پلک جھپکائے مجھے دیکھے چلا جا رہا ہے۔ میں نے انور کو ٹہوکا دیا اور صورت حال سے مطلع کیا تو اس نے کہا ”پروا مت کرو۔اس کی طرف توجہ دیئے بغیر جلدی سے کھانا ختم کرو اور یہاں سے نکل چلو“۔

”مگر معاملہ کیا ہے“؟

”معاملے کو چھوڑو، اگر تم نے اسے مسکرا کر دیکھ لیا تو وہ ادھر چلا آئے گا اور پھر جان نہیں چھوڑے گا“۔

”مگر کیوں؟“میں نے پوچھا۔

”بس اپنا اپنا شوق ہے“اس نے ہنستے ہوئے کہا”یہاں پاکستانی نوجوانوں کو جب شروع شروع میں نوکری نہیں ملتی تو ان میں سے بعض ایسے ہم جنسوں ہی کی خدمت کر کے اپنا اور ان کا پیٹ بھرتے ہیں اور یہ بزرگ جرمنی کے دوسرے شہروں کی نسبت میونخ میں زیادہ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

کاغذ کے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے باہر نکلے تو میں نے انور سے پوچھا "تو پھر کیا خیال ہے اٹیچی کیس نئے خرید لئے جائیں؟"

"میری مانو تو کسی نہ کسی طرح کام چلالو۔ میں تمہیں مضبوط ڈوری کی مٹھ بنادوں گا جو پاکستان تک نہیں ٹوٹے گی"۔

"مشکل ہے" میں نے اس کی تجویز رد کرتے ہوئے کہا "مجھے کسی دکان پر لے چلو"۔

"یہاں ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور ہے، جہاں سب کچھ مل جاتا ہے وہیں چلتے ہیں"۔

"کتنی دور ہے؟" میں تھکا ہوا تھا اور مزید تھکن کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

"بس قریب ہی ہے"۔ اس نے کہا۔

"تمہیں پتہ بھی ہے وہ کہاں واقع ہے؟" میں نے پوچھا کیونکہ انور نے ساری عمر لاہور میں بسر کی تھی اور وہ ابھی تک لاہور کے راستوں سے بھی بے خبر تھا۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" اس نے بڑے وثوق سے گردن ہلائی جس پر مجھے شبہ ہوا کہ وہ رستہ نہیں جانتا کیونکہ جس چیز کے بارے میں وہ نہ جانتا ہو۔ اس پر وہ اتنے زور سے گردن ہلانے کا عادی تھا کہ بسا اوقات منکا ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔

"یار کیسی باتیں کرتے ہو۔ تم مجھے بالکل ہی چغد سمجھتے ہو؟"۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور سڑک پار کر کے دوسری سمت آگیا اور پھر ہم نے چلنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے میری ٹانگیں جواب دے گئیں تو اسے کہا کہ اگر دکان دور ہے تو ٹیکسی، بس یا ٹرام پر بیٹھ جاتے ہیں اور اگر تمہیں رستے کا علم نہیں ہے تو کسی سے پوچھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس پر وہ بادل نخواستہ ایک جرمن نوجوان کی طرف بڑھا اور "بتے" (پلیز) کہہ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ راہگیر چند ثانیے منتظر رہا کہ وہ آگے سے کچھ کہے مگر جب اسے خاموش پایا تو حیران نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔



"کیا تمہیں جرمن نہیں آتی؟" میں نے انور سے پوچھا۔

"مجھے تو آتی ہے۔ اسے نہیں آتی"۔ انور نے سنجیدگی سے کہا اور اس پر میری ہنسی چھوٹ گئی۔

چلتے چلتے انور اچانک دائیں جانب پر واقع ایک دکان میں داخل ہو گیا۔ اس پر میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ میں سمجھا کہ شاید یہاں سے اٹیچی کیس دستیاب ہیں مگر یہ "سیکس شاپ" تھی۔ کاؤنٹر پر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ یہاں ننگی تصویریں، بلیو فلمیں، عورتوں اور مردوں کے مصنوعی اعضاء، قوت باہ کی گولیاں، ٹیکے اور خدا جانے کیا کچھ تھا۔ ایک طرف چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے۔ جن میں بلیو فلمیں دکھانے کی مشینیں نصب تھیں۔ ان میں سکہ ڈالا جاتا ہے جس پر فلم شروع ہو جاتی ہے مگر یہ اسی طرح دیکھی جاتی ہے جس طرح ہم سب بچپن میں بارہ من کی دھوبن اور تاج محل دیکھا کرتے تھے۔ یہاں ایک "جدت" انہوں نے یہ بھی پیدا کی ہے کہ دو منٹ کے بعد فلم عین اس مقام پر رک جاتی ہے، جسے نازک مقام ہی کہا جا سکتا ہے۔ اگلا سین دیکھنے کے لئے ایک سکہ اور ڈالنا پڑتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ پھر کسی نازک مقام پر رک جاتی ہے اور ایک سکہ مزید ڈالنا پڑتا ہے۔ یوں پوری فلم دیکھنے تک کئی مارک ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ ایسا سسپنس قائم کیا گیا ہوتا ہے کہ شائقین جیبیں خالی کر کے ہی دکان سے باہر نکلتے ہیں۔ یہ تماشا میں نے ایک بار امریکہ میں دیکھا تھا بعد میں مجھے یہ سب کچھ مضحکہ خیز معلوم ہوا اس لئے انور کو کیبن میں داخل ہوتے دیکھا تو مجھے ہنسی آگئی۔ وہ ایک آنکھ روزن سے لگائے پورے خضوع و خشوع سے فلم دیکھنے میں مشغول تھا۔ تھوڑی دیر بعد "ٹک" کی آواز آئی اور انور نے اضطراب کے عالم میں جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے اس نے مشین کو چھاڈالا ہوا تھا۔ اس نے ایک سکہ مزید ڈالا اور آنکھ سوراخ کے ساتھ چپکا دی۔ چند لمحے گزرنے پر فلم پھر رک گئی تھی، اس بار اس نے سخت

ایمر جنسی کے عالم میں مجھے آواز دی "یار کج ٹٹے ہوئے پیسے دیں ذرا چھیتی کریں"۔ (یار کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے دو ذرا جلدی کرو) میں نے جیب سے چینج نکال کر اسے دے دیا اور کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی کو دیکھنے لگا جو ایک گاہک کو قوت باہ کے ٹیکے فروخت کرتے ہوئے ان کی افادیت پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈال رہی تھی۔ "ان کے استعمال سے آپ اپنے اندر ایک بالکل نئی زندگی محسوس کریں گے۔ یہ ٹیکے بہترین دماغوں کے تیار کردہ ہیں۔ طویل عمر میں مسرت کے لمحات بھی طویل ہونے چاہئیں اور ان کی مدد سے آپ مسرت کے لمحوں کو جتنا چاہیں طویل کر سکتے ہیں۔ اس کے سائڈ افیکٹس بھی نہیں ہیں"۔

اتنے میں انور نے ایک بار پھر کپکپائی ہوئی آواز میں کہا "یار کج ٹٹے پیسے دیں" اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور حالت غیر تھی۔ اس پر میں نے خارش کی پروا کئے بغیر اسے گردن سے پکڑا اور دکان سے باہر لے آیا اس نے پہلے تو برا سا منہ بنایا اور پھر کچھ دیر بعد نارمل ہونے پر ہنسنے لگا۔

رستے میں ایک بوڑھا شخص فٹ پاتھ پر گٹار لئے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا ہیٹ زمین پر پھیلایا ہوا تھا اور جرمن میں کچھ گانے کی کوشش کر رہا تھا جو یقیناً (دے جا سخیا راہ خدا تیرا اللہ ہی بوٹا لاوے گا) قسم ہی کی چیز تھی۔ میں نے کچھ سکے اس کے ہیٹ میں اچھالے اور آگے بڑھ گیا۔ کچھ آگے چل کر ایک اور بوڑھا جرمن دکھائی دیا جو چلتا جاتا تھا اور مٹھیاں بھینچ بھینچ کر پر جوش تقریر بھی کرنے میں مشغول تھا۔ اس کا لہجہ کرخت تھا اتار چڑھاؤ خطیبانہ تھا چہرہ کھنچا ہوا تھا اور زور بیاں سے منہ لال ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً دلی کے لال قلعے پر ایک بار پھر جھنڈا گاڑنے جیسی باتیں کر رہا تھا۔ لوگ ایک نظر اس کی طرف دیکھتے تھے اور پھر زیادہ توجہ دیئے بغیر آگے چل پڑتے تھے۔ کیونکہ اب وہ عرصہ تک اس نوع کی تقریریں نہیں سننا چاہتے تھے۔ میونخ میں دو دن کے قیام میں میں نے اس قسم کے کم و بیش پانچ چھ پاگل دیکھے۔



ہم اب تک دو تین میل چل چکے تھے لیکن وہ ڈیپارٹمنٹل سٹور کہیں نظر نہیں آیا تھا جہاں انور مجھے لے جانا چاہتا تھا۔ یہاں سڑکوں کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جہاں سے روزمرہ کی چیزیں دستیاب تھیں۔ طویل سفر اور "صلیبیں" اٹھا کر چلنے کی وجہ سے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اوپر سے اس "واک" نے میرے لئے "مرے کو مارے شاہ مدار" والی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ اس پر میں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور زمین پر پتھلا (چوکڑی) مار کر بیٹھنے کو تھا کہ انور نے ہنستے ہوئے مجھے اس حرکت سے باز رہنے کو کہا اور برابر والی دکان کے کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی سے راستہ پوچھنے کے لئے اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ دور سے میں نے دیکھا تو لڑکی کے پنکھڑی ایسے ہونٹ اور انور کی کمانی دار گردن حرکت میں تھے۔ وہ گردن کو کبھی آگے پیچھے ہلاتا اور کبھی بڑی بیدردی سے بائیں یا دائیں طرف لڑھکا دیتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دکان سے باہر نکلا "ٹھیک ہے سمجھ گیا ہوں" اس نے کہا اور مجھے ایک بار پھر پیچھے لگا لیا۔

دفتروں میں چھٹی ہو گئی تھی۔ دن بھر کے تھکا دینے والے کام کے باوجود ہر طرف ترو تازہ اور خوش و خرم چہرے دکھائی دیتے تھے۔ یہ قوم لٹ پٹ کر بھی ویسی کی ویسی ہی ہے، عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ غالباً ہمارا اقبال ٹھیک کہتا ہے۔ ان کا گوئٹے بھی ٹھیک کہتا ہے بس سارا مسئلہ گفتار اور کردار کے غازی ہونے کا ہے۔

"انور میں تھک گیا ہوں"۔

غالباً اس بار میری تمام تھکن انور میں سرایت کر گئی ہے۔ وہ کہتا ہے "چلو ٹرام" میں بیٹھ جاتے ہیں"۔

ٹرام اس قدر خوبصورت ہے کہ اسے پاؤں کی دھول سے آلودہ کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ایک خستہ حال پاکستانی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔

"قیصر سٹریٹ اتر جاؤ، وہاں کئی ڈیپارٹمنٹل سٹور ہیں"۔ وہ انور کو بتاتا ہے۔ "کمال ہے

یار، ہم لوگ تو اس کے قریب ہی رہتے ہیں۔ ڈاشر رستوران بھی تو وہیں ہے، انور میرے کان میں کہتا ہے"۔

"تم اتنے عرصے میں کبھی اس طرف نہیں گئے؟" میں پوچھتا ہوں۔

"کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی پاکستان سے چلتے وقت ضرورت کے تمام کپڑے اور دیگر چیزیں ساتھ لے آیا تھا- سارا دن کام کرتا ہوں اور شام کو واپس "بابے دی ہائم" آکر سو جاتا ہوں- نوید، پرویز اور دوسرے پاکستانی رات کو بیئر کے لئے کسی بار میں چلے جاتے ہیں یا میکسی ہاؤس کا رخ کرتے ہیں لیکن میں نے کبھی ادھر کا رخ بھی نہیں کیا"

"یہ بابے دی ہائم اور میکسی ہاؤس کیا ہے؟"

"ہائم (HEIM) یہاں اس بڑی بلڈنگ کو کہتے ہیں جہاں بہت سے لوگ رہتے ہوں- پاکستانیوں نے ان ہائمنر کے اپنے نام رکھے ہوئے ہیں مثلاً چاچے دی ہائم، تائے دی ہائم وغیرہ جہاں ہم رہتے ہیں اس کا نام "بابے دی ہائم" ہے- میکسی ہاؤس چکلے کو کہتے ہیں جو شہر میں مختلف جگہوں پر ہیں- یہ کئی منزلہ عمارت ہوتی ہے جو سیڑھیوں کے ذریعے طے کرنا پڑتی ہے- ہر منزل پر جہاں سیڑھیاں ہوتی ہیں وہاں کمروں کے باہر سیڑھیوں کی ریلنگ کے ساتھ طوائفیں بیٹھی ہوتی ہیں- چالیس مارک!!!......

بہت زیادہ ہیں؟"

"تم جب سے آئے ہو، میونخ ہی میں رہے ہو یا کسی دوسرے شہر میں بھی قسمت آزمائی کی ہے؟"

"بون بھی گیا ہوں مگر وہاں نوکری نہیں ملی مجھے یوں بھی میونخ زیادہ اچھا لگا ہے یہ جو اتنی خوبصورت ٹرامیں اور بسیں تم یہاں دیکھ رہے ہو- بون میں نظر نہیں آئیں گی- وہاں چلنے والی ٹرام اور کراچی کی ٹرام میں کوئی فرق نہیں- بسیں بھی انتہائی خستہ ہیں- کنڈکٹروں نے ٹکٹ کی گڈیاں ہاتھ میں پکڑی ہوتی ہیں-"



یہ ٹرام عین قیصر سٹریٹ کی بجائے اس کے گردونواح میں جاتی تھی اور وہ علاقہ قریب آنے کو تھا- بیشتر اس کے کہ انور بغیر "ٹکٹ اتر جاتا، کنڈیکٹر اس کے پاس پہنچ چکا تھا- انور نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر میری طرف دیکھ کر کہا "یار ذرا- ٹٹے ہوئے پیسے-"

# بابے دی ہائم

بابے دی ہائم کی دیواریں ایک عرصے سے سفیدی نہ ہونے کے باعث سیاہ پڑ چکی تھیں اور عمارت اتنی خستہ حال تھی کہ اس کی چھتیں اور دیواریں کسی بھی وقت گر سکتی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتے جگہ جگہ بلغم کے نشان دکھائی دیئے۔ پرویز پہلی ہی منزل میں مقیم تھا۔ ہال نما کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے قطار اندر قطار چارپائیاں بچھی دکھائی دیں۔ ان میں سے بیشتر کی پائنتی پر بستر لپیٹے ہوئے رکھے تھے۔ کچھ چارپائیاں ایسی بھی تھیں جن پر لوگ لیٹے ہوئے تھے۔ کمرے کے ایک کونے میں تیل والا چولہا پڑا تھا۔ جس پر مٹی کی ہنڈیا چڑھی تھی اور ایک پاکستانی نوجوان اس میں ڈوئی ہلا رہا تھا۔ ایک دوسرا شخص پاؤں کے بل بیٹھا ہل ہل کر ایک کنالی میں آٹا گوندھ رہا تھا۔ آٹا گوندھتے ہوئے مسلسل حرکت اور چولہے کی تپش سے پسینوں پسینی ہو رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ توقف کر کے ماتھے پر سے پسینہ پونچھا اور پھر انہی ہاتھوں سے دوبارہ آٹا گوندھنے میں مشغول ہو گیا۔ چارپائی پر بیٹھا ایک نوجوان سوئی دھاگا ہاتھ میں لئے قمیض میں بٹن ٹانک رہا تھا۔ کمرے کے درمیان میں پڑی ایک چارپائی پر یہاں کا ایک مکین رضائی لپیٹے پڑا تھا۔ اسے تیز بخار تھا اور وہ وقفے وقفے بعد کراہ رہا تھا۔۔ ''پانی'' اس نے نحیف سی آواز میں کہا اور اس کے سرہانے بیٹھے ایک نوجوان نے صراحی میں سے پانی انڈیل کر اسے دیا۔ یہ سب لوگ پنجاب کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے چہروں پر غربت و افلاس اور محنت اور مشقت کی لکیریں اتنی گہری تھیں کہ باقی تمام نقوش ان میں چھپ گئے تھے اور یوں ان سب کی شکلیں ایک جیسی



ہو گئی تھیں۔ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ہمارے پاؤں کی چاپ سن کر قمیض میں بٹن ٹانکنے والے زرد رو نوجوان نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور پھر انور کے ساتھ ایک خوش پوش اور مختلف شکل کے اجنبی کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ میرے اور پرویز کے دوست ہیں عطا صاحب! ان سے ملو''۔ انور نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

وہ نوجوان بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور مرعوبیت کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ مصافحے کے لئے میری طرف بڑھا دیئے۔ اس اثناء میں آٹا گوندھنے والے نے کنالی پرے سرکائی اور ہاتھ دھو کر مجھ سے ہاتھ ملانے کیلئے آگے بڑھا۔ میں چارپائی پر بیٹھنے ہی کو تھا کہ زرد رو نوجوان نے ''نہ نہ'' کرتے ہوئے مجھے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر لپٹا ہوا بستر کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ بستر گکھڑ کی بنی ہوئی دری اور کڑھے ہوئے غلاف والے سرہانے پر مشتمل تھا۔ اتنے میں سامنے والے کمرے سے سسکیوں کی آواز سنائی دی اور پھر یہ بلند ہوتی چلی گئی۔

''یہ کون رو رہا ہے؟'' میں نے انور سے پوچھا۔

''جہلم کے ایک شخص کا والد فوت ہو گیا ہے۔ اسے پرسوں تار کے ذریعے اطلاع ملی تھی۔ اس وقت سے یہ مسلسل روئے جا رہا ہے'' انور نے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ دوسرے لوگ سامنے والی چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گئے تھے۔

''اس کمرے میں کتنے لوگ رہتے ہیں؟'' میں نے رونے والے کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے کمرے میں بچھی کم و بیش پچیس چارپائیوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''جتنی چارپائیاں آپ کو نظر آ رہی ہیں۔ اس سے دوگنے لوگ یہاں مقیم ہیں۔ رات کو کام کرنے والے دن کو یہاں آ کر سو جاتے ہیں اور دن کی شفٹ والے رات کو یہاں

آرام کرتے ہیں۔ بوقت ضرورت ایک چارپائی پر دو افراد بھی سوجاتے ہیں“۔

انور، پرویز کو بلانے چلا گیا تھا۔ اتنی دیر میں کئی اور نوجوان ایک نووارد کو دیکھ کر سامنے والے کمرے سے آئے اور میرے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔

”وطن کا کیا حال ہے جی؟ بڑی بری بری خبریں سننے میں آرہی ہیں“۔ ایک نے پوچھا۔

”اس بارے میں میری معلومات بھی آپ جتنی ہی ہیں“۔

”آپ پاکستان سے نہیں آرہے؟“

”نہیں۔۔۔ میں پاکستان جارہا ہوں“۔

”آپ کہاں سے آرہے ہیں“۔

میں نے انہیں مختصراً اپنے بارے میں بتایا تو وہ چارپائیاں کھسکا کر میرے اور قریب آگئے۔ ”آپ ہمیں امریکہ کا ویزا نہیں دلواسکتے“۔ ان کے لہجے میں لجاجت تھی۔

”وہاں پہنچنا بہت مشکل ہے۔ پہلے وہاں سے کسی دوست سے SPONSER کروانا پڑتا ہے، پھر ویزے کا مرحلہ آتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ملک سات سمندر پار ہے کرایہ بھی بہت زیادہ ہے۔“ وہاں پہنچنا اور وہاں رہنا ان بے آسرا اور غریب لوگوں کے بس میں نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے دل پر جبر کر کے صحیح صورتحال سے انہیں آگاہ کر دیا۔ میں انہیں کسی نئی خود فریبی میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

ان کے چہروں پر لمحہ بھر کے لئے امید کی جو روشنی نمودار ہوئی تھی، وہ آناً فاناً غائب ہو گئی۔

اتنے میں دروازے میں ایک سرخ و سفید چہرے والا موٹا تازہ شخص نمودار ہوا۔ وہ اگرچہ قمیض پتلون میں ملبوس تھا لیکن چہرے مہرے سے گنوار اور کھدرا سا شخص لگتا تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر کوئی توجہ دیئے بغیر بوٹوں سمیت چارپائی پر چت لیٹ گیا۔



”اوے فقیر یئے، ادھر آکے میری ٹانگیں دبا“۔ اس نے لیٹے لیٹے ”رعب دار آواز میں حکم دیا۔ اس پر قمیض میں بٹن ٹانکنے والا زرد رو نوجوان پلک جھپکنے میں اٹھا اور چارپائی کی پائنتی کے کنارے پر بیٹھ کر اس کی ٹانگیں دابنے لگا۔

”یہ کون شخص ہے؟“ میں نے اس کے رویے پر حیران و پریشان ہو کر سامنے بیٹھے نوجوان سے پوچھا۔

اس نے جواب میں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ ان کے چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک اونچی آواز میں بولا۔ ”یہ ہمارے چوہدری صاحب ہیں۔ ہمارے بڑے مہربان ہیں۔ ہم انہی کی وجہ سے یہاں ہیں، ورنہ کب کے نکالے گئے ہوتے“۔

”نواز کے بچے، تم بھی ادھر آؤ، یہ جوتے اتار کے چارپائی کے نیچے رکھ دو“۔ اور اب کے آٹا گوندھنے والا برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھا اور تسمے کھولنے لگا۔ ”تمہاری ماں کو...... ہاتھوں میں جان نہیں ہے کیا؟ کوڑھیوں کی طرح دبا رہے ہو!“ اس نے فقیر یئے کو موٹی سی گالی دی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر میرے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ پیشتر اس کے کہ میں زبان کھولتا کہ سامنے بیٹھے ہوئے خفزدہ نوجوان نے ایک بار پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی درخواست کی۔

”تم لوگوں کے پاس یہ کون بیٹھا ہوا ہے“۔ اس نے پلٹا کھا کر اوندھے ہوتے ہوئے اپنا چہرہ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

”یہ پرویز صاحب کے مہمان ہیں جی“۔

”اچھا اچھا“۔ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا تھا۔ ”پرویز تو اپنا یار ہے۔ کیا حال ہے جناب! آپ پرویز ہی کے نہیں میرے بھی مہمان ہیں، چل

اوئے نواز جلدی سے ان کے لئے چائے بنا کے لا۔"

"میں چائے نہیں پیوں گا"۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ میرے دل میں اس مکروہ شخص کے لئے نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔

"اوہ میرا پرویز بادشاہ آ گیا"۔ اچانک اس نے اپنے بازو ہوا میں پھیلائے اور چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پرویز دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔ چوڑی چکلی چھاتی۔ گٹھا ہوا بدن اور سانولے چہرے پر خود اعتمادی کا غازہ۔ اس کے ساتھ انور بھی تھا۔ پرویز ادھر ادھر دیکھے بغیر سیدھا میری طرف آیا اور میرے سینے سے چپک گیا۔ اس کے معانقے میں گہری محبت اور خلوص کی گرمی تھی۔ اس نے کافی دیر تک مجھے لپٹائے رکھا اور پھر میرے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"جب سے آپ کا فون آیا۔ میرا کام میں جی نہیں لگ رہا تھا۔ آپ اتنی دیر کیا کرتے رہے؟"

"کچھ کام کرنے تھے، ان میں دیر ہو گئی"۔

پرویز کے آنے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے نوجوان کے چہروں سے خوف زائل ہو گیا تھا اور اب وہ چہک رہے تھے۔ ان کا آقا بھی اب ان سے مصنوعی ملائمت کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔

"چلو اٹھو کہیں سیر کو چلتے ہیں"۔ پرویز نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ میں اور انور اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کراہنے والے شخص نے ایک بار پھر پانی مانگا۔ اس بار پرویز نے کونے میں پڑی صراحی سے پانی انڈیل کر اسے دیا۔ پرویز نے اس موٹے شخص کو مخاطب کیا "تم سے پھر ملاقات ہو گی"۔

اور پھر ہم بابے دی ہائم سے نکل کر میونخ "فرائی ہائٹ" (بسوں کا آخری سٹاپ) سے انگلش گارڈن کی طرف نکل گئے۔ ہمارے ساتھ پاکستان سے ایک مضافاتی ہفت روزے کا



ایک ایڈیٹر بھی تھا جو سیڑھیوں میں مل گیا تھا اور پرویز اسے بھی ساتھ لے آیا تھا۔ اس کا نام تنویر تھا اور یہ بھی دیگر لوگوں کے ساتھ یہاں دھکے کھا رہا تھا۔

"یہ موٹا سا شخص کون تھا؟" میرے دل میں اس شخص کے لئے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی اور میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔

"کیا بات ہے اس حرامزادے نے آپ کو تو کچھ نہیں کہا؟" پرویز چلتے چلتے ایک دم رک گیا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔

"نہیں، لیکن اس کا رویہ ان غریب لوگوں کے ساتھ انتہائی حاکمانہ اور جابرانہ تھا"۔

"یہ شخص یہاں ایک طویل عرصے سے مقیم ہے۔ اسے امیگریشن ویزا مل چکا ہے۔ اس نے کچھ غنڈے پالے ہوئے ہیں جن کے بل بوتے پر اس نے ان مظلوم لوگوں کو اپنا غلام بنایا ہوا ہے۔ ان سے باقاعدہ ٹیکس وصول کرتا ہے۔ خدمت لیتا ہے جو حکم عدولی کرے اسے مار مار کر لہولہان کر دیتا ہے۔ یہ سب لوگ اس لئے ظلم سہہ جاتے ہیں کہ یہ پولیس کو ان کے غیر قانونی قیام کے بارے میں مطلع کرنے کی دھمکیاں دیتا رہتا ہے اور یوں اس کا سارا کاروبار بلیک میلنگ کے ذریعے چل رہا ہے"۔

"لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ تم سے خاصا دبتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

"وجہ یہ ڈولے ہیں"۔ پرویز نے بازو کی مچھلیاں دکھاتے ہوئے کہا۔ "جب میں پہلے روز یہاں آیا تو اس نے مجھے تابع فرمان بنانے کی کوشش کی۔ میں نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ اگلے روز یہ غنڈوں کو ساتھ لے آیا۔ یہ ڈیڑھ ڈیڑھ پسلی کے غنڈے تھے مگر ان پسے ہوئے مجبور و مظلوم لوگوں کی کمزوری نے انہیں شیر بنا رکھا تھا۔ میں نے ان کی بھی خبر لی۔ پھر اس نے مجھے دھمکی دی کہ میں تمہیں دو دن میں جرمنی سے نکال دوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں تو یہاں سے زندہ جاؤں گا لیکن تمہاری لاش وطن واپس جائیگی۔ اس پر اس کا دماغ درست ہو گیا۔ یہ اندر سے مجھ سے خار کھاتا ہے۔ مگر فی الحال

مصلحتاً خاموش ہے-اب یہ میرے سامنے ان بے نوا اور بے آسرا کو بھی کچھ نہیں کہتا مگر بعد میں ساری کسریں نکال لیتا ہے-میرا دل ان کے لئے روتا ہے لیکن میں اکیلا ان کا دفاع نہیں کر سکتا-اپنی رہائی کے لئے انہیں بھی کچھ کرنا ہوگا-"

"اچھا خیر چھوڑو" میں آزردہ ہو گیا تھا اور گفتگو کا رخ موڑنا چاہتا تھا "تمہیں جرمن زبان میں ابھی تک کچھ شد بدھ حاصل ہوئی ہے یا نہیں؟"

"شد بدھ کیا، اچھی خاصی روانی سے بول لیتا ہوں بلکہ میں تو پڑھنا بھی سیکھ گیا ہوں-یہاں کا سب سے مشہور اخبار "سوودونچے زائی تنگ (SUD DEUTCHE ZIETUNG) ہے اور میں باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کرتا ہوں"-

"میونخ سے کتنے اخبار نکلتے ہیں؟"

"بہت سے ہیں تاہم ان میں سے آبنبت سائی تونگ، ٹی، زیڈ اور دی ولمیٹ، وغیرہ زیادہ مشہور ہیں-ان میں بعض اشتہار ہم پاکستانیوں کے لئے بڑے مزے کے ہوتے ہیں، مثلاً ایک اشتہار جو عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے وہ یہ ہے-

INDIANER MODLE FUR-SIE

یعنی "آپ کے لئے خوبصورت ہندوستانی نوجوان، ماڈل دوشیزہ"-اس کے ساتھ ٹیلیفون نمبر بھی دیا ہوتا ہے-پاکستانی اس نمبر پر ٹیلیفون کر کے ان ہندوستانی دوشیزاؤں کو تنگ کرتے ہیں اور وہ جواب میں انہیں اردو کی بجائے جرمن میں گالیاں دیتی ہیں"-

"یہ ہندوستانی لڑکیاں صرف ماڈلنگ ہی کا کام کرتی ہیں؟" میں نے پوچھا-

"یہ ماڈلنگ تو محض آڑ ہے ورنہ ان کا اصل کام جسم فروشی ہے-ماڈلنگ کی آڑ انہیں اس لئے لینا پڑتی ہے کہ ایک تو طوائف کا لائسنس حاصل کرنے کے لئے یہاں خاصے دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور دوسرے غیر ملکی لڑکیوں کو یہاں "ورک پرمٹ" نہیں ملتا"



'میونخ میں پاکستانی لڑکیاں بھی تو ہوں گی"-

"ایک نہیں کئی ہیں لیکن وہ اونچے گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور یہاں تعلیم کے لئے آئی ہیں-ان میں سے ماڈل ٹاؤن کی یاسمین نزہت سے میری ملاقات بھی ہوئی تھی-آپ شاید اسے نہیں جانتے وہ ایک جرمن لڑکے کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈالے شٹبارن برگ جھیل کے قریب پھر رہی تھی-اس نے مجھے دیکھ کر نظریں چرانے کی کوشش کی لیکن اتفاق سے وہ جرمن میرا دوست تھا اور پھر ہم تینوں ایک قریبی بار میں چلے گئے-تھوڑی دیر بعد وہ بھی ہمارے ساتھ ناؤنوش میں مشغول ہو گئی-"

اتنی دیر میں ہم لوگ انگلش گارڈن میں گھنے درختوں کے درمیان پہنچ گئے تھے-جہاں بے شمار لڑکے لڑکیاں سبز گھاس پر "پچ بٹنوں کی جوڑی" کی طرح لیٹے ہوئے تھے-پارک کے بیچوں بیچ ایک جھیل تھی جس میں بطخیں تیر رہی تھیں-جھیل کا پانی خاصا گدلا تھا-نوجوان جوڑے یہاں بوٹنگ کر رہے تھے-اور ان کشتیوں کی اندرونی صورت حال بھی کچھ اس طرح کی تھی کہ اندر لیٹے ہوئے جوڑوں نے چپو چلانے بند کر دیئے تھے اور کشتی کو موجوں کے سہارے چھوڑ دیا تھا-کچھ جرمن نوجوان یہاں بکھرے بالوں اور الجھی داڑھیوں کے ساتھ اکیلے بھی گھوم رہے تھے-پرویز نے انکی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ سب چرسی ہیں اور انگلش گارڈن میں کسی محفوظ گوشے میں بیٹھ کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں-یہاں درختوں کی شاخوں میں سیروں کے حساب سے چرس بھی چھپا کر رکھی جاتی ہے-چرس کے تاجر یہاں آتے ہیں اور ان درختوں کے نیچے سودے طے پاتے ہیں-پولیس یہاں اکثر چھاپے مارتی رہتی ہے-کئی پولیس والے یہاں سادہ لباس میں بھی پھرتے رہتے ہیں"-

پرویز اپنے ساتھ پوری بوتل لایا تھا-اس نے اسے منہ لگایا اور پھر تنویر کی طرف بڑھا دی-

تنویر کہہ رہا تھا "ہم لوگ پاکستان میں در آمد ہونے والی یورپی فلموں میں جو کچھ دیکھتے تھے اور پھر حاصل کرنے کی تمنا کرتے تھے- یہاں آکر ان میں سے کچھ بھی نہیں ملا- نہ کار، نہ ٹیلیویژن، نہ ریفریجریٹر، نہ ائرکنڈیشنڈ گھر، نہ سوئمنگ پول اور نہ خوبصورت لڑکیاں- ہم لوگ یہاں سارا دن کوئی نچلے درجے کا کام کرتے ہیں- بابے دی ہائم میں رہتے ہیں- مقامی لوگوں سے ہمارا کوئی ربط ضبط نہیں، وہ ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں- ان عوامل کے نتیجے میں فرسٹریشن کا شکار ہو کر اپنی خون پسینے کی کمائی سے شراب پیتے ہیں-

عورت کی تلاش میں میکسی ہاؤس کی طرف نکل جاتے ہیں اور چالیس مارک خرچ کر کے آجاتے ہیں- ایک بار ہمارا ایک ساتھی اپنی خوبصورت جرمن گرل فرینڈ کو ہائم میں لے آیا تھا، یہاں ایک انار تھا اور سو بیمار تھے، سو گڑبڑ ہوگئی، پولیس تک نوبت پہنچ گئی- اس کے بعد کوئی لڑکی اس سڑک کا رخ بھی نہیں کرتی- ہم لوگ تمام محرومیوں کے باوجود یہاں رہ رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر کے پاس واپسی کا کرایہ تک نہیں ہے- دوسرے ہم لوگ بڑی ڈینگیں مار کر یہاں آئے تھے کہ وہاں جا کر یہ کرینگے، وہ کرینگے اور تیسرے ہم یہاں تمام تر تشنہ حسرتوں کے باوجود ایک نعمت سے ہمکنار ہیں اور وہ آزادی کی نعمت ہے- ہم متوسط طبقے کے لوگ جن گھروں سے تعلق رکھتے ہیں وہاں بے شمار ناروا پابندیاں روا رکھی جاتی ہیں جب کہ ہم یہاں آزاد ہیں، ہماری سرگرمیوں پر کوئی انگلی دھرنے والا نہیں- اپنی مرضی سے گھر سے نکلتے ہیں اور اپنی مرضی سے واپس آتے ہیں-- البتہ یہ جو دوسرے لوگ آپ کو یہاں نظر آتے ہیں، ان کا معاملہ مختلف ہے، یہ انتہائی پسماندہ علاقوں سے یہاں آئے ہیں- ان میں سے کوئی اپنی بیوی کے زیور فروخت کر کے یہاں آیا ہے، کسی نے اپنی کنیا رہن رکھی ہے، کوئی اپنے چند کلے زمین بیچ کر آیا ہے اور کسی نے اپنے عزیز و اقارب سے ادھار لیا ہے- انہیں اپنے بوڑھے والدین کو پالنا ہے-



اپنی بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں، اپنے بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی مہیا کرنی ہے- سوان کا مسئلہ صرف زندہ رہنا ہے اور وہ کچھ نہ کچھ رقم ہر مہینے گھر بھیج دیتے ہیں اور کچھ رقم واپسی پر بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں جس سے وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لیتے ہیں-- ان کا مسئلہ بھوک ہے اور یہ انفرادی آزادی وغیرہ ہم لوگوں کے مسئلے ہیں!"

پرویز نے ایک بار پھر بوتل کو "ڈیک" لگائی اور مجھ سے پوچھا "یہ تنویر کیا کہہ رہا تھا؟ خیر جو بھی کہہ رہا تھا، ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا- آئیں بوٹنگ کرتے ہیں!"

جب چپو چلاتے چلاتے پرویز کے بازو شل ہوگئے تو اس نے کشتی کنارے پر لگادی- شروع میں وہ کچھ افسردہ سا نظر آرہا تھا لیکن اب نشہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں شگفتگی آتی جارہی تھی- تنویر پہلے سے زیادہ DEPRESSED ہوگیا تھا، انور نہ خوش تھا نہ افسردہ، وہ صرف لڑکیوں کو گھورنے میں مشغول تھا- کبھی ایک کو دیکھتا اور کبھی دوسری کو اور پھر کھجلانے میں مشغول ہو جاتا- انگلش گارڈن پر شام محیط ہوتی چلی جارہی تھی اور یہاں کی رونقیں ماند پڑنا شروع ہوگئی تھیں- ہم یہاں سے نکلے اور شوابنگ کے بارونق علاقے میں آگئے- انور اور تنویر واپس ہائم چلے گئے تھے- تنویر نے بقعہ نور بنے ہوئے شوابنگ میں سے گزرتے ہوئے زور سے پاؤں زمین پر پٹکا اور کہا "یہ ہے وہ یورپ جس کے ہم خواب دیکھا کرتے تھے، ہم یہاں رہ کر بھی خواب ہی دیکھتے ہیں!"

یہاں زندگی کی تمام رونقیں اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھیں، یہ سارا علاقہ رنگا رنگ روشنیوں اور نیون سائنوں سے مرکز نگاہ بنا ہوا تھا- مقامی لوگوں کے علاوہ غیر ملکیوں کی ایک بڑی تعداد بھی یہاں گھوم رہی تھی- یہاں بڑے بڑے سٹور بھی تھے اور نائٹ کلب بھی، بار بھی تھے اور سنیک بار بھی- یہاں ہر طرح کے لوگ جمع تھے- ایک کثیر تعداد حیوانیت کے وہ مظاہر دیکھنے کے لئے آئی تھی جو یہاں پر موجود نائٹ کلبوں کا خاصہ ہیں- کچھ لوگ اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ محض ڈرنک اور ڈانس کے لئے یہاں

آئے تھے۔ کچھ فارمل ڈنر کے موڈ میں تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو کسی سنیک بار کے باہر کھڑے "گرم کتوں" HOT DOG ہی سے کام و دہن کی تواضع میں مشغول تھے۔ ایک جگہ ہپیوں کے غول بھی دکھائی دیئے۔ وہ ان سارے ہنگاموں سے بے نیاز اپنی گندڑی میں مست تھے ایک کونے میں ایک خوبصورت گل فروش لڑکی پھول بیچ رہی تھی۔ پرویز اب پوری طرح فارم میں تھا۔ وہ انتہائی خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے لڑکی سے گلدستہ خریدا اور پھر یہی گلدستہ عاشقانہ انداز میں اسے پیش کرتے ہوئے کہا "یہ میری طرف سے تمہارے لئے ہے!" لڑکی کے چہرے پر ایک دلنواز مسکراہٹ ابھری۔ یہ دیکھ کر پرویز نے مجھے کہنی ماری اور کہا "ہن کی کراں؟" (اب کیا کروں؟)

ایک جرمن لڑکی فٹ پاتھ پر چوکڑی مارے گیان دھیان میں مصروف تھی۔ پرویز اس کے ساتھ گھٹنے سے گھٹنا جوڑ کر یوگا کے انداز میں براجمان ہو گیا۔ لڑکی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر شرارت دیکھ کر جرمن میں اسے کہا "یہاں سے اٹھ جاؤ"

"مجھے جرمن نہیں آتی!" پرویز نے بھولا بنتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی دیر چپ رہی، لیکن کچھ دیر بعد اس نے پھر جرمن میں کہا "یہاں سے اٹھ جاؤ"

"مجھے جرمن نہیں آتی"۔

"میں کہتی ہوں یہاں سے فوراً اٹھ جاؤ"۔ اس نے اس بار قدرے درشت لہجے میں کہا۔

"مجھے جرمن نہیں آتی"۔ پرویز نے دونوں ہاتھوں کو بے چارگی سے پھیلاتے ہوئے کہا وہ تھوڑی دیر خاموشی سے اس کے شرارت بھرے چہرے کو تکتی رہی اور پھر اس نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے انگریزی میں چیخ کر کہا "میں کہتی ہوں یہاں سے دفع ہو جاؤ"۔



پرویز کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہو گیا اور ہنستے ہوئے جرمن میں کہنے لگا"۔ میری زندگی کا واحد مقصد تم جرمنوں سے یہ اعتراف کرانا ہے کہ تم انگریزی جانتے ہو۔"

"میرا نام باربرا ہے" ایک کھلے بالوں والی انگور زادی نے اچانک سامنے سے آکر شستہ انگریزی میں مجھ سے تعارف کرایا "اور مجھے ایک کوکا کولا پینی ہے"۔

"تم چاہو تو کھانا بھی کھا سکتی ہو"۔ پرویز نے اس من و سلویٰ کو اسرائیلی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھانا میں کسی اور سے کھا چکی ہوں! اب میری ضرورت صرف کوکا کولا ہے"۔

ہم سامنے والے سنیک بار میں قطار کے لئے بنی ہوئی ریلنگ میں کھڑے ہو گئے اور پھر ایک ایک بوتل ہاتھ میں لئے دوبارہ باہر آن کھڑے ہوئے۔

"میں انڈیا جا رہی ہوں، وہاں مہارشیوں اور جوگیوں سے ملاقات کروں گی، مجھے یقین ہے کہ تم بھی انڈین ہو، اگر میرا خیال درست ہے تو اپنا پتہ لکھاؤ وہاں تم سے ملاقات کروں گی۔ تم تو وہاں بڑے محل میں رہتے ہو گے؟"

میں نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکالا اور اس پر کرشن چندر کا ایڈریس لکھ کر اس دوشیزہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا ایڈریس ہے، سارا انڈیا میرے نام سے واقف ہے میں وہاں کا مشہور افسانہ نگار ہوں۔ تمہیں وہاں رسیو کرتے ہوئے مجھے ولی مسرت ہو گی"۔

کرشن چندر کی طرف سے مجھے شکریے کا خط اگر پہلے موصول نہیں ہوا تو اب وصول ہو جانا چاہیئے۔

"چٹاخ" ایک کونے سے خوفناک طمانچے کی آواز گونجی۔ ایک جرمن نوجوان اپنی محبوبہ کی پٹائی کر رہا تھا۔ "چٹاخ!" ایک اور طمانچہ پھر کچھ گالی گلوچ اور دوشیزہ کا اپنے محبوب کے بال نوچنا وغیرہ۔!

"یہ منظر میرے لیے نیا نہیں ہے، شاید آپ کے لئے نیا ہو"- پرویز نے مجھے بتایا-

"میرے لئے بھی نیا نہیں ہے-امریکہ میں بھی میں نے مردوں کو اسی طرح عورتوں کی پٹائی کرتے دیکھا ہے!"

"مجھے پھر سے پیاس لگنے لگی ہے"- پرویز نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا- غالباً اس کا نشہ کم ہو رہا تھا-

وہ بائیں جانب کے ایک بار میں گھس گیا اور قریباً ایک گھنٹہ بعد واپس آیا، وہ اب بری طرح نشے میں تھا اور اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ایک بوتل اس کے ہاتھ میں بھی تھی

"آئیں ماربن پلاٹس چلتے ہیں!"

"وہاں کیا ہے؟"

"وہاں ایک میکسی ہاؤس ہے!"

"لعنت بھیجو" میں پہلی بار پرویز کے بارے میں مشوش ہوا"- پرویز خود کو سنبھالو، تم یہاں اپنی زندگی برباد کرنے نہیں آئے! تم شب و روز محنت کے باوجود وہیں کھڑے ہو جہاں تمہارے بدخواہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں!"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" اس نے فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اگر آپ نہیں جانا چاہتے تو نہ سہی، چلیں کھانا کھاتے ہیں!"

ہم ایک ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلے تو رات گہری ہو چکی تھی- محبوب سے طمانچے کھانے اور جواباً اس کے بال نوچنے والی لڑکی اب اس کے کاندھوں پر سر رکھے سڑک کے کنارے کنارے جا رہی تھی، اس کے چہرے پر محبت کی سرخوشی اور طمانیت تھی- پرویز کھانے کے بعد بھی برابر پینے میں مشغول تھا- گھر کے قریب پہنچ کر اس نے ایک جگہ اکڑوں بیٹھ کر تے کی اور پھر وہیں زمین پر لیٹ گیا- میں نے دونوں ہاتھوں سے بمشکل اسے اٹھایا اور سہارا دے کر سیڑھیاں طے کراتے ہوئے اس ہال نما کمرے میں لے



گیا- جہاں قطار اندر قطار بچھی ہوئی چارپائیوں پر زندہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں- ایک کونے سے سسکیوں کی آواز آرہی تھی- رونے والے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپایا ہوا تھا- اس نیم تاریک کمرے میں کسی کا چہرہ بھی روشن نہیں تھا- میں نے پرویز کو اس کی چارپائی پر لٹایا اور بابے دی ہائم سے نکل کر FELD HUTTER میں چلا آیا-

صبح ٹیلیفون کی گھنٹی بجی "گوٹن ٹاگ" (صبح بخیر) دوسری طرف ہوٹل کا کوئی ملازم تھا

"داغ ٹراخ چٹاخ ڈزن ڈزن" وہ جرمن میں کچھ کہہ رہا تھا- اس نے تو خدا جانے کیا کہا تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا جیسے "داخ ٹراخ چٹاخ ڈزن ڈزن" کہہ رہا ہو...... یہ لوگ امن کے دنوں میں بھی توپیں داغنے سے باز نہیں آتے-

"آئی ڈونٹ نو جرمن" میں نے "اتحادیوں" کی طرف سے اس "جارحیت" کا انگریزی میں جواب دیا-

تھوڑی دیر تک محاذ پر خاموشی رہی اور پھر کسی دوسرے شخص نے ٹیلیفون اٹھایا-

"سر، آپ ناشتے میں کیا پسند کریں گے؟"

"دو انڈے، سلائس، چائے اور دودھ کا ایک گلاس"-

"سر! آپ کو ہمارا بیکن (سور کا گوشت) بھی بہت پسند آئے گا"-

مجھے یہ بیکن تو کیا پسند آنا تھا- اسے غالباً میرا جواب بھی پسند نہیں آیا کیونکہ اس نے ریسیور رکھ دیا تھا-

ویٹر کمرے میں ناشتہ رکھ کر جا رہا تھا کہ ایک بار پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی "پیارے کیا حال ہے؟" یہ انور تھا اور اس وقت خاصی بے تکلفی کے موڈ میں تھا-

"ارے تم صبح صبح کہاں سے ٹپک پڑے؟"

تھوڑی دیر تک ادھر سے کوئی جواب نہ آیا، بس سسکاریاں سی سنائی دیتی رہیں، غالباً وہ کھجلانے میں مصروف ہو گیا تھا-

"مجھے پرویز نے تمہیں فون کرنے کیلئے کہا ہے- وہ تیار ہو رہا ہے- تم بھی فوراً تیار ہو جاؤ- ہم "ٹیگرن سی" (TEGERN SEE) جارہے ہیں اور وہاں سے کل لوٹیں گے، تم چاہو تو ہوٹل چھوڑ دو کیونکہ کل تمہیں استنبول کے لئے روانہ ہونا ہے"- بالآخر اس کی آواز سنائی دی-

"یہ ٹیگرن سی کیا چیز ہے اور بیٹھے بٹھائے یہ پروگرام کیسے بن گیا؟"

"ٹیگرن سی یہاں سے قریباً پچاس کلو میٹر دور ایک انتہائی خوبصورت صحت افزاء مقام ہے- میونخ کا طبقہ امراء یہ سیزن وہیں گزارتا ہے- وہاں پرویز کے ایک دوست بانس کی سووینئرز کی دکان ہے- ہم اس کے ہاں ٹھہریں گے- اتفاق سے پرویز کا باس بھی آج ادھر ہی جارہا ہے- ہم بڑے آرام سے اس کی کار میں چلے جائیں گے- پرویز نے اس سے بات کرلی ہے-"

"کیا اس کے لئے مجھے بابے دی ہائم آنا پڑے گا"-

"نہیں تم یہیں ٹھہرو، ہم تمہارے پاس آرہے ہیں"-

ٹیلیفون بند کرکے میں نے جلدی سے ناشتہ کیا اور پھر ہوٹل کے قریب واقع جنرل پوسٹ آفس چلا گیا جہاں میں نے اباجی کو خیریت کا خط لکھا اور استنبول میں اپنے دوست منور کو اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع کرنے کے لئے تار دیا- واپسی پر میں نے اپنا سامان پیک کیا اور بلوں کی ادائیگی کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا- انہوں نے آنے میں کافی دیر لگادی تھی-

"آف ویدر زین AUF WIEDER SEIN" کاؤنٹر کلرک نے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ مجھے "خدا حافظ" کہا اور میں پرویز اور انور کے ساتھ باہر نکل آیا-

کار میں پرویز کا باس ایک بازو کھڑکی پر جمائے سگریٹ کے کش لگانے میں مصروف تھا- اس کی عمر چالیس بیالیس کے قریب تھی اور جسم پھولا پھولا سا تھا- بھوری رنگت پر



بھوری مونچھیں، بالکل بھالو لگ رہا تھا-

"گوٹن مارگن" میں نے اس کے قریب پہنچ کر دس بجے کے بعد کا جرمن سلام کیا- اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور پھر اپنے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "بیمن زی پلیٹنر بٹے" (تشریف رکھیئے)

پرویز اور انور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے- تھوڑی دیر بعد کار شہر کی حدود سے نکل کر ہائی وے پر آگئی-

"مجھے تمہارے دوست نے بتایا ہے کہ تم صحافی ہو- تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی" بھالو نے اپنے "مترجم" پرویز کی وساطت سے خیر سگالی کے یہ جذبات مجھ تک پہنچائے-

"کیا اسے واقعی انگریزی نہیں آتی یا یہ بھی پوز کررہا ہے؟" میں نے پرویز سے پوچھا اور پھر تصدیق کے بعد کہا "میری طرف سے جو کچھ کہنا چاہو کہہ دو"- سو پرویز نے جی میں جو آیا اس سے کہہ دیا-

"جب پرویز نے مجھے بتایا کہ تم صحافی ہو تو میں ڈر گیا- ہم جرمن لوگ صحافیوں سے بہت ڈرتے ہیں"- اس نے خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گپ شپ کا آغاز کیا-

"صحافیوں سے ڈرنے کی کیا بات ہے؟" میں نے بھی اسی "ٹون" میں پوچھا-

"دراصل ہم لوگ اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں پر بہت جلد ایمان لے آتے ہیں اور اس لئے اپنے معاملے میں بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں کل کلاں ہمارے بارے میں بھی کوئی اسکینڈل اخبار میں شائع ہو جائے اور لوگ اس پر ایمان لے آئیں- اس سلسلے میں جرمن لطیفہ بہت اچھا ہے، سنو گے؟"

"سناؤ"- مجھے یہ شخص خاصا دلچسپ لگا تھا-

"ایک شیر جنگل میں سو رہا تھا کہ ایک بندر ادھر آنکلا اور اس نے جنگل کے بادشاہ کو سوتے دیکھ کر بے ادبی کرنے کی کوشش کی- اس پر شیر کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس کے پیچھے

بھاگا- بندر بھاگتا ہوا ایک پارک میں گھس گیا- جہاں لوگ بنچوں پر بیٹھے اخبار پڑھنے میں مشغول تھے- بندر نے بھی ایک اخبار پکڑا اور ان کے درمیان بیٹھ گیا- اتنے میں شیر ہانپتا ہوا وہاں پہنچا اور بندر کی پشت کی جانب کھڑے ہو کر پوچھا:

"تم نے یہاں کوئی بندر تو نہیں دیکھا؟"

"تم اس بندر کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے، جس نے شیر کے ساتھ بے ادبی کی ہے؟" بندر نے اخبار چہرے کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا-

اس پر جنگل کے بادشاہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا

"بیڑہ غرق کیا یہ خبر اخبار میں بھی شائع ہو گئی ہے؟"

اس پر ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑے-

"تمہارا دوست بہت اچھا شخص ہے- انتہائی محنتی اور دیانتدار ہے"- بھالو نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا- اس کا اشارہ پرویز کی طرف تھا-

"یہ تو مجھ سے پوچھو"- انور نے مجھے مخاطب کر کے ہنستے ہوئے پنجابی میں کہا- "یہ محنتی تو یقیناً بہت ہے لیکن بکرے کی ران جو ڈاشر ریستوران کی سب سے مہنگی ڈش ہے نہ صرف یہ کہ روزانہ چوری چھپے پوری کی پوری کھا جاتا ہے بلکہ ہائم کے تمام مکینوں کو ڈبل روٹی مکھن اور انڈوں وغیرہ کے علاوہ بکرے کی ران والے راشن میں بھی اپنے ساتھ برابر شریک کرتا ہے- کئی دفعہ یہ سیروں کے حساب سے دودھ اور دہی بھی سپلائی کرتا ہے اور اوپر سے کہتا ہے کہ نیک کام کر رہا ہوں- اس کے مالک کو پتہ چلے تو ابھی چلتی گاڑی سے اسے نیچے پھینک دے"-

گاڑی ہائی وے سے اتر کر ایک بل کھاتی چھوٹی سڑک پر آ گئی تھی- یہ سڑک دونوں طرف سے درختوں میں گھری ہوئی تھی اور ان کی شاخوں نے سائبان کی طرح سڑک پر سایہ کیا ہوا تھا- اب قدرے چڑھائی شروع ہو گئی تھی اور پھر تھوڑی دیر بعد ہم ٹیگرن سی



میں تھے- مجھے یہاں پہنچ کر یوں لگا جیسے جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں- تاحد نظر پھیلی ہوئی وسیع و عریض "جھیل" کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کے سلسلے تھے جو پھولوں سے لدے ہوئے تھے- اگرچہ یہ جگہ زیادہ بلندی پر نہ تھی اس کے باوجود یہاں اچھی خاصی خنکی تھی- پرویز کے باس نے اس کے اشارے پر ایک جگہ کار کھڑی کر دی اور ڈکی سے سامان نکال کر "دانکے ویل" (شکریہ) کہتے ہوئے ہم رخصت ہونے لگے تو اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "اگر تم چاہو تو آج رات میری کاٹیج میں بسر کر سکتے ہو!" میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس کی کار خاموش وادی کی پرسکون فضاؤں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتی نظروں سے اوجھل ہو گئی-

اب ہم اس پرسکون بستی کے چھوٹے سے بازار میں تھے- یہاں لکڑی کی بنی ہوئی دکانیں تھیں اکاؤکا لوگ باسکٹ ہاتھ میں لئے سودا سلف خریدنے میں مشغول نظر آتے تھے- ایک دکان پر ویو کارڈز اور اس وادی سے متعلق سوونیئرز شوکیس میں سجے ہوئے تھے اور اندر پچیس چھبیس سال کا ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا- یہ ہانس تھا- وہ پرویز کو دیکھتے ہی آگے بڑھا اور کہا.......... یہ ٹھیٹھ پنجابی میں ایک موٹی گالی تھی اور بعد میں پتہ چلا کہ یہ سکھانے والا خود پرویز ہی ہے!

تعارف پر اس نے مجھ سے اور انور سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر دکان بند کر کے ہمارے ساتھ جھیل کے کنارے چلا آیا- اس کی اس حرکت پر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں-

"مجھے تو یہ شخص اپنی عادات سے پاکستانی لگتا ہے- میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ یورپ میں کوئی شخص اپنے کسی دوست کی آمد پر یوں دکان بند کر کے اس کے ساتھ چل پڑے"-

میں نے پرویز سے کہا-

"آپ ٹھیک کہتے ہیں، یہ آدھا پاکستانی ہے، اسے یوں بھی پاکستان اور پاکستانیوں سے عشق ہے، یہ کہتا ہے کہ جب تم پاکستان واپس جاؤ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جانا، میں وہیں آباد ہونا چاہتا ہوں۔ خصوصاً جب سے میں نے اسے بتایا ہے کہ وہاں چرس وافر مقدار میں اور قریباً مفت ملتی ہے تو یہ کہنے لگا ہے کہ جلد پاکستان چلو ورنہ تمہارے غیر قانونی قیام کے بارے میں پولیس کو مطلع کر دوں گا"۔

جھیل کے کنارے ایک ریستوران تھا اور اس کے ساتھ ساتھ دور دور تک کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، جن پر رنگین سائبان تنے ہوئے تھے۔ یہاں بہت رونق تھی اور شہر کے ہنگاموں سے بچ کر اس وادی میں سکون کے چند لمحات گزارنے کے لئے آئے ہوئے لوگ اپنے بیوی بچوں اور پیاروں کے ساتھ کرسیوں پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

"کیا پیو گے؟" ہانس نے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا۔

"اب جو بھی پلاؤ گے پی لوں گا"۔ مجھے مسرت ہوئی تھی کہ جرمنی میں ایک شخص تو ایسا ملا جو غلاموں کے ساتھ ان کی زبان میں بات کر سکتا ہے۔

"ویسے میرا جی چائے پینے کو چاہ رہا ہے!" میں نے اسے بتایا۔

"اور تم؟" اس نے انور سے پوچھا۔

"کوئی ٹھنڈی چیز پلاؤ"۔ اس نے کھجلاتے ہوئے کہا۔ دراصل اسے اندرون لوہاری کے حکیم نور احمد نے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ ٹھنڈی چیزوں کا استعمال کرے۔

"تم سے تو پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں"۔ ہانس نے پرویز کی طرف مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ویٹر کو چائے اور جوس کے علاوہ "ام الخبائث" کا آرڈر دے دیا۔

ایک گھنٹے کی مسلسل مے نوشی کے بعد پرویز اور ہانس چہکنے لگے، خصوصاً پرویز ایک بار پھر مختلف روپ میں نظر آنے لگا تھا۔

"تمہارے باس کا کیا حال ہے؟" ہانس نے اس سے پوچھا۔



"ہم اسی کے ساتھ یہاں آئے ہیں، کل واپسی بھی اسی کے ساتھ ہو گی"۔

"یہ تمہارا باس کیسا آدمی ہے؟ مجھے تو بہت شریف سا انسان لگا ہے!" میں نے پرویز سے پوچھا۔

"یہ اتنا ہی شریف ہے جتنا میں ایماندار ہوں"۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "میں سارے ریستوران میں سب سے زیادہ محنت کرتا ہوں مگر یہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے سب سے کم پیسے دیتا ہے!"

"تم اس کے ہاں معمولی سے ملازم ہو مگر میں نے دیکھا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ برابری کا سلوک کر رہا تھا، پھر اس نے میرے ساتھ ہی خاصے حسن سلوک کا مظاہرہ کیا ہے، خدا جانے تم یہ بات کیسے کہہ رہے ہو؟"

"پاکستان اور یورپ کے سرمایہ دار میں یہی فرق ہے"۔ پرویز نے کہا "یہ لوگ حتی المقدور مزدوروں کی عزت نفس مجروح نہیں ہونے دیتے کیونکہ انہیں ماہرین نفسیات نے بتایا ہے کہ اس صورت میں تم ان سے زیادہ کام لے سکتے ہو اور پھر سوشلزم کے خوف نے بھی انہیں کافی سیدھا کر رکھا ہے چنانچہ اب یہاں "ہنس مکھ سرمایہ داری" نافذ ہے۔ باقی آپ کے ساتھ خوش کلامی کی ایک وجہ وہ بھی تھی جو اس نے بندر اور شیر والے لطیفے میں خود ہی بیان کر دی تھی، ورنہ وقت آنے پر یہ کسی سے کم سور نہیں ہے"۔

برابر والی میز پر ایک ادھیڑ عمر جرمن اور اس کی بیوی کھانا کھا رہے تھے۔ مرد نے کھانا کھاتے ہوئے جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھا اور زور سے "سوں" کیا۔ یہ "سوں" کی آواز اس قدر زوردار تھی کہ ہم لوگوں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے ایک بار پھر "سوں" کیا پھر وہی رومال جیب میں ڈال کر پہلے جیسی یکسوئی کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔

"یہ جرمن قوم بھی خالص جٹ ہے"۔ پرویز نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ رکھ رکھاؤ

اور آداب محفل کا کم ہی خیال رکھتے ہیں"۔

"سوں" ایک بار پھر مرد نے ناک سنکی اور اب کے گھن گرج پہلے سے زیادہ تھی۔ اس بار میری ہنسی چھوٹ گئی۔

جب اس نے تیسری بار یہی حرکت دہرائی تو پرویز اپنی جگہ سے اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا اس کی میز کی طرف گیا اور کہا "اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بار پھر اپنے فن کا مظاہرہ کریں۔ میرا دوست آپ کی اس پرفارمنس سے بہت محظوظ ہوا ہے"۔

مرد نے برا سا منہ بنایا اور پھر خاموشی سے کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ وہ غالباً جان گیا تھا کہ یہ مرد ناداں اس وقت نشے میں ہے۔

"پرویز! تم اپنی ان حرکتوں سے کسی دن بری طرح پٹو گے"۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پٹو گے کیا مطلب؟ یہ ایک مرتبہ بری طرح پٹ چکا ہے"۔ ہانس مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ایک دن یہ شراب میں بری طرح دھت تھا۔ ہاٹم سے نکلا اور سڑک پر اسے جو پہلی لڑکی نظر آئی اسکے گالوں پر پٹاخ پٹاخ شروع ہو گیا۔ یہ جو اس کے سر کے ایک حصے سے بال اڑے ہوئے ہیں، یہ اسی واقعے کا شاخسانہ ہے"۔

"پاکستان میں تو یہ ایسا نہیں تھا"۔

"یہاں بھی یہ جب تک ہوش میں ہو بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ البتہ اس کے بعد اس کے بارے میں کوئی پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی۔ ایک بار اس کے اصرار پر میں نے ایک لڑکی سے اس کی ڈیٹ طے کی۔ اگلے روز وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اپنے دوست کو سمجھاؤ کہ ڈیٹ پر کپڑے پہن کر آیا کرتے ہیں"۔

اس پر پرویز نے بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا "اس کی باتوں پر یقین نہ کرنا۔ اب یہ بالکل من گھڑت بکواس پر اتر آیا ہے"۔

"میں جو کچھ کہوں گا خدا کو حاضر ناظر جان کر کہوں گا۔ ہانس نے عدالت کے حلفیہ



بیان کی طرح ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اس کی ان حرکتوں کی تفصیل تو ابھی میں نے بیان ہی نہیں کی۔ ہمارے ہاں ایک لطیفہ ہے اور وہ غالباً اسی کے بارے میں ہے...... کیا تم سننا پسند کرو گے؟"

"سناؤ" میں نے اس کے انداز بیان سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"اسی طرح کے ایک نوجوان نے اپنے دوست سے کہا کہ میں ایک لڑکی پر بری طرح عاشق ہو گیا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر وہ گھاس نہیں ڈالتی، وہ بھی اسی رائڈنگ کلب کی ممبر ہے جس کا میں رکن ہوں چنانچہ روزانہ اسے دیکھتا ہوں اور روزانہ دل پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ دوست نے پوچھا اس کی آنکھیں کس رنگ کی ہیں؟ عاشق زار نے بتایا کہ نیلے رنگ کی ہیں۔ اس پر دوست نے مشورہ دیا کہ تم اپنے گھوڑے کو نیلا رنگ کرالو۔ چونکہ گھوڑا کبھی نیلے رنگ کا نہیں ہوتا اس لئے وہ دیکھ کر چونکے گی اور پھر تم سے پوچھے گی کہ تم نے اسے نیلا رنگ کیوں کرایا ہے؟ اس کے جواب میں تم کہنا کہ چونکہ تمہاری آنکھیں نیلی ہیں اور مجھے تم سے پیار ہے، اس لئے میں نے وارفتگی کے عالم میں اپنے گھوڑے کا رنگ بھی نیلا کر لیا ہے۔ اس پر وہ تمہاری طرف مائل ہو گی، پھر رفتہ رفتہ تم ایک دوسرے کے قریب آتے جاؤ گے اور پھر ایک دن مناسب موقع دیکھ کر اسے کہہ دینا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے قوی توقع ہے کہ وہ انکار نہیں کرے گی۔

اس نوجوان نے یہ مشورہ پلے باندھا اور گھوڑے کو نیلا کرا کے دوشیزہ کا انتظار کرنے لگا۔ لڑکی نے وہ گھوڑا دیکھا تو حیران ہوئی، اس کے پاس آئی اور پوچھا "تم نے گھوڑے کو نیلا رنگ کیوں کرایا ہے؟" یہ سن کر نوجوان نے عالم اضطراب میں اسے کاندھوں سے پکڑا اور کہا "کیونکہ میں نے تم سے شادی کرنی ہے؟"

"تم باز آجاؤ، نہیں تو میں بھی تمہاری عجوبہ روزگار باتیں انہیں بتادوں گا"۔ پرویز نے ہمارے ساتھ ہنسی میں شریک ہوتے ہوئے کہا "میں انہیں بتاؤں گا کہ تم نے بے شمار

لڑکیوں کی خواہش کو ٹھکراتے ہوئے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی"۔

"بتادو، اس میں چھپانے کی کون سی بات ہے"۔

"تو پھر سنو" پرویز نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "ہانس کہتا ہے کہ میں اس لڑکی سے شادی کروں گا جس نے کبھی کسی غیر مرد کے فلیٹ میں رات بسر نہ کی ہو۔ پاکستان سے محبت اور وہاں آباد ہونے کی شدید خواہش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا خیال ہے وہاں ایسی عورتیں مل جاتی ہیں"۔

"کیا پرویز سچ کہتا ہے؟" میں نے حیرت زدہ نظروں سے ہانس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! لیکن اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے" اس نے یوں پوچھا جیسے اس میں حیران ہونے کی واقعی کوئی بات نہیں۔

"مجھے واقعی حیران نہیں ہونا چاہئے"۔ میں نے اس دلچسپ خواہش سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "کیونکہ جب تم ہماری خاطر دکان بند کر کے چلے آئے تھے اس پر پرویز نے میرے اچنبھے پر بتایا تھا کہ یہ شخص اپنی عادات سے آدھا پاکستانی ہے لیکن تمہاری یہ بات سن کر میرا خیال ہے کہ تم آدھے نہیں پورے پاکستانی ہو۔ ہم پاکستانی مرد بھی ساری عمر کاسانووا کی طرح گزارنے کے بعد شادی کے لئے کوئی مریم تلاش کرتے ہیں۔ تم یورپ میں ہمارے واحد نمائندے ہو"۔

"واحد نہیں، بلکہ اس جیسے اور بھی بے شمار لوگ یورپ میں موجود ہیں، جو اس جوہڑ میں کنول کے پھول تلاش کرتے ہیں اور کئی ایک کو تو واقعی مل بھی جاتے ہیں!" پرویز نے کہا۔

اس اثناء میں سامنے والی میز پر بیٹھے ادھیڑ عمر جوڑے نے کھانا ختم کر لیا تھا۔ مرد نے بل ادا کرنے کے بعد اپنی میز سے اٹھتے ہوئے زور سے کھنکار کر اپنی طرف متوجہ کیا اور



جب ہم نے ادھر دیکھا تو اس نے پرویز پر ایک ستم ظریفانہ نگاہ ڈالتے ہوئے جیب میں سے رومال نکالا اور ناک پر رکھ کر پوری قوت سے "سوں" کر کے دوبارہ جیب میں ڈال لیا اور پھر اپنی بیوی کا بازو تھام کر گھنے درختوں میں سے گزرنے والی پگڈنڈی میں گم ہو گیا!

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کافی دیر تک بوٹنگ کرتے رہے۔ جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ دیر تک لکڑی کے چھوٹے چھوٹے خوشنما گھر بنے ہوئے تھے جن کے مکین باہر بنچوں پر بیٹھے تھے۔ سرسبز شاداب پہاڑوں کے دامن میں سے گزرتی ہوئی جھیل کی سیر کرتے ہوئے ہم دور تک نکل گئے حتیٰ کہ واپسی پر شام ہو گئی، سورج غروب ہونے کا منظر کچھ ایسا دلفریب تھا کہ ہمارے سمیت بہت سے لوگ اس منظر میں کھوئے ہوئے تھے۔ واپسی پر ہانس کی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے ہم چھوٹی سی سڑک کے دونوں طرف بنے ہوئے خوبصورت مکانوں کو دیکھ رہے تھے جو سبز بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ لان رنگ برنگے پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان مکانوں کے جن حصوں میں پھول اگانے کی گنجائش نہ تھی وہاں گملوں میں پھول سجادیئے گئے تھے۔ پھولوں کی اس وادی میں تھوڑی دیر بعد چاند اتر آیا تھا۔ اور چاند جیسے چہرے گھنے درختوں کے تاریک سایوں میں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد یوں نمودار ہوئے جس طرح بدلیوں کی اوٹ میں سے چاند نکلتا ہے۔ ذرا آگے چل کے ہم بائیں جانب ایک پگڈنڈی پر مڑ گئے۔ یہ ایک کھلا جنگل تھا جو چاروں طرف سے رنگ برنگے پتوں والے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔

"آج کی رات کیلئے میرا گھر اس جنگل میں ہے۔" ہانس نے سامنے ایک خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کل میرا یہ خیمہ کسی اور جگہ نصب ہو گا اور پرسوں تم اسے کہیں اور دیکھو گے۔"

"جہاں تک میں جانتا ہوں، یورپ میں مخصوص مقامات کے علاوہ کہیں خیمے نصب کرنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"مجھے بستی کے سارے لوگ جانتے ہیں-وہ بھی جن کا کام محاسبہ کرنا ہے- مجھے پرویز نے بتایا تھا کہ پاکستان میں سب چلتا ہے، تم لوگوں کو یہ علم نہیں کہ کچھ نہ کچھ یہاں بھی چلتا ہے-"

ہم گردن نیہوڑا کر خیمے میں داخل ہوگئے-

"مجھے ایک بستر ہمیشہ فالتو رکھنا پڑتا ہے تاکہ شادی کیلئے مطلوبہ لڑکی تک کبھی رسائی نہ ہو سکے-" ہانس نے ہنستے ہوئے کہا-" تاہم آج کی رات میرے خیمے میں ایک کی بجائے اکٹھے تین مہمان ہوں گے- آؤ-"

میں نے خیمے کا جائزہ لیا، اس میں تین افراد تو بخوبی سما سکتے تھے-البتہ چوتھے کا مستقبل خاصا مخدوش تھا-

"میں باہر کھلے آسمان میں پتوں کے بچھونے پر سوؤں گا-" میں نے ہانس سے کہا-

"رات کو خنکی اتنی بڑھ جائے گی کہ صبح جولاہے کے جوائی کی طرح ہنستے پائے جاؤ گے"-انور نے مسکراتے ہوئے مجھے صحیح صورتحال سے آگاہ کیا-

"مجھے خنکی پسند ہے"-میں نے کہا اور کھڑکھڑاتے پتوں پر بیٹھ گیا-

"تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہی سوؤں گا، مجھے حکیم نے ٹھنڈی......"

"کھرک!" میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے لیکن پیشتر اس کے کہ میں کوئی عذر تراش کر اسے خیمے میں سونے پر مجبور کرتا، پرویز میری کمک کو پہنچا اور اس نے کہا "مجھے عطا صاحب سے ضروری باتیں کرنا ہیں، تم اندر ہانس کے ساتھ سو جاؤ"-

پرویز کی آنکھیں نشے سے بوجھل ہو رہی تھیں اور زبان لڑکھڑا رہی تھی-

ہانس نے ایک بستر اور کمبل خیمے سے لاکر باہر بچھا دیا-بستر تو اس کے پاس فالتو تھا کمبل اس نے اپنے مہمانوں کے لئے "سرنڈر" کر دیا تھا-میں نے ایک بار پھر سوچا کہ یہ شخص پاکستانی ہے اور اس کا نام ہانس نہیں بلکہ عبدالشکور وغیرہ ہے!



"آپ صبح واقعی استنبول جا رہے ہیں؟" پرویز نے میرے برابر لیٹتے ہوئے کہا اس کی آواز میں گہرے غم کی جھلک نمایاں تھی-ہانس اور انور خیمے میں چلے گئے تھے-

"ہاں؟"

"پھر وہاں سے پاکستان جائیں گے؟"

"ہاں!"

"اس عرصہ میں آپ کے اباجی اور بہن بھائی آپ کے لئے اداس ہو گئے ہوں گے؟"

"ہاں!" میں نے اس کے لہجے کے کرب کو محسوس کر لیا تھا، سو میں نے موضوع بدلنے کے لئے کہا "تمہیں مجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں"-

"ہاں!" اب کے میری بجائے اس نے یہ گونگا لفظ ادا کیا اور پھر کروٹ بدل کر اپنے بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے اور اپنا سر میرے سینے میں چھپا لیا-میں نے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ کچھ کہے بغیر اپنا آپ مجھ میں چھپائے سو گیا تھا-

اگلے روز پرویز اور انور استنبول کو جانے والی اورینٹ ایکسپریس میں مجھے سوار کرانے کے لئے سٹیشن پر موجود تھے- گاڑی چلنے کو تھی-انور نے کہا "اگر میرے گھر والے میرے بارے میں پوچھیں تو انہیں بتانا کہ وہ وہاں بہت ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہا ہے-اس کے پاس بھی کار ہے، ٹیلیویژن ہے، ریفریجریٹر ہے اور وہ ائرکنڈیشنڈ مکان میں رہتا ہے- انہیں "بابے دی ہائم" کے بارے میں کچھ نہ بتانا"-

پرویز نے مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا "میرے بارے میں تم سے کوئی دریافت نہیں کرے گا اور اگر کوئی پوچھے تو بتا دینا کہ وہ وہاں بھی بابے دی ہائم ہی میں رہتا ہے"-

گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے لگی تھی اور میں نے بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا تو لگا بابے دی ہائم کے سارے مکین پلیٹ فارم پر جمع ہیں-ان کی زبانیں ساکت تھیں اور چہرے بول رہے تھے"-بابے دی ہائم کی دیواریں اور چھتیں خستہ

ہو گئی ہیں۔یہ عمارت منہدم ہونے والی ہے۔ہم زیادہ دیر تک بے گھر نہیں رہیں گے۔وہ ہمیں زیادہ دیر تک ہمارے گھروں سے دور نہ رکھ سکیں گے۔ہم اپنے گھروں کو لوٹیں گے، ہم اپنے وطن کو لوٹیں گے"۔



# میونخ سے استنبول تک

اور اب میری منزل میونخ سے استنبول تھی۔میں نے چودہ پونڈ کا ٹکٹ خریدا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔کمپارٹمنٹ میں میرے علاوہ کل تین چار مسافر تھے۔ان میں سے ایک خوبرو ترک نوجوان تھا جس کے چہرے پر مونچھوں کی ایک پتلی سی لکیر پھیلتی چلی گئی تھی۔غالباً وہ بھی جرمنی میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد واپس اپنے وطن جا رہا تھا۔جرمنی کی حکومت سے ایک معاہدے کے تحت ترکوں کی ایک بہت بڑی تعداد جرمنی میں داخل ہوتی ہے اور مارک کما کر واپس اپنے وطن چلی جاتی ہے۔اس کی طرح باقی مسافر بھی "باقاعدہ ٹورسٹ" نہیں تھے بلکہ لگتا تھا کسی وقتی ضرورت کے تحت سفر کر رہے ہیں۔اس کا اندازہ ان کے مضطرب چہروں سے ہوتا تھا۔سیاح کے چہرے پر رستے کی تمام صعوبتوں کے باوجود ایک اطمینان، آسودگی اور سرخوشی کی سی کیفیت ہوتی ہے جبکہ عام مسافر آرام دہ سفر میں بھی خود کو بے آرام محسوس کر رہا ہوتا ہے اور اس کا اظہار اس کی بڑبڑاہٹ کے علاوہ اس کے چہرے سے بھی ہو جاتا ہے۔استنبول بہت دور تھا۔مجھے وہاں تک پہنچنے کے لئے دن اور رات کے طویل لمحے ٹرین ہی میں بسر کرنا تھے۔استنبول بہت دور تھا مگر وہ میرے دل کی دھڑکنوں میں تھا۔میں یہاں پہلے بھی کچھ روز قیام کر چکا تھا اور پاکستان کے لئے ترکوں کی گرمجوشی اور محبت کی آنچ نے مجھے پگھلا دیا تھا۔انہیں پاکستانی مسلمانوں سے شدید محبت ہے اور اس کا عملی ثبوت ترکی کی حدود میں قدم رکھتے ہی مل جاتا ہے۔طویل سفر کے مدنظر میں نے اپنا سامان بحفاظت اوپر کی برتھ پر جما دیا اور پھر شلوار قمیض پہن کر

"آرام دہ" ہو گیا- مجھے یہاں کوئی "ہم زبان" نظر نہ آتا تھا- میرے بائیں جانب بیٹھے ہوئے دو ادھیڑ عمر مسافر آپس میں مصروف گفتگو تھے بلکہ ان میں سے ایک مصروف گفتگو تھا اور دوسرا سعادت مند سامع کی طرح ایک عرصے سے اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا- ان کی زبان میری سمجھ سے ماوراء تھی- سامنے بیٹھے ہوئے ترک نوجوان نے ایک کتاب کھول رکھی تھی جو غالباً ترکی زبان میں تھی اور وہ پوری محویت سے اس کے مطالعے میں مصروف تھا- میں نے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا- وہ ایک وجیہ و جمیل نوجوان تھا بلکہ اسے مردانہ حسن کا ایک مکمل نمونہ کہا جا سکتا تھا (یہ ترک ہوتے ہی ایسے ہیں!) اس کے برابر بیٹھا ہوا جو کوئی بھی تھا، وہ سب سے بے نیاز گہری نیند میں مبتلا تھا- خراٹے زندگی میں بہت سے سنے ہیں مگر وہ اس ضمن میں صاحب اسلوب تھا!

کچھ دیر قبل آسٹریا کی حدود شروع ہو گئی تھیں اور آسٹروی امیگریشن عملہ پاسپورٹ وغیرہ چیک کر کے اور اس پر ٹرانزٹ ویزے کی مہر لگا کر رخصت ہو چکا تھا- میں نے باہر جھانک کر دیکھا- گاڑی آسٹریا کے خوبصورت پہاڑوں اور وادیوں میں سے گزر رہی تھی- یہ پورا علاقہ پھولوں سے لدا ہوا تھا- ٹرین ہیبت ناک وہسل کے ساتھ ایک طویل سرنگ میں داخل ہوئی- اس دوران یہ گل پوش وادیاں تھوڑی دیر کے لئے نظروں سے اوجھل ہوئیں مگر دوسرے ہی لمحے یہ دلربا مناظر ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے تھے- ٹرین کی گڑگڑاہٹ نے اس حسین وادی کی حیران خاموشیوں میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا- ان سیال لمحوں میں مجھے "اس" کی یاد آئی اور اس کے وہ تمام خطوط بھی جو اس نے لاہور سے مجھے لکھے تھے اور واپس آ جانے پر زور دیا تھا- اس کے ساتھ ہی وہ آخری خط بھی جس میں اس نے دل برداشتہ ہو کر لکھا تھا کہ اس کے تمام خط ضائع کر دوں، مگر میں یہ خطوط ضائع نہیں کر پایا تھا- مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ میں وہ خطوط اپنے ہاتھوں سے چاک کر دوں جو محبت کی گہری روشنائی سے لکھے گئے تھے- تب میں نے دل کے خاموش زینوں



پر اداسی کی چاپ محسوس کی اور میں ان خیالوں میں کھو گیا- جو پچھتاووں کے سوا کچھ نہیں دیا کرتے- میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اٹیچی کیس میں سے وہ پیکٹ نکال کر واپس اپنی نشست پر بیٹھ گیا- جس میں "اس" کے خطوط محفوظ تھے اور پھر میں ایک ایک کر کے یہ خط پڑھتا چلا گیا- ان لمحوں میں مجھے یوں لگا کہ نرم و نازک جذبے مجھ پر محیط ہو گئے ہیں اور میں ان کی چھاؤں میں زندگی کے تپتے صحرا سے بہت آگے نکل گیا ہوں- میں نے یہ خط آخری بار پڑھے- پھر جیب میں سے قلم نکالا اور ہر خط کے اختتام پر درج اس پردہ نشین کے نام پر سیاہی پھیر دی- ٹرین پھولوں کی وادی میں سے گزر رہی تھی- سو میں نے یہ پھول جذبے ایک مقام پر فضاء میں اچھال دیئے- مجھ میں آج بھی انہیں چاک کرنے کی سکت نہیں تھی- پہاڑوں کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں اور میں اس پردہ نشین کی یہ امانت ان کے سپرد کر رہا تھا-

انجن نے ایک دلدوز چیخ ماری- گاڑی ایک بار پھر گھپ اندھیروں کے غار میں داخل ہو گئی-

سامنے بیٹھے ہوئے ترک نوجوان کے چہرے پر اب اکتاہٹ کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے- لگتا تھا کہ کتاب اس کی رفیق ثابت نہیں ہو سکتی چنانچہ اس نے یہ کتاب ایک طرف رکھی اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا- وہ پیکٹ جیب میں ڈالنے ہی کو تھا کہ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور پھر اس نے مسکراتے ہوئے یہ پیکٹ میری طرف بڑھا دیا- میں نے اس میں سے سگریٹ نکالا اور ابھی سلگانے ہی کو تھا کہ نوجوان نے آگے بڑھ کر ماچس جلائی میں نے شکریہ ادا کرنے کے لئے ترکوں کے روایتی انداز میں اس کے ماچس والے ہاتھ کو تھپتھپایا اور کش لے کر اپنی نشست کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا-

"پاکستان؟" اس نے گفتگو کا آغاز کرنے کے لئے میری قومیت کے بارے میں اپنے اندازے کا اظہار کیا- دیار غیر میں پاکستانی، ترکوں کو اور ترک پاکستانیوں کو عموماً پہچان لیتے

ہیں-شاید اس لئے کہ تلاش معاش کی خاطر یورپ جانے والے پاکستانی ترکی سے گزر کر ہی اپنی منزل مقصود کو پہنچتے ہیں-

''پاکستان''میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا-

''مسلمان؟''اس نے میرے تجربے کے عین مطابق دوسرا سوال کیا-

''مسلمان''میں نے جواب دیا-

''الحمدللہ''اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے اور پھر اس نے حسب توقع ''کاروش-کاروش''(بھائی، بھائی) کہتے ہوئے مجھے سینے سے لگالیا-

''عطا!''میں نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا اور ہاتھ کے سوالیہ اشارے سے اس کا نام پوچھا!

''احمت!''(احمد) اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن کو خم دیتے ہوئے جواب دیا-

اتنی گفتگو کے بعد ہم دونوں کی ووکیبولری ختم ہوگئی تھی، سو گفتگو کا سلسلہ یہیں منقطع ہوگیا ہم تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرادیتے تھے-غالباً یہ خیر سگالی کے جذبے کا بے ساختہ اظہار تھا-دریں اثناء میرے سگریٹ ختم ہوگئے تھے۔میں نے اٹیچی کھول کر اس میں سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور اٹیچی بند کرنے ہی کو تھا کہ احمد کی نظر جزدان میں لپٹے ہوئے قرآن مجید پر پڑگئی-اس کے چہرے پر مسرت اور وارفتگی کے آثار نمایاں ہوئے-اس نے سگریٹ بجھایا اور بسم اللہ پڑھتے ہوئے قرآن مجید کو بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور اسے جزدان میں سے نکال کر اپنے سامنے کھول لیا-وہ کچھ دیر تک زیر لب مطالعہ کرتا رہا-پھر یوں ہوا کہ اس نے ترکی لہجے میں قرات کے ساتھ اس کی تلاوت شروع کردی-وہ انتہائی پرسوز لے میں تلاوت کررہا تھا-تھوڑی دیر بعد اس نے تلاوت ختم کی-ایک بار پھر قرآن مجید کو بوسہ دیا اور اسے جزدان میں لپیٹ کر واپس اٹیچی میں رکھ دیا......اتاترک کے حکم سے ایک طویل عرصے تک عربی میں قرآن مجید کی اشاعت پر پابندی رہی ہے اور اس کی جگہ ترکی زبان میں قرآن شائع ہوتے رہے ہیں-اس کے علاوہ مساجد میں اذان بھی ترکی ہی میں دی جاتی تھی لیکن عدنان میندریس کی حکومت نے یہ احکام منسوخ کرکے عربی میں قرآن مجید کی اشاعت کی اجازت دے دی اور مساجد میں بھی عربی میں اذانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا چنانچہ ترک جو بنیادی طور پر انتہائی کٹر مسلمان ہیں-ایک عرصے کے سیکولر جبر کے بعد عربی میں قرآن مجید دیکھ کر جذباتی ہوجاتے ہیں-احمد میرے پاس قرآن مجید دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ اس کے صوری حسن پر بہت حیران بھی ہوا تھا-اس کی وجہ یہ ہے کہ ترکی میں جو قرآن مجید عربی میں شائع ہوتے ہیں وہ صوری حسن کے لحاظ سے ہمارے ہاں کے معیار تک نہیں پہنچتے-میں نے احمد کی یہ وارفتگی دیکھی تو اسے اشاروں سے بتایا کہ میں واپس پاکستان پہنچ کر اس کے لئے طباعت کے لحاظ سے اس سے بھی زیادہ خوبصورت نسخہ بطور تحفہ ارسال کروں گا-چنانچہ وہ اپنا ایڈریس مجھے نوٹ کرادے-اس پر اس نے تشکر کی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر ترکی میں رائج رومن رسم الخط میں میری نوٹ بک پر اپنے ایک عزیز کا ایڈریس درج کردیا: اور کہا کہ میں قرآن مجید اس پتے پر ارسال کردوں وہ وہاں سے وصول کرلے گا کیونکہ دریں اثناء اسے ایک بار پھر جرمنی واپس جانا ہے-

ٹرین ہچکولے کھاتی ہوئی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اور پٹڑیوں پر ریل کے دوڑتے ہوئے پہیئے ایک عجیب آہنگ پیدا کررہے تھے-چلتی ٹرین کا یہ آہنگ ایسا ہوتا ہے جس کی دھن پر کوئی سا گیت بھی گایا جائے، یہ اس کا ساتھ دیتا ہے-چنانچہ مسافر اس پر ہجر و وصال کے گیت گاتے ہیں-میرے برابر میں بیٹھے ہوئے مسافروں میں سے ایک ابھی تک مصروف کلام تھا-اس دوران وہ صرف ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا جس پر اس سعادت مند سامع نے موقع غنیمت جانا مگر گفتگو کے لئے ابھی ہونٹ وا کئے ہی تھے کہ دوسری سمت سے ایک ٹرین کانوں کے پردے چیرتی ہوئی وارد ہوئی جس کے شور تلے اس

بدنصیب سامع کی آواز دب گئی- میں نے اس کی طرف دیکھا اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور آواز غائب تھی- میں نے یہ منظر ایک فلم میں بھی دیکھا مگر حقیقی دنیا میں مجھے یہ زیادہ مضحک معلوم ہوا اور میں نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پایا-

رات کو ہم یوگوسلاویہ کی حدود میں داخل ہو گئے- یوگوسلاوین امیگریشن آفیسر بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا- اس کے چہرے پر گھنی بھوری مونچھیں تھیں- اس نے چلتی ٹرین میں پاسپورٹ چیک کیا اور پھر اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا- باہر پاکستان کا نام پڑھ کر اس نے اپنی نظریں تھوڑی دیر کے لئے وہاں جمائیں اور پھر پاسپورٹ مجھے لوٹاتے ہوئے کہا "ایوب خان!"

"یحییٰ خان!" میں نے تصحیح کی وہ شاید نہیں جانتا تھا کہ ایوب خاں رخصت ہو چکا ہے-

"ایوب خاں!" اس نے جوش اور ولولے کے ساتھ انگلی اٹھا کر کہا-

"نہیں یحییٰ خاں" میں نے اسے ایک بار پھر سمجھانے کے انداز میں کہا-

"ایوب خاں!" اس بار اس کے لہجے میں شدید جھنجھلاہٹ تھی-

اس پر مجھے بھی اس غبی شخص پر غصہ آیا کہ اسے ذرا سی بات سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی ہے چنانچہ میں نے بیزاری سے اس کی طرف دیکھا اور قدرے بلند آواز میں کہا "یحییٰ خاں!"

"ایوب خاں!" اس بار اس نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر فضا میں بلند کیں-

اور تب میں نے جانا کہ اسے نہیں دراصل مجھے اس کی بات سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی ہے وہ ایوب خاں کو عظیم رہنما قرار دے رہا تھا اور یحییٰ خاں کا ذکر سننے کے لئے تیار نہ تھا- تب میں نے اسے اشاروں سے سمجھانے کی کوشش کی کہ ایوب خان کو میں نے نہیں اتارا، لہٰذا اس سلسلے میں مجھ سے خفا ہونا مناسب نہیں- اس پر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا-



"ایوب خاں!" اس اثناء میں میرے سامنے بیٹھے ہوئے احمد نے بھی دونوں ہاتھ کھڑے کر دیئے یعنی یک نہ شد دو شد! اور پھر وہ کتنی دیر تک اشاروں کنایوں میں مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا رہا جو بھوری مونچھوں والے یوگوسلاوین نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی-

علی الصبح ٹرین یوگوسلاویہ کے دارالحکومت بلغراد پر آ کر رکی میرے برابر میں بیٹھا ہوا یوگوسلاوین اس کا سعادت مند سامع اور صاحب اسلوب "خراٹا نواز" مسافر رات کو کہیں راستے میں اتر گئے تھے- اب اس کمپارٹمنٹ میں میں اور احمد رہ گئے تھے- گاڑی کو یہاں کچھ دیر رکنا تھا میں پلیٹ فارم پر اتر آیا- برابر والے ڈبے سے تین چار یورپین نوجوان بھی اترے- انہوں نے زنانہ قسم کے لباس پہنے ہوئے تھے اور وہ تالیاں بجا کر بات کرنے کے انداز میں ایک دوسرے سے مصروف گفتگو تھے- میں نے انہیں کولہے مٹکا مٹکا کر چلتے دیکھا تو میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ وہ ہیجڑے ہیں- میں نے اپنے غیر ملکی سفر کے دوران دوسری بار یورپی کھسرے دیکھے تھے- مجھے ماڈل ٹاؤن کا خدا بخش کھسرا یاد آ گیا جو اپنی "سہیلیوں" میں باجی نرگس کہلاتا تھا- یہ بھی اپنی "سہیلیوں" میں یہی کہلاتے ہوں گے- میں نے پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے لوگوں کے چہرے پڑھنے شروع کر دیئے مگر چہرے تو غالباً ہر جگہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں ان پر کندہ تحریریں مختلف ہو سکتی ہیں مگر اتنے کم وقت میں یہ تحریریں پڑھنا میرے لئے ممکن نہیں تھا- میں ٹہلتے ٹہلتے پلیٹ فارم کے مرکزی دروازے تک پہنچ گیا- جہاں ایک بھاری بھرکم ٹکٹ کلکٹر کھڑا تھا اور مسافر یہاں سے آ جا رہے تھے- میں نے دروازے کے بالمقابل کھڑے ہو کر باہر کی جانب نظر دوڑائی بلغراد شہر میرے سامنے تھا اور میں اپنے ٹرانزٹ ویزے کی وجہ سے اس کا حسن یہیں سے دیکھ سکتا تھا- دہلیز سے باہر قدم رکھنا میرے لئے ممکن نہ تھا-

لاؤڈ سپیکر سے بین الاقوامی مسافروں کے لئے مختلف زبانوں میں اعلان ہو رہے تھے

جن میں انگریزی زبان کی "نمائندگی" بہر حال نہیں تھی- اچانک میرا دھیان اپنے سامان اور ٹرین کی طرف گیا اور میں نے مڑ کر دیکھا تو گاڑی پلیٹ فارم پر موجود نہ تھی- مجھے یوں لگا کسی نے میرے سانسوں کی زنجیر کھینچ دی ہے- میں ہڑبڑا کر پیچھے بھاگا- ریلوے کی ایک ملازمہ کنٹرول روم کی طرف جا رہی تھی- میں نے گونگوں کی طرح خالی پلیٹ فارم کی طرف اشارہ کیا اور ٹرین کے بارے میں پوچھا- میں "گونگا" تھا مگر وہ گونگے کی ماں نہیں تھی کہ ان اشاروں کو سمجھ سکتی چنانچہ اس نے میرے اشاروں کے جواب میں اپنے اشاروں کے ذریعے "نمی دانم" کا اظہار کیا- اس پر میں نے عالم اضطراب میں ایک پلیٹ فارم سے دوسرا پلیٹ فارم پھلانگنا شروع کر دیا- میرے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے اور میرا دماغ بالکل شل ہو گیا تھا- اس اثناء میں ایک دوسری پٹڑی پر مجھے ایک گاڑی کھڑی دکھائی دی مگر اس کا رخ مخالف سمت کو تھا- میں نے پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتے ہوئے ایک برطانوی مسافر سے استنبول جانے والی گاڑی کے بارے میں پوچھا تو اس نے متذکرہ گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ یہی استنبول والی ٹرین ہے اور یہاں سے اس کا روٹ تبدیل ہو جاتا ہے- اس پر میں نے سکون کا سانس لیا مگر یہ سانس ادھورا تھا کیونکہ اب مجھے اپنا کمپارٹمنٹ تلاش کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی- اس دوران گاڑی کی روانگی کا اعلان ہو گیا تھا اور مسافر ایک ایک کر کے اس میں سوار ہونا شروع ہو گئے تھے- مجھ پر ایک بار پھر گھبراہٹ طاری ہوئی اور میں ایک ایک کمپارٹمنٹ میں جھانک کر اپنے ڈبے کی شناخت میں مشغول ہو گیا- گاڑی پلیٹ فارم سے سرکنے ہی والی تھی کہ اچانک میری نظر تیسری جنس والے نوجوانوں پر پڑی جو کولہے مٹکاتے اور مخصوص انداز میں ہاتھ ہلاتے اپنے ڈبے میں سوار ہو رہے تھے- اس وقت یہ مخلوق مجھے اتنی اچھی لگی کہ میرا جی چاہا آگے بڑھ کر ان کا منہ چوم لوں- میرا ڈبہ ان کے برابر میں تھا اور یوں ان کے پتے سے مجھے اپنا گھر مل گیا تھا- تاہم میں نے ان کا منہ چومنے کی خواہش پر قابو پالیا کیونکہ سفر طویل تھا اور اس ایک



بوسے کے بعد باقی ماندہ "افیئر" اپنے انجام تک پہنچانا "شہادت گہہ الفت" میں قدم رکھنے کے برابر تھا اور یہ میرے بس میں نہیں تھا- تاہم اس روز مجھے یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں واقعی کوئی چیز بے مقصد پیدا نہیں کی!

-----

# بلغراد کی حور!

میں ڈبے میں داخل ہوا تو اسے پہلے سے روشن پایا۔

"تم جانتی ہو میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔ احمد ایک سیاہ آنکھوں اور مشرقی خدوخال والی خوبصورت یوگوسلاوین لڑکی کو بزبان حال اپنی بے حالی کا یقین دلا رہا تھا، جو بلغراد سے سوار ہوئی تھی۔ گو میں نے یہ مکالمہ نہیں سنا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ اس سے یہی کچھ کہہ رہا ہے کیونکہ وہ جس خضوع و خشوع کے ساتھ لڑکی سے محو کلام تھا اور جس وارفتگی کے عالم میں اسے دیکھے جا رہا تھا اس کے پیش نظر یہ گمان اتنا باطل نہیں تھا...... لڑکی کی سیاہ آنکھوں پر پلکوں کی لمبی لمبی جھالریں تھیں، اس کے چہرے پر حیا کی سرخی تھی اور یہ وہ چہرہ تھا جو ایک طویل عرصے تک مخرب اخلاق چہروں کے ہجوم میں میری آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں نے اس چہرے پر لکھی ہوئی حیا کی خوبصورت تحریر کنکھیوں سے پڑھنا شروع کر دی۔ یہی کام میرے برابر میں بیٹھا ہوا ایک لم ڈھینگ امریکی بھی کر رہا تھا جو غالباً اس حور بلغراد کے ساتھ ہی سوار ہوا تھا، مگر فرق یہ تھا کہ میری نظر اس حور شمائل کے طیب چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور اس کی آنکھیں چہرے سے نیچے دست درازیوں میں مشغول تھیں۔

"ہے، لک ایٹ دس بیچ، ہاؤ سیکسی از شی؟" میرے ہم نشست نے امریکیوں کے انداز فکر اور روایتی بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے ہاتھوں سے پیائشی زاویئے بناتے ہوئے سرگوشی کی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک ایستادہ تھیں۔



"تم ٹھیک کہتے ہو"! میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "کتیا واقعی جنسی مخلوق ہے مجھے تو تم بھی خاصے جنسی معلوم دیتے ہو"۔

"ہاہاہا" اس نے میرے ان ریمارکس کو اپنی مردانگی کے ضمن میں خراج تحسین سمجھتے ہوئے مسرت سے قہقہہ لگایا۔ "میرا نام ڈیوڈ ہے اور تم"؟ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"عطا" اور اس کے ساتھ ہی میں اس لم ڈھینگ کی طرف سے غافل ہو کر صحیح طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سراپا ناز، ترک نوجوان سے ہنوز یکساں دلچسپی کے ساتھ محو کلام تھی۔ میں نے کھنکار کر احمد کو اپنی طرف متوجہ کیا اور جب اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے انجمن حمایت اسلام کے تمام یتیم خانوں کی ٹوٹل یتیمی اپنے چہرے پر بکھیر دی۔ احمد نے میری اس مضحک کیفیت پر ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور پھر محبت سے لبریز شرارت آمیز لہجے میں نامعلوم زبان میں کچھ کہا۔ اس پر بلغراد کی شہزادی کے چہرے پر تبسم کی ضیا پھیلی اور پھیلتی چلی گئی۔ وہ دھیمے لہجے میں ہنس رہی تھی۔ میری آنکھوں نے صبح بنارس طلوع ہوتے دیکھی اور کانوں نے مندروں کی گھنٹیاں سنیں۔

"ایکسکیوزمی!" میں نے جھینپ کر ظالم سماج کا رول ادا کرتے ہوئے براہ راست اس نازنین کو مخاطب کیا جس نے بہت دیر سے میری آنکھیں اپنے پاس گروی رکھی ہوئی تھیں "ڈو یو نو انگلش؟"

"اے لٹل بٹ" اس نے اپنی حنائی انگلیوں سے اس "لٹل بٹ" کی صحیح مقدار بتاتے ہوئے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

"اگر میں کہوں کہ میرا نام عطا ہے تو تم سمجھ جاؤ گی؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اور میں سمجھ گئی ہوں"، اس نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

"اور اگر میں تمہارا نام پوچھوں تو بھی جان جاؤ گی؟"

"ہاں جان جاؤں گی"۔ اس ستم گر نے ایک ادائے بے نیازی سے جواب دیا اور نام بتائے بغیر ایک بار پھر احمد سے مصروف گفتگو ہو گئی۔ وہ واقعی جان گئی تھی۔ احمد نے ایک بار پھر دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں فاتحانہ شرارت تھی! میں نے جواباً ہنستے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھا اور گردن کو خم دے کر کہا "الحمد للہ، مسلمان، کاروش، کاروش"۔ مگر اس نے موجود لمحوں میں اخوت کے نظریئے کو پس پشت ڈالا اور اس اصول کے تحت "مساوی تقسیم" کے زریں اصول کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے حسب سابق اکیلا اس نازنین کی توجہ سمیٹنے میں مشغول ہو گیا۔

"مجھے اس کی شکل سور جیسی لگتی ہے!" ڈیوڈ نے احمد کی طرف اشارہ کر کے آہستگی سے کہا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ اگر اس طرح ہنس لینے سے دل کی بھڑاس نکل سکتی ہو تو انسان کو اس سلسلے میں بخل سے کام نہیں لینا چاہئے!

میں نے ٹرین سے باہر جھانکا۔ گاڑی اس وقت کسی شہری علاقے سے گزر رہی تھی۔ پٹڑی کے ساتھ ساتھ سڑک تھی جس پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ ایک کار کافی دیر سے ٹرین کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس میں ایک فیملی سوار تھی اور ایک گول مٹول بچہ کار میں سے ہاتھ نکال کر مسافروں کو "ویو" کر رہا تھا۔ میں نے کیمرہ استوار کیا اور تصویریں لینا شروع کر دیں۔ بچے نے یہ دیکھ کر زیادہ زور شور سے ویو کرنا شروع کر دیا۔ اس کے والدین بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تھے اور اب انہوں نے بھی ویو کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں لوگ پیدل بھی تھے۔ سائیکلوں پر سوار بھی تھے بسیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چھوٹی کاریں بھی سڑک پر موجود تھیں۔ ایک سوشلسٹ ملک میں سائیکل اور کار کا درمیانی فاصلہ میرے لئے ناقابل فہم تھا۔ یہاں مجھے جا بجا فلیٹوں پر مشتمل کئی کئی منزلہ عمارتیں بھی نظر آئیں۔ لگتا تھا حکومت عوام کے رہائشی مسئلے کو حل کرنے کے لئے فلیٹوں کی سکیم پر عمل کر رہی ہے۔ ان فلیٹوں کے علاوہ انفرادی مکان بھی



نظر آئے اور یہ مکان بھی مختلف معیاروں کے حامل تھے۔

میں نے باہر کے منظر سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر اس مشرقی خدوخال والی پراسرار سی لڑکی کو دیکھا جو مجھے بار بار میرے ماضی میں لے جا رہی تھی۔ اس کے کان کی لویں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔ نجانے احمد نے اس کے کان میں کیا کہہ دیا تھا۔ میں جانتا ہوں احمد نے اس سے کیا کہا ہو گا؟

گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر رک گئی تھی۔ لڑکی نے اپنا سامان سمیٹا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی منزل آ گئی تھی۔ احمد نے اسے دیکھا اور پھر اپنا دل اپنی آنکھوں میں بھر لایا۔ گاڑی مسافروں کو لے کر اگلی منزلوں کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ اور یہ راہی، چھوڑی ہوئی منزل کے تصور میں گم واپس اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ رفاقتیں اتنی مختصر بھی ہوتی ہیں مگر تم جانتے ہو یادیں اتنی مختصر نہیں ہوتیں۔

یوگوسلاویہ کی حدود ختم ہو گئی تھیں اور اب ہم بلغاریہ میں سے گزر رہے تھے، ٹرین میں ایک بار پھر رات ہو گئی تھی۔ احمد نے ابلی ہوئی سبزیوں کا ایک ٹین کھولا، لم سلمی ڈبل روٹی نکالی اور بسم اللہ پڑھتے ہوئے مجھے کھانے میں شرکت کی دعوت دی۔ ٹرین میں بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ روشنی کے عکس ٹرین سے باہر درختوں کے جھنڈ کو چند لمحوں کے لئے روشن کرتے تھے اور پھر نظروں کے سامنے اندھیرے کی فصیلیں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ بلغاریہ کا دارالحکومت صوفیہ تیز روشنیوں کے جلو میں آیا اور آنکھوں کو خیرہ کر گیا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ میں نے ایک طویل جماہی لی اور اپنی نشست پر دراز ہو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو ٹرین بلغاریہ سے گزر کر ترکی میں داخل ہو چکی تھی۔ راستے میں یونان کا ایک مختصر سا حصہ بھی پڑتا تھا اور اس دوران میں نے نیم خوابیدہ عالم میں یونانی عملے کو اپنے کاغذات بھی چیک کرا دیئے تھے۔ احمد کی آنکھوں میں بے خوابی کے آثار تھے مگر اس کے چہرے پر محبت کی وہ لکیریں زندہ تھیں جو ہر ترک کے چہرے پر پاکستانی مسلمانوں کے

لئے کندہ ہوتی ہیں۔ اس نے مجھے جاگتے پایا تو "السلام علیکم" کہا اور اپنے حسن میں خوبصورت تبسم کا اضافہ کرلیا۔ ڈیوڈ باتھ روم میں تھا۔ اور اس کا سامان ابھی تک بکھرا پڑا تھا...... استنبول آنے کو تھا...... احمد نے میرا سامان مجتمع کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا اور پھر وہ دروازے کے قریب کھڑا ہوگیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہوگئی تھی اور اب وہ پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔ ہم استنبول پہنچ گئے تھے۔

منور کو میرا تار مل گیا تھا اور وہ سٹیشن پر موجود تھا۔ اس نے گرم جوشی سے میرے ساتھ معانقہ کیا اور مجھے ساتھ لے کر چلنے ہی کو تھا کہ مجھے اپنے کاندھوں پر کسی کا دباؤ محسوس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو احمد اپنے بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے لپٹا لیا۔ میں نے اپنی گردن پر اس کے سانسوں کی تپش محسوس کی۔ وہ شاید میرے کان میں سرگوشی کر رہا تھا، "تم جانتے ہونا، ہم تم سے محبت کرتے ہیں؟"

"ہاں، ہم بھی تم سے محبت کرتے ہیں برادر!...... مگر وہ بلغراد کی حور......!"



# استنبول کا محمت کینار

گاڑی استنبول' کے سرکیجی (SIRECI) اسٹیشن پر رکی تھی، جس کے دائیں طرف باسفورس ہے اور جہاں سے فیری بوٹس شہر کے مختلف حصوں کے لئے روانہ ہوتی ہیں۔ اسٹیشن سے باہر نکلے تو باسفورس کے کنارے مچھلی روٹی بیچنے والے لڑکے چیخ چیخ کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے "بالک ایکمک برلیرا۔ بالک ایکمک برلیرا"۔ (روٹی اور مچھلی ایک لیرے میں، روٹی اور مچھلی ایک لیرے میں) اس کے ساتھ باسفورس میں چلنے والی بوٹس کی وقفے وقفے بعد بھوں بھوں کرتی مخصوص وسل کانوں میں پڑتی تھی۔ "بالک ایکمک برلیرا"۔ کی آوازیں اور فیری بوٹس کی وہسل ہمارا پیچھا کر رہی تھی اور ہم اس ساحلی فضا سے نکل کر "انقرہ جادیسی" پر آگئے تھے جو استنبول کی پر ہجوم سڑکوں میں سے ایک ہے!

"کہاں چلا جائے؟" میں نے سڑک پر رواں دواں بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس خوبصورت ترکوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا...... وہ سب مغربی لباس پہنے ہوئے تھے بعض کے سروں پر فیلٹ بھی نظر آ رہی تھی!

"گل خانہ چنار چلتے ہیں۔ اس ہوٹل کا مالک عرفان ہے۔ میرا دوست ہے۔ یہ ہوٹل خاصا قریب بھی ہے۔ ہم پیدل بھی جا سکتے ہیں؟" منور نے کہا۔ وہ یہاں سکالرشپ پر آیا ہوا تھا۔ اس نے اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی سے ترکی زبان میں ڈپلومہ کورس کیا تھا اور اب استنبول یونیورسٹی سے ترکی زبان کی اعلیٰ ڈگری "ہتھیانے" کے چکر میں تھا۔ منور ایک

عجیب و غریب کردار تھا۔ قدرت نے اسے ذہانت اور حماقت کی دولت سے بیک وقت بہرہ ور کیا تھا۔ اس کے دوستوں میں خدام اور حکام دونوں شامل تھے کہ وہ اپنی خوش خلقی، اخلاص اور زندہ دلی کی بدولت منٹوں میں بے تکلف ہو جاتا تھا۔ وہ کنجوس نہیں تھا مگر اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کے اصول کا قائل تھا۔ ہم دونوں ایک ہی سیشن کے دوران اورینٹل کالج میں زیر تعلیم تھے۔ اس نے وہاں اپنی لیڈری کا سکہ جمایا ہوا تھا اور میں "مسائل تصوف" میں الجھا ہوا تھا۔ یہاں منور پے انگ گیسٹ (PAYING GUEST) کے طور پر ایک ایرانی گھرانے میں مقیم تھا۔ سو ظاہر ہے یہ "پناہ گزین" کسی اور مہمان کو پناہ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے!" میں نے چٹکی بجا کر گل خانہ چنار والی تجویز پر صاد کیا اور ایک اٹیچی کیس منور کو تھما کر قدم آگے بڑھا دیئے!

انقرہ جادیسی پر کھوے سے کھوا چھل رہا ہے کہ اس سڑک پر ہول سیل کی دکانیں اور تجارتی دفاتر واقع ہیں۔ نیز اردو بازار قسم کی ایک مارکیٹ بھی یہیں واقع ہے، جہاں کتابیں، کاپیاں اور دیگر سٹیشنری "بازار سے ارزاں نرخوں پر" دستیاب ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں تمام اخباروں کے مرکزی دفاتر بھی اسی سڑک پر ہیں "ولایت" یعنی گورنر کا سیکرٹریٹ بھی یہیں ہے۔ ان دنوں ویفا پوئے راز یعنی "وفا شبنم" یہاں کے گورنر ہیں کہ ترکی میں "ویفا" وفا کو اور "پوئے راز" شبنم کو کہتے ہیں۔ اس سڑک پر DEN ٹائپ چھوٹے چھوٹے ہوٹل بھی ہیں۔ جہاں مفلوک الحال سیاح آکر ٹھہرتے ہیں۔

"وہ سامنے والی دکان دیکھ رہے ہو"؟ گھنگریالے بالوں والا خوبرو، دراز قد منور جو اپنی نظر کی عینک کی وجہ سے خواہ مخواہ سنجیدہ سنجیدہ سا لگتا ہے، چلتے چلتے فیس بیلٹس کی ایک دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "یہ حاجی سلیمان کشچو لو اوغلو کی دکان ہے، شہر میں ان کا بہت وسیع کاروبار ہے!"



"گزشتہ برس میں نے استنبول ہی میں تمہیں جس روانی سے ترکی بولتے دیکھا تھا اس سے تم بھی کوئی اوغلو قسم کی چیز لگتے تھے" میں ہنستے ہوئے کہتا ہوں اور اس عرصہ میں تمہیں ترکی پر مزید کمانڈ حاصل ہو چکی ہے، سو اب تک تم پورے کشچو لو اوغلو بن چکے ہو گے!"

"اچھا بکواس بند کرو!" منور ہنستا ہے "حاجی سلیمان اوغلو یہاں کی بہت محترم شخصیت ہیں۔ اتاترک کے عہد میں جب عربی پر پابندی لگی تو انہوں نے اپنے ہاں خفیہ طور پر عربی کی تعلیم کا اہتمام کیا اور قریباً پانچ ہزار ترک مسلمانوں کو عربی کی تعلیم دی۔ ان کے مکتب پر کئی دفعہ چھاپے بھی پڑے۔ حاجی سلیمان اوغلو کو ابتلا سے بھی گزرنا پڑا مگر وہ ثابت قدمی سے اپنے مشن کی تکمیل کرتے رہے۔ پاکستان اور ہندوستان سے جو تبلیغی جماعتیں استنبول آتی ہیں، وہ انہی کے ہاں قیام کرتی ہیں"۔

قریباً سو گز اس سڑک پر چلنے کے بعد ہم بائیں جانب مڑ جاتے ہیں۔ یہ انتہائی گنجان سڑک ہے کہ یہاں عام بسوں کے علاوہ بجلی سے چلنے والی ٹرالی بسیں بھی رواں ہیں۔ سڑک کے دونوں جانب تھوک کی دکانیں ہیں۔ چنانچہ یہاں گڈے بھی ہیں اور ٹرک بھی جو مال، لوڈ اور ان لوڈ کرنے میں مشغول ہیں۔ یہاں کثیر تعداد میں ترک حمال (پانڈی) بھی نظر آرہے ہیں۔ جنہوں نے اپنے کاندھوں پر "کوفے KOFE" ڈالے ہوئے ہیں اور محنت مزدوری کے لئے سرگرداں ہیں۔ سڑک پر ٹریفک جام ہو گیا ہے چنانچہ کار اور ٹیکسی ڈرائیور جھنجھلاہٹ کے عالم میں ہارن پر ہارن دیئے جا رہے ہیں۔

میرے بازو تھک گئے ہیں۔ میں اٹیچی زمین پر رکھتا ہوں اور سانس لینے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہوں۔

"ہوٹل یہاں سے اتنا نزدیک بھی نہیں ہے جتنا میں نے بتایا تھا"۔ منور دانت نکالتے ہوئے کہتا ہے "مگر اس سڑک پر ٹریفک اسی طرح رکی رہتی ہے۔ اگر ہم ٹیکسی میں ہوتے

تو اسی طرح دانت پیس رہے ہوتے۔ جس طرح یہ لوگ تمہیں پیتے نظر آرہے ہیں اور پھر میں ویسے بھی تمہیں یہاں کی ''اکبری منڈی'' میں گھمانا پھرانا چاہتا تھا اور وہ تم گھوم ہی رہے ہو!''

دریں اثناء میری نظر سامنے کی جانب اٹھتی ہے تو ایک گورا چٹا، دبلا، پتلا، میانہ قد نوجوان اردگرد کے ٹریفک سے بے نیاز سڑک کے بیچوں بیچ زگ زیگ چال چلتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں اور آنکھیں نشے سے بوجھل ہیں۔

''اس 'لکڑ' کو دیکھو'' منور اپنی مخصوص ووکیبولری استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے ''یہ درزی ہے، اس کا نام محمت کینار ہے۔ میرا دوست ہے۔ بہت شریف آدمی ہے مگر نشے میں عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے۔ میں تمہیں اس سے ملاتا ہوں''۔ اور پھر وہ اسے آواز دیتا ہے ''محمت کینار...... محمت کینار!''۔

محمت کینار اس آواز پر اپنی نیم وا آنکھیں پوری طرح کھولنے کی کوشش کرتا ہے اور منور کو سامنے پا کر الٹے سیدھے قدم اٹھاتا ہوا اس کی جانب بڑھتا ہے۔ قریب پہنچ کر وہ منور سے بغل گیر ہو جاتا ہے اور ترکوں کے روایتی انداز میں اس کے گالوں کا بوسہ لیتا ہے۔ مگر جب یہ معاملہ ایک بوسے تک محدود نہیں رہتا بلکہ تابڑ توڑ بوسوں کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے تو منور ہنستے ہوئے اس ''لکڑ'' کو نرمی سے پرے کر دیتا ہے!

''اس سے ملو، یہ میرا دوست ہے، پاکستانی ہے!'' منور رومال سے اپنے گالوں کو صاف کرتے ہوئے میرا تعارف کراتا ہے!

وہ ایک نظر مجھ پر ڈالتا ہے اور زمین پر اپنے پاؤں مضبوطی سے جمانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھتا ہے ''مسلمان؟''

میں نشے میں دھت محمت کینار کے اس سوال پر بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتا ہوں، جس پر وہ نفی میں سر ہلاتا ہے اور ترکی میں منور سے کچھ کہتا ہے۔



''جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے'' منور موسلادھار ہنسی ہنستے ہوئے مجھے بتاتا ہے ''یہ کہتا ہے تمہارا دوست جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال ہیں اس نے ہپیوں جیسا لباس پہنا ہوا ہے، یہ مسلمان نہیں ہے، ایک مسلمان ایسا نہیں ہو سکتا!''

میرے چہرے پر ایک طویل مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور میں محمت کینار سے کچھ چھیڑ چھاڑ پر مائل ہوتا ہوں مگر اب وہ میری طرف متوجہ نہیں ہے۔ اس نے برابر سے گزرتے ہوئے ایک حمال کے کاندھوں پر ہاتھ رکھا اور جلتی بجھتی آنکھوں کے ساتھ اس سے گفتگو میں مصروف ہو گیا ہے!

''اب یہ اپنے گھر جانا چاہتا ہے'' منور ایک بار پھر بری طرح ہنستے ہوئے مجھے بتایا ہے۔

''اگر وہ گھر جانا چاہتا ہے تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' میں پوچھتا ہوں۔ ''کوئی ایسی بات نہیں'' منور اسی طرح ہنستے ہوئے کہتا ہے ''سوائے اس کے کہ وہ حمال کے کاندھوں میں لٹکے ہوئے کوفے میں بیٹھ کر گھر جانے کی ضد کر رہا ہے۔ حمال اسے سمجھا رہا ہے کہ اس صورت میں لوگ اس پر ہنسیں گے مگر وہ کہتا ہے تمہیں اس سے کیا؟ لوگ مجھ پر ہنسیں گے مجھے لوگوں کی کیا پرواہ ہے۔ تم اپنے پیسے لو اور مجھے کوفے میں بٹھا کر گھر چھوڑ آؤ۔ گھر یہ سامنے ہی تو ہے!''

بالآخر حمال اور محمت کینار میں دس لیرے (پانچ روپے) پر ''راضی نامہ'' ہو جاتا ہے اور وہ اسے کوفے میں ڈال کر گھر کی جانب چل پڑتا ہے!

# امش اور ممش

اس سڑک پر قریباً دو سو گز چلنے کے بعد ہم دائیں جانب مڑ جاتے ہیں۔ یہاں بائیں ہاتھ پر گل خانہ چنار پارک ہے جو بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ترکی کا بہت بڑا پارک ہے جو ایک زمانے میں ”توپ کاپی سرائے“ یعنی سلطان کے محل کا حصہ تھا۔ آج کل اس میں ترکی کا سب سے بڑا میوزیم ہے جس کے ایک حصے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور دیگر تبرکات بھی محفوظ ہیں۔ گل خانہ چنار پارک کے ایک گوشے میں اکثر پتلیوں کا تماشا ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لئے تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے ہیں۔

”تم ابش (IBIS) اور ممش (MIMIS) کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“ منور چلتے چلتے مجھ سے پوچھتا ہے۔

”کبھی تعارف نہیں ہوا۔ کیسی ہیں؟“ میں چہرہ سنجیدہ بنا کر پوچھتا ہوں۔

”اوئے لکڑ! یہ دونوں پتلیاں ہیں“۔ وہ مجھے اتنی ہی سنجیدگی سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ”یہ دونوں کردار بڑے گھرانوں کے ”ہادے“ یعنی خادم کا رول ادا کرتے ہیں۔ تم اگر یہ شو دیکھنا چاہو، تو یہاں چلے آئیں گے۔ بہت مزے کی چیز ہے!“

”میں نے پتلیوں کے تماشے بہت دیکھے ہیں“۔ میں کہتا ہوں ”اور بڑے گھرانوں کے خادم کا رول ادا کرنے والے کردار بھی میرے دیکھے بھالے ہیں اب اگر دکھانا ہے تو آنکھوں کو کوئی اور منظر دکھاؤ!“

ہم اس پارک کے ساتھ ساتھ چلتے چلے جاتے ہیں۔ یہ پارک ”ساحل یولو“ یعنی



ساحلی سڑک تک پھیلا ہوا ہے، جس کے قریب ”سرائے برنو“ ہے، جہاں سمندر کے پانی کا بہاؤ بہت تیز ہوتا ہے۔ استنبول میں خودکشی کرنے کے لئے یہ جگہ آئیڈیل سمجھی جاتی ہے۔ جس سڑک پر ہم چل رہے ہیں اس کے دائیں جانب ”باب ملی“ ہے جس میں قومی اہمیت کی دستاویزات محفوظ ہیں۔

”ان دستاویزات میں سلطان ٹیپو کا وہ خط بھی محفوظ ہے، جس میں اس نے ترکی کے سلطان سلیم سے مدد کی درخواست کی تھی اور ساتھ یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ سلطان ان سے ایک بندرگاہ لے لے اور اس کے بدلے بصرے کی بندرگاہ سلطان ٹیپو کو استعمال کرنے کی اجازت بخشے!“ منور مجھے بتاتا ہے۔

”پھر کیا ہوا؟“ میں دلچسپی سے پوچھتا ہوں۔

”پھر یہ ہوا کہ صدر اعظم (وزیر اعظم) نے یہ خط خلیفہ کے ایماء پر برطانوی اور فرانسیسی سفیروں کو ریفرنس کے لئے بھیج دیا“۔

”برطانوی سفیر کو؟“

”ہاں، برطانوی سفیر کو بھی!“ منور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے۔ وہ اب واقعی سنجیدہ نظر آنے لگا ہے ”برطانوی سفیر نے اس خط پر لکھا کہ سلطان ٹیپو ایک ڈاکو اور لٹیرا ہے۔ اس کے ساتھ قطعاً کوئی تعاون نہ کیا جائے جب کہ فرانسیسی سفیر نے پرزور سفارش کی کہ سلطان ٹیپو کی مدد کی جائے!“

”پھر کیا ہوا؟“ مجھے اپنی سانس رکتی محسوس ہوتی ہے۔

”پھر وہی ہوا جو انگریزی سفیر نے کہا تھا“ منور کے لہجے میں کپکپاہٹ ہے۔ ”ٹیپو شہید کو جواب موصول ہوا کہ انگریز ہمارے دوست ہیں، آپ بھی ان سے دوستی کریں۔ دوسری طرف بصرہ کے گورنر کو ہدایت کی گئی کہ بصرے کا دفاع پہلے سے دوگنا کر دیا جائے!“

میں ایک بار پھر چلتے چلتے اپنا اٹیچی کیس زمین پر رکھتا ہوں اور سانس لینے کے لئے رک جاتا ہوں۔ اس دفعہ تھکاوٹ کا احساس پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی ہولے ہولے مجھے کند چھری سے ذبح کر رہا ہے۔ خادموں کا رول ادا کرنے والے کردار ابش اور امش میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے ہیں۔



# ملکہ کی ادائے دلبرانہ!

چند قدم چلنے کے بعد "ہوٹل گل خانہ چنار" کی تین منزلہ عمارت بائیں جانب نظر آتی ہے۔ منحنی سا عرفان بے بڑی گرم جوشی سے منور سے ملتا ہے اور پھر تعارف کے بعد اسی تپاک سے میرے ساتھ معانقہ کرتا ہے۔ میں ارد گرد نظر دوڑاتا ہوں تو یہاں متعدد پاکستانی چہرے نظر آتے ہیں، جنہیں انہی کے ہم وطن مختلف ملکوں میں روزگار دلانے کا وعدہ کر کے اور اس کے عوض ان سے ہزاروں روپے ہتھیا لینے کے بعد یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ یہ ایک سستا سا ہوٹل ہے۔ میں سفر کے دوران چھ دن بچت اور ایک دن خرچ کی پالیسی پر عمل پیرا رہتا ہوں، سو پیشتر اس کے کہ منور عرفان بے سے میری رہائش کے بارے میں کوئی بات کرے، میں اس سے کسی اور ہوٹل میں چلنے کے لئے کہتا ہوں اور پھر ہم "ہوٹل بیوک آیا صوفیہ" چلے آتے ہیں جو "ہوٹل گل خانہ چنار" کے قرب وجوار ہی میں واقع ہے۔ یہ خاصا "پوشڈ" ہوٹل ہے۔ میں رجسٹر کا پیٹ بھرنے کے بعد اپنا پاسپورٹ کاؤنٹر کلرک کے سپرد کرتا ہوں۔

"پاکستان؟" اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے اور میں ایک جوابی مسکراہٹ کے ساتھ خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمرے کی چابی لے کر دوسری منزل پر آجاتا ہوں۔ یہ ایک خوبصورت سا کمرہ ہے، جس میں ٹیلی فون کی سہولت بھی میسر ہے۔ منور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے کچھ دیر کے لئے مجھ سے رخصت ہو گیا ہے۔ میونخ سے استنبول تک کے طویل سفر اور پھر پہاڑیوں پر واقع استنبول شہر کی اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کی طرف

آتی جاتی سڑکیں ماپنے کی وجہ سے میں شدید طور پر تھک گیا ہوں، چنانچہ تھکاوٹ کے احساس کو قدرے زائل کرنے کے لئے غسل کرتا ہوں اور پھر شریفانہ لباس پہن کر اباجی کو خط لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ جس میں انہیں چند دنوں تک واپس پاکستان پہنچنے کی اطلاع دیتا ہوں۔

"بمب۔ بمب۔ بمب۔ بما بمب۔ بمب" منور ایک بار پھر میرے کمرے میں ہے اس کے ہاتھوں میں ایک ٹیپ ریکارڈ ہے جس میں سے یہ عجیب وغریب آواز نکل رہی ہے۔

"بمب۔ بمب۔ بما۔ بمب۔ بمب" وہ آواز اونچی کر دیتا ہے "میرا ایک کزن منہ سے طبلہ بجانے میں ماہر ہے۔ میں لاہور سے آتی دفعہ یہ آواز ٹیپ کر کے لایا تھا۔ یہ ٹیپ ریکارڈر میں نے بلجیم سے خریدا ہے"۔

"بہت خوب" میں اس کے کزن کی غائبانہ اور ٹیپ ریکارڈر کی والہانہ حوصلہ افزائی کرتا ہوں اور اپنے لکھے ہوئے خطوط سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں "آؤ۔ ذرا ڈاکخانے تک چلیں!"

گلی کی نیچی اونچی گھاٹیں طے کرتے ہوئے ہم باہر سڑک پر آ جاتے ہیں، جہاں زندگی اپنے عروج پر ہے۔ منور نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا ہوا ہے جو وہ بلجیم سے لایا تھا اور جس میں اس کا کزن منہ سے طبلہ بجا رہا ہے۔ لوگ اپنے فرائض منصبی سے فراغت پا کر گھروں کو لوٹنے کے بعد اب سیر و تفریح یا گھریلو کام کاج کے سلسلے میں سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ عورتیں سکرٹ اور مرد پتلون میں ملبوس ہیں۔ ذرا آگے بائیں جانب ایک "پب" نظر آتا ہے۔ جہاں بہت سے لوگ مے نوشی میں مشغول ہیں۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر ترک بھی ہے، جس نے "وٹووٹ" کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ سر پر فلیٹ ہے اور گلے میں باندھی ہوئی ٹائی کی ناٹ اس نے ڈھیلی کی ہوئی ہے۔ اس کے کوٹ کی تمام جیبوں میں کاغذات کے پلندے ہیں، جو جیبوں کی "شکم پری" کے بعد اب باہر کو جھانک رہے ہیں۔ شکل اور



وضع قطع سے موصوف ہیڈ کلرک لگتے ہیں۔ میخوار با آواز بلند ایک دوسرے سے مخاطب ہیں۔ "پب" کا دروازہ کھلتا ہے تو "آبے آبے" کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

"واضح رہے یہ لوگ غل غپاڑہ نہیں کر رہے اور نہ ہی عالم ناراضی میں ایک دوسرے کو "ابے" کہہ کر مخاطب ہو رہے ہیں" منور ہنستے ہوئے کہتا ہے "آبے، بڑے بھائی کو کہتے ہیں اور یہ لوگ اس وقت فرط محبت سے ایک دوسرے کو "بڑا بھائی" کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں!"

اس سڑک پر ذرا آگے جائیں تو دائیں جانب کو ایک سڑک "میرے باتان" آتی ہے۔ یہاں کبھی رومیوں کا حمام ہوا کرتا تھا، جو اپنی بچی کھچی شکل میں اب بھی وہاں موجود ہے۔ ہم "میرے باتان" کی طرف جانے کی بجائے اسی سڑک پر چلتے جاتے ہیں۔ یہاں سے چھ میناروں والی مشہور زمانہ مسجد "مسجد سلطان احمد" نظر آ رہی ہے!

"تم جانتے ہو، ان چھ میناروں کے بارے میں کیا روایت بیان کی جاتی ہے؟"

"کیا؟" میں اردگرد پھیلے ہوئے کتابی چہرے پڑھتے ہوئے کہتا ہوں!

"سلطان محمد فاتح نے ایک بار حکم دیا کہ فوری طور پر ایک مسجد بنائی جائے جس کے مینار سونے کے ہوں۔ سلطان کے الفاظ تھے اوٹو جامع نن مینارے لری آلتن اولسن (BU CAMININ MENARELERI ALTIN OLSUN) ترکی میں "آلتی" چھ کو اور "آلتن" سونے کو کہتے ہیں چونکہ سونے کے میناروں کے لئے بے انتہا رقم درکار تھی، اس لئے ملکہ نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے معماروں کو حکم دیا کہ وہ سونے کے میناروں کی بجائے چھ میناروں والی مسجد تعمیر کر دیں۔ جب مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی اور سلطان محمد فاتح نے دیکھا کہ سونے کے میناروں کی بجائے چھ میناروں والی مسجد سامنے کھڑی ہے تو وہ ناراض ہوا۔ ملکہ نے سلطان کو برہم دیکھا تو ادائے دلبری سے کہا "اچھا تو آپ نے "آلتن" کہا تھا، ہم سمجھے کہ "آلتی" کہا ہے!" اور یوں معاملہ رفع دفع ہو گیا!"

# منور کا حجام دوست

"تم بہت اچھے گائڈ ہو" میں منور کو مشفقانہ انداز میں تھپکی دیتے ہوئے کہتا ہوں "مگر خدا کے لئے اپنے کزن کو لگام دو، اب میں اس کا طبلہ نہیں سن سکتا!"

"تم بہت بدذوق آدمی ہو" وہ ٹیپ ریکارڈر بند کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "میرے ترک دوست تو اس سے بہت محفوظ ہوتے ہیں"۔

"ہوتے ہوں گے" میں اس کے بھولپن سے محظوظ ہوتے ہوئے کہتا ہوں "مگر میری ایک بات یاد رکھو، اگر کبھی خدانخواستہ پاکستان سے ترکی کے تعلقات خراب ہوئے تو اس کی تمام تر ذمہ داری تمہارے اس کزن ہی پر عائد ہو گی"۔

"تم بڑی لکڑ ہو" وہ ہنستے ہوئے کہتا ہے اور سڑک کے کونے پر واقع "آیا صوفیہ میوزیم" سے دائیں ہاتھ مڑ جاتا ہے!

بائیں جانب ڈسٹرکٹ کورٹس کی عمارت دکھائی دیتی ہے، جسے ترکی میں بھی "عدلیہ" ہی کہتے ہیں! چند قدم آگے ایک حجام کی دکان ہے اور یہ حجام بھی منور کا دوست ہے۔ یہ چالیس سالہ پرانی دکان ہے۔ منور اپنے بال یہیں سے کٹواتا ہے۔

"آؤ تمہیں محمت بے سے ملاتا ہوں" منور میرا ہاتھ تھام کر دکان میں داخل ہو جاتا ہے۔

"محمت بے ناسلسن؟" منور محمت بے سے اس کا حال دریافت کرتا ہے جو پوری محویت سے ایک گاہک کے بال کاٹنے میں مصروف ہے۔



"حمد اولتن" محمت سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا ہے اور پھر گردن نہوڑائے گاہک سے بے نیاز ہو کر قینچی پرے رکھ کر منور سے باتوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ دونوں خاصی دیر تک پورے خضوع و خشوع کے ساتھ کسی مسئلے پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ میں دکان میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوں تو دیواروں پر خانہ کعبہ کی تصویریں اور عورتوں کے نیم عریاں پوسٹر ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ منور اور محمت بے کی گفتگو کچھ طویل ہو گئی ہے۔ گردن نہوڑائے گاہک کو بالوں میں کھجلی ہونے لگی ہے، میں بھی اکتاہٹ محسوس کرنے لگتا ہوں، اس پر منور محمت بے سے رخصت ہوتا ہے اور ہم باہر سڑک پر آ جاتے ہیں۔

"تم اتنی دیر تک اس سے کیا گفتگو کرتے رہے ہو؟" میں منور سے پوچھتا ہوں "کچھ نہیں" منور ہنستے ہوئے جواب دیتا ہے "وہ مجھ سے بین الاقوامی سیاست پر گفتگو کر رہا تھا۔ اور ہم میں اتفاق رائے نہیں ہو رہا تھا"۔

حجام کی دکان سے ہم دائیں ہاتھ مڑتے ہیں۔ جہاں سے کچھ فاصلے پر ترکی کے مشہور اخبار "حریت" کا دفتر ہے۔ آگے "جاغلوغلو چوک" ہے، جس سے ذرا آگے "ملی ترک طلبہ" کا دفتر ہے جو ترک طلبہ کی ملک گیر اور بہت مضبوط بنیادوں پر قائم تنظیم ہے۔ تنظیم کے صدر اسماعیل قہرمان اور سیکرٹری عثمان یومک منور کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ وہ ان سے میری ملاقات کرانا چاہتا ہے، مگر میں یہ ملاقات کسی اور دن پر چھوڑتا ہوں۔ چلتے چلتے میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم پھر انہی رستوں کے "پیچ و خم" میں ہیں جن سے گزر کر اسٹیشن سے ہوٹل تک پہنچے تھے۔ مجھے کتابوں کا بازار نظر آتا ہے اور وہ سڑک بھی جہاں قریباً تمام اہم اخباروں کے دفاتر ہیں۔ آگے چل کر بائیں ہاتھ کو جنرل پوسٹ آفس کی عمارت نظر آتی ہے اور جس کے مرکزی دروازے تک پہنچنے کے لئے ویسی ہی وسیع و عریض سیڑھیاں طے کرنا پڑتی ہیں، جیسی بادشاہی مسجد کی ہیں!

# سیو جان! تمہارا نام بہت لمبا ہے

میں لفافے خرید کر ان پر پتے درج کر کے اور پھر انہیں "سپر ڈاک" کرنے کے بعد باہر سیڑھیوں کی جانب آتا ہوں تو منور کو ایک پری چہرہ سے ہم کلام پاتا ہوں۔ سیاہ سکرٹ اور سفید بلاؤز میں ملبوس اس ترک لڑکی کا چہرہ خوشی سے تمتمارہا ہے۔ لگتا ہے یہ لمحات اس کے لئے بہت مسرت آفریں ہیں، میں مسکینوں کی طرح ان کے قریب جا کے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ منور ترکی میں اسے میرے بارے میں کچھ بتاتا ہے، جس پر وہ لمحہ بھر کے لئے غور سے میری طرف دیکھتی ہے اور پھر گرم جوشی سے میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے خوبصورت انگریزی میں میرا حال دریافت کرتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس کے لہجے میں انتہائی تپاک ہے نیز وہ مسکراتے ہوئے مجھے مسلسل دیکھے جا رہی ہے۔ اس کے چہرے پر اپنائیت کے اجالے ہیں اور میں اجنبیت کی پرچھائیاں لئے اس کے سامنے کھڑا ہوں۔

"تم نے مجھے پہچانا؟" وہ شرارت بھری مسکراہٹ کے ساتھ میرے چہرے پر نظریں جمائے پوچھتی ہے۔

میں جواب میں حیرت سے اس کی طرف تکتا ہوں اور اسے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر میں اسے کیسے پہچان سکتا ہوں کہ ترکی میں کسی خاتون سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

"اپنے ذہن پر زور دو، شاید تمہیں کچھ یاد آجائے"۔

میں اپنے ذہن پر اتنا زور دیتا ہوں کہ دماغ کی رگیں پھٹتی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ مگر



مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا۔ میرا کسی ترک لڑکی سے کبھی تعارف نہیں ہوا تھا۔

"ذرا غور سے میری طرف دیکھو میں تمہیں اپنی یاد ضرور دلاؤں گی" وہ بصد ناز و ادا اپنا دمکتا ہوا مکھڑا میرے قریب لاتی ہے۔

"خدا کے لئے میرے اتنا قریب نہ آؤ" میں ہنستے ہوئے کہتا ہوں "اگر مجھے کچھ یاد آنا بھی ہوا۔ تو بھول جاؤں گا!"

اس پر وہ کھلکھلا کر ہنستی ہے اور کہتی ہے "تم آج بھی ویسے کے ویسے ہی ہو!" یہ فقرہ مجھے مزید الجھن میں مبتلا کر دیتا ہے اور میں بالآخر زچ ہو کر منور سے اس ڈرامے کا ڈراپ سین کرنے کے لئے کہتا ہوں۔

"ابھی نہیں۔ کسی ریستوران میں چل کر کافی پیتے ہیں، شاید تمہیں کچھ یاد آجائے!"

ہم ڈاکخانے کی سیڑھیاں اتر کر ایک ٹیکسی روکتے ہیں اور اسے "تقسیم چوک" چلنے کے لئے کہتے ہیں۔ یہاں ہم "بے اوغلو کرات خانے سی" میں داخل ہوتے ہیں اور ایک کونے میں بیٹھ جاتے ہیں۔

"تم نے اگر مزید کچھ دیر مجھے نہ پہچانا تو میں بھی تمہیں نہیں پہچانوں گی!" وہ مصنوعی ناراضی سے کہتی ہے۔

میں ایک بار پھر ماضی کو ٹٹولتا ہوں اور جلد ہی ہتھیار ڈال دیتا ہوں۔ مجھے شدید جھنجھلاہٹ محسوس ہو رہی ہے، مگر منور اور وہ پری چہرہ میری اس کیفیت سے مسلسل محظوظ ہو رہے ہیں!

"مجھے آلو چھولے بہت پسند ہیں!" وہ مسکراتے ہوئے اچانک ٹوٹی پھوٹی اردو میں یہ جملہ ادا کرتی ہے اور مجھے لگتا ہے میں بے ہوش ہو جاؤں گا!

"اب مزید میرا امتحان لینا چھوڑ دو، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا" میں بے بسی سے منور کی طرف دیکھتا ہوں!

"پاگل تو تم اسے دیکھتے ہی ہو گئے تھے۔ اب تو صرف ترقی کی منازل طے کر رہے ہو!"

وہ مجھے اذیت دینے پر تلا ہوا ہے۔

"میری تمہاری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی"۔ منور کی بجائے بالآخر اس نازنین کو مجھ پر ترس آ گیا ہے۔

"لا۔ ہور میں؟"

"ہاں لاہور میں" اس کی جلترنگ آواز میرے کانوں کو سنائی دیتی ہے "ہم مال روڈ پر پی آئی اے کے دفتر میں ملے تھے۔ میں پاکستان کی سیاحت پر آئی ہوئی تھی۔ چند مہینے کے قیام کے بعد واپسی کا ٹکٹ بنوانے کے دوران پی آئی اے کے کاؤنٹر پر میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات اتنی بڑھ گئی کہ بہت سے لوگ متوجہ ہو گئے، تم اور منور بھی وہاں موجود تھے۔ تم نے امریکہ جانا تھا اور منور تمہارے ساتھ ترکی تک جا رہا تھا۔ تم نے اپنا کام بیچ میں چھوڑ کر معاملہ رفع دفع کرانے کی کوشش کی اور پھر مجھے وہاں سے اپنے ساتھ پی آئی اے کے بالکل برابر میں واقع ایک ریستوران میں لے گئے۔ تم وہاں میرا غصہ رفع کرنے کے لئے مجھے ہنسانے کی کوشش کرتے رہے اور جب میں واقعی سب کچھ بھول گئی تو تم اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ تم اخبار میں کام کرتے تھے نا؟ جس کا دفتر اس ریستوران کے اوپر تھا۔ مجھے سب یاد ہے اور پھر تم مجھے اور منور کو وہیں چھوڑ کر اپنے دفتر چلے گئے۔ لیکن تمہارا حافظہ اس وقت بھی کمزور تھا، کیونکہ تم اپنا بیگ وہیں بھول گئے تھے، جس کے لئے تم دوبارہ آئے تھے!"

مجھے اپنے سینے پر سے ایک بوجھ اترتا محسوس ہوتا ہے کہ بیتے ہوئے لمحے فلم کے مناظر کی طرح میری آنکھوں کے سامنے گزرنے لگتے ہیں۔ اسے سب کچھ یاد تھا مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ میں احساس فراغت کے ساتھ احساس ندامت بھی محسوس کرتا ہوں۔ اور پھر اپنی خفت مٹانے کے لئے ہنستے ہوئے کہتا ہوں "باقی سب کچھ ٹھیک ہے مگر یہ نوٹ



کر لو کہ میں بیگ کے لئے واپس نہیں آیا تھا!"۔

"اگر تمہیں یاد ہو تو میں نے تمہیں اپنا پتہ بھی دیا تھا اور تم نے کہا تھا کہ امریکہ جاتے ہوئے تم استنبول میں میرے ہاں رکو گے۔

"ہاں! مگر یوں ہوا کہ میں بہت کم عرصہ یہاں قیام کر سکا اور یوں خواہش کے باوجود تم سے ملاقات نہ ہو سکی" میں جھوٹ بولنے کی کوشش کرتا ہوں

"تمہیں تو میرا نام بھی یاد نہیں ہو گا۔ لیکن اب تمہارے حافظے کا امتحان نہ لوں گی۔ میں سیوجان ہوں!"

"سیوجان!" میں اس کا نام لب پر لاتے ہوئے کہتا ہوں "یہ بہت طویل نام ہے۔ میں تمہیں صرف "جان" کہوں گا!"

سیوجان یہ سن کر تبسم کرتی ہے کہ وہ پاکستان میں کچھ دن گزار آئی ہے اور "جان" کا مطلب سمجھتی ہے۔

"بم۔ بمب۔ بما۔ بمب۔ بمب" اس تمام گفتگو سے بے دخل منور اکتاہٹ کے عالم میں اپنے کزن کو "آن" کر دیتا ہے اور ہم اٹھ کھڑے ہوتے ہیں!

تقسیم چوک بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ یہاں بے شمار "پاویون" ہیں، "فولی برژ" اور "لندن نائٹ کلب" کے جلتے بجھتے نیون سائن شائقین کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ راستے میں ایک دکان "بے اوغلرا شکیے جی سی" بھی دکھائی دیتی ہے جس میں بڑے بڑے شیشے لگے ہوئے ہیں اور دیواروں پر پہلوانوں کی تصویریں آویزاں ہیں۔ باہر بے شمار کاریں کھڑی ہیں، جن میں بیٹھے لوگ چٹخارے لے لے کر کوئی مشروب پینے میں مشغول نظر آتے ہیں!

"یہ لوگ کیا پی رہے ہیں؟" میں منور سے پوچھتا ہوں جو خاموشی سے ہمارے ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے۔

"یہ اشکیے یعنی اوجڑی کا جوس پی رہے ہیں جو ترکی کا قومی مشروب ہے۔ آپ نوش جاں فرمائیں گے؟" اس کے چہرے کی مسکراہٹ بحال ہو جاتی ہے۔

چلتے چلتے سیوجان میرا ہاتھ تھام لیتی ہے، میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا ہوں پھر مطمئن ہو جاتا ہوں کہ اس انجمن میں میرے رازداں اور بھی ہیں، یعنی یہ وہ گناہ تھا جو اس شہر خوباں میں میرے ارد گرد کئی اور جوڑے بھی کر رہے تھے۔

ہم ایک سینما میں داخل ہو جاتے ہیں اور جب رات گئے فلم دیکھ کر باہر نکلتے ہیں تو سڑک پر فلم بینوں کے علاوہ بہت کم لوگ نظر آتے ہیں۔ بازار کی رونق ماند پڑ چکی ہے۔

"آؤ تمہیں گھر چھوڑ آئیں!" میں سیوجان سے کہتا ہوں۔

"میں ہاسٹل میں رہتی ہوں اور اس وقت تک ہاسٹل کے دروازے بند ہو چکے ہوں گے"۔ "تم اگر چاہو تو ہوٹل بیوک آیا صوفیہ میں قیام کر سکتی ہو۔ اس کے کمرے کھلے اور ہوادار ہیں" میں کسی کمیشن ایجنٹ کی طرح ہوٹل کے اوصاف گنواتے ہوئے کہتا ہوں! وہ ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیتی ہے اور ہم واپس ہوٹل صوفیہ پہنچ جاتے ہیں، منور کو ہم نے راستے میں اس کے گھر چھوڑ دیا تھا!

ہوٹل کے قواعد کا حوالہ دیتے ہوئے سیوجان کے لئے علیحدہ کمرہ بک کرنے کے باوجود کاؤنٹر کلرک کے چہرے پر شدید ناگواری کے آثار ابھرتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو الوداع کہہ کر اپنے اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔

رات خاموش ہے۔ ہوٹل میں مکمل سناٹا ہے۔ درودیوار میں نیند اتر رہی ہے۔ میرے کمرے کی کھڑکی کھلی ہے میں صدیوں پرانے شہر کی خوبصورتیاں اپنی آنکھوں میں سمو رہا ہوں اور پھر رفتہ رفتہ میری آنکھیں بوجھل ہونے لگتی ہیں۔ استنبول کا تمام حسن میرے سینے میں سما گیا ہے!

صبح ہوٹل سے نکلتے ہوئے نکھری نکھری سیوجان کاؤنٹر پر اپنے کمرے کی چابیاں



چھوڑتی ہے تو کلرک تیز لہجے میں اس سے کچھ کہتا ہے۔ میں نہیں سمجھ پاتا کہ اس نے کیا کہا ہے کہ اس کا اظہار ناراضی ترکی میں ہے۔ اس پر سیوجان بھی تلخ لہجے میں جواب دیتی ہے، جواباً وہ مزید اونچی آواز میں بولنے لگتا ہے۔ میں سیوجان سے صورت حال جاننے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ غصے سے لرز رہی ہے اور جواب نہیں دیتی پھر وہ دونوں زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور چہرے کے اشاروں سے شدید برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ میں پریشان ہو جاتا ہوں اور اپنے ہاتھ سیوجان کے شانوں پر رکھ کر نرمی سے صورت حال جاننے کی کوشش کرتا ہوں، جس پر وہ سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔

پھر اچانک وہ چیختی چلاتی ہوٹل سے باہر نکل آتی ہے میں سخت پریشانی کے عالم میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔

"تم مجھ سے بات نہ کرو"۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چلاتے ہوئے کہتی ہے۔ "اگر تمہاری جگہ کوئی ترک لڑکا میرے ساتھ ہوتا تو اسے قتل کر دیتا، وہ کہتا ہے تم طوائف ہو، تم نے رات ایک غیر ملکی کے ساتھ بسر کی ہے"۔

"مجھے ترکی نہیں آتی۔ میں یہ کیسے جان سکتا تھا کہ وہ تم سے کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے تم سے کتنی بار پوچھا مگر تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا"۔

"میں کچھ نہیں جانتی" سیوجان سنی ان سنی کرتے ہوئے چیخ کر کہتی ہے "اس نے تمہارے سامنے مجھے طوائف کہا اور تم چپ رہے۔ میں جا رہی ہوں، اب ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ تم مجھے ایک دفعہ پھر بھول جاؤ!"

اور پھر وہ پیر پٹختی ہوئی برابر سے گزرتی ایک ڈالش میں سوار ہو جاتی ہے! سفر میں رفاقتوں کے سورج اسی طرح طلوع ہوتے ہیں۔ اسی طرح غروب ہوتے ہیں!

# بمب، بمب، بمب، بمابمب!

"برحدورین" میں تھکے تھکے قدموں سے واپس ہوٹل کے کمرے میں پہنچتا ہوں اور منور کے سکھائے ہوئے ترکی کے چند جملوں میں سے ایک کی مدد سے آپریٹر سے لائن مانگتا ہوں!

لائن ملنے پر نمبر ڈائل کرتا ہوں تو دوسری طرف سے منور کی آواز سنائی دیتی ہے "ہیلو"...... بیک گراؤنڈ میوزک کے طور پر اس کے کزن کی "بم، بمب، بمابم" بھی سنائی دے رہی ہے۔ گویا منور اپنے پاکستانی کزن کے منہ سے بجائے ہوئے طبلے کی ٹیپ سے مسلسل محظوظ ہو رہا تھا!

"میں عطا بول رہا ہوں"۔

"شکر ہے تم نے وضاحت کر دی" منور بہت خوشگوار موڈ میں تھا "میں سمجھا شاید کے ایل سہگل کا فون ہے۔ یہ آج تمہاری آواز میں اتنا سوز کیوں ہے؟"

"بک بک بند کرو، میں بہت اداس ہوں"۔

"کیوں، سیوجان نے کچھ کہا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اس کی اپنی آواز میں سوز پیدا ہو گیا؟

"ہاں کچھ ایسا ہی معاملہ ہے!"

"میں تو کل تمہیں منع کرنا چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ اس مصیبت کو دعوت نہ دو" منور کے اس جملے سے اس کی دلی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی!

"جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا۔ اب تم میری طرف فوراً پہنچو، مجھے تمہاری ضرورت ہے!"



میں نے کہا۔

"میں آرہا ہوں میرے عزیز دوست، میں آرہا ہوں۔ تم میرا انتظار کرو" اس نے ہنستے ہوئے فلمی انداز میں یہ ڈائیلاگ ادا کیا۔ وہ ایک دفعہ پھر خوشگوار موڈ میں نظر آرہا تھا!

تھوڑی دیر بعد وہ میرے کمرے میں تھا۔

میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے شروع سے آخر تک ساری کہانی سنائی

"میں تمہاری اس گفتگو سے صرف ایک نتیجے پر پہنچا ہوں" منور نے میری کہانی سن کر کہا۔

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"جب ہوٹل کا بکنگ کلرک، سیوجان سے الجھ رہا تھا اور ہتک آمیز جملے کہہ رہا تھا۔ تم صرف اس لئے خاموش تھے کہ تمہیں ترکی نہیں آتی تھی، جس پر سیوجان تم سے ناراض ہو گئی کہ تم اس کی ہتک پر خاموش کیوں رہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے، مگر یہ اس کی حماقت تھی کیونکہ مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ وہ کس بات پر جھگڑ رہے ہیں؟"

"بہر حال میں اس صورت حال سے جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ کاش سیوجان تمہاری بجائے میرے ساتھ ہوتی۔ کیونکہ مجھے ترکی زبان پر عبور حاصل ہے!"

"لعنت ہے تم پر!" میں نے جل کر کہا "مگر تمہاری صلاحیتوں کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ ترکی پر عبور کا تمہیں زیادہ سے زیادہ فائدہ یہ ہوتا کہ تم بکنگ کلرک کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو جاتے...... تاہم میرے خیال میں ابھی کچھ نہیں بگڑا تم اگر چاہو تو اس سنہری موقع سے اب بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو کیونکہ وہ ترک بچہ اس وقت بھی ڈیوٹی پر ہے!"

یہ سن کر منور نے اپنی عینک کے شیشوں میں مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر خاموشی سے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا، جس میں اس کے پاکستانی کزن نے منہ سے طبلہ بجانے کے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ بمب، بمب، بمب، بمابم!

# ٹرکش باتھ

"تم نے ٹرکش باتھ کے بارے میں یقیناً سنا ہوگا؟" منور نے ہوٹل سے نکلتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں، سنا ہے، پڑھا ہے اور فلموں میں دیکھا بھی ہے: مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" میرے لہجے میں خاصی بے تابی تھی۔

"میرے خیال میں تمہیں آج ٹرکش باتھ کی اشد ضرورت ہے!" منور نے ہنستے ہوئے کہا "استنبول میں آکر ٹرکش باتھ سے محروم رہنا ایسے ہی ہے کہ انسان روم جائے اور پوپ کے درشن سے محروم رہے۔ ویسے ٹرکش باتھ ترکوں سے بس منسوب ہی ہو گیا ہے۔ اس کے اصل مراکز کہیں اور ہیں"۔

"مجھے تاریخ سے دلچسپی نہیں، جغرافیے سے ہے، مجھے تم صرف محل وقوع بتاؤ!"

"ایک حمام تو یہاں سے بالکل قریب ہے۔ اگر موڈ ہے تو چلے چلتے ہیں"۔ "تم ایک منٹ یہیں رکو" میں نے کہا "میں تولئے کے سلسلے میں بہت وہمی ہوں میں کمرے سے اپنا تولیہ لے کر آتا ہوں!"

اب تولیہ میرے کاندھے پر تھا اور میں منور کے کاندھے سے کاندھا ملائے ہوٹل گل خانہ چنار والی سڑک پر گامزن تھا۔ عرفان بے اپنے ہوٹل کے باہر کھڑا تھا، اس نے مجھے گرم جوشی سے السلام علیکم کہا اور ٹرکش کافی کی دعوت دی مگر ایک تو مجھے اس وقت ٹرکش باتھ سے دلچسپی تھی اور دوسرے ٹرکش کافی میں ایک دفعہ پہلے چکھ چکا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا، یہ محمت کینار تھا جو گزشتہ روز نشے کی حالت میں



حمال (مزدور) سے ضد کر رہا تھا کہ وہ پیسے لے کر اسے کاندھوں پر بٹھا کر گھر چھوڑ کر آئے۔ محمت کینار آج ہوش میں تھا!

"اس لکڑ کو جانتے ہو!" منور نے اپنا مخصوص لفظ استعمال کرتے ہوئے محمت کینار کو مخاطب کر کے کہا۔ مجھے اس فقرے میں سے صرف لفظ لکڑ کی سمجھ میں آئی تھی۔

محمت کینار نے غور سے مجھے دیکھا جیسے کچھ کچھ پہچان گیا ہو!

"یہ میرا دوست عطا ہے، پاکستانی ہے، اس وقت امریکہ سے آرہا ہے۔ کل تم اسے ملے تھے!"

"پاکستانی؟ مسلمان؟ الحمدللہ، کاروش!" محمت کینار مجھ سے لپٹ گیا!

"اب یاد رکھو کہ آج تم نے اس کے ہپیوں جیسے حلیے کے باوجود پاکستانی مسلمان تسلیم کر لیا ہے جب کہ کل تم انکاری تھے۔ آئندہ اگر ملو تو نشے میں بھی اپنی بات پر قائم رہنا!" منور ساتھ ساتھ میرے لیے ترجمہ کرتا جا رہا تھا!

"یہ شراب بہت بری چیز ہے" محمت کینار کھسیانا ہو رہا تھا "میں عنقریب یہ چھوڑ دوں گا!"

"اپنے فقرے کی اصلاح کرو"۔ منور نے ہنستے ہوئے کہا "کہو کہ میں عنقریب پھر چھوڑ دوں گا!"

محمت کینار نے رخصت ہوتے وقت ایک دفعہ پھر مجھ سے معانقہ کیا اور "پاکستانی، مسلمان، الحمدللہ، کاروش کاروش" کہتے ہوئے گالوں پر چٹاخ چٹاخ بوسے ثبت کر دیئے!

ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ بوسیدہ سی پتلون اور فیلٹ پہنے ہوئے ایک معمر سے ترک نے میرا راستہ روک لیا اور پھر میرے کاندھے پر دھرا تولیہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے ترکی زبان میں کچھ کہا۔ منور نے کھڑ کھڑ ہنسنا شروع کر دیا! اور پھر چند جملے ترکی زبان میں ادا کیے۔

"یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں...... یہ تم سے پوچھ رہا تھا کہ تم نے یہ تولیہ کتنے میں بیچنا ہے۔ میں نے کہا یہ تولیہ بیچنے کے لئے نہیں کیونکہ اپنا سارا سامان فروخت کرنے کے بعد اب اس کے پاس صرف یہ تولیہ رہ گیا ہے!" منور نے ایک بار پھر ہنسنا شروع کر دیا!

"تم یہ دانت نکالنے بند کرو اور مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اس نے میرے کاندھے پر سے تولیہ کھینچنے کی جرات کیونکر کی؟"

"اس میں جرات یا جسارت کی کوئی بات نہیں!" منور نے سنجیدہ ہو کر کہا" میں نے تمہیں کل بھی بتایا تھا کہ محنت مزدوری کے لئے جرمنی جانے کے خواہشمند پاکستانیوں کو فراڈ قسم کے ریکروٹنگ ایجنٹ استنبول میں لا کر چھوڑ دیتے ہیں اور خود فرار ہو جاتے ہیں۔ یہاں ان بے چاروں کا پرسان حال کوئی نہیں ہوتا چنانچہ وہ جرمنی جانے کی معصوم سی امید کے سہارے استنبول میں ڈیرہ جما دیتے ہیں اور اپنے قیام کے اخراجات پورے کرنے کے لئے آہستہ آہستہ اپنا سامان بیچنا شروع کر دیتے ہیں، کئی پاکستانی تو اپنے ساتھ ایسی چیزیں بھی لائے ہوتے ہیں جن کے دام یہاں اچھے مل جاتے ہیں۔ یہ شخص تمہیں بھی ان پاکستانیوں میں سے ایک سمجھا ہے!" منور نے اپنی بات ختم کی تو اس شخص نے ایک دفعہ پھر منور کو مخاطب کر کے کچھ کہا۔

"یہ پوچھ رہا ہے کہ تمہارے دوست نے تولئے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟" منور نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے جواب میں منور کو صرف جلالی انداز میں دیکھا جس پر اس نے فوراً قدم آگے بڑھا دیئے اور تھوڑی دیر بعد ہم ایک پرانی طرز کی عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔

"تمہاری منزل مقصود آ گئی ہے۔ تم اس وقت عین حمام کے سامنے کھڑے ہو!"

یہ حمام گنبد نما تین چار کمروں پر مشتمل تھا، جن میں بھاپ سے غسل دیا جاتا تھا۔ ان



کمروں میں داخل ہونے سے پہلے اور واپسی پر نہانے کے لئے تالاب بنا ہوا تھا۔ مساج کا بھی بندوبست تھا مگر یہ غسل اور مساج گاہک کو خود نہیں کرنا پڑتا تھا۔ "اب تم غسل کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر مساج کرانا چاہتے ہو تو مساج کے لئے بھی! لیکن تم آنکھیں بند کر لو، جب تمہیں اپنے جسم پر ایک ملائم سا ہاتھ محسوس ہو، اس وقت آنکھیں کھولنا!"

"وہ کیوں؟"

"تم ٹرکش باتھ لے رہے ہو، کاکا ہیئر ڈریسر کے گرم حمام پر نہیں آئے ہو!" میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے بہت پیار سے میرے گالوں کو تھپتھپایا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں میرے سامنے ایک باریش بزرگ ایک ہاتھ میں نیکر اور دوسرے میں جھانواں پکڑے کھڑے تھے!

"یہ نیکر پہن کر لیٹ جاؤ" منور ہنستے ہنستے بے حال ہو رہا تھا" یہ بزرگ تمہیں غسل دیں گے اور جھانویں سے تمہاری کمر بھی ملیں گے!"

پنجابی بولتے ہوئے بھی میری پنجابی اتنی اچھی نہیں ہے، لیکن اس وقت میں نے محسوس کیا کہ مجھے بعض نئی ترکیبیں اور جملے سوجھ رہے ہیں اور میں نے منور پر اس نادر وو کیبولری کا اتنا بر محل استعمال کیا کہ خود اس نے لوٹ پوٹ ہو کر ان جملوں کے فنی حسن پر بے ساختہ داد دی!

# تم پر سلام ہو!

غسل کے لئے اس بزرگ کو تکلیف دینے کی بجائے یہ زحمت میں نے خود اٹھالی تھی بلکہ وضو بھی کر لیا تھا کہ نماز کا وقت قریب تھا، میں بدقسمتی سے عبادات کے معاملے میں ایک گنہگار مسلمان ہوں، لیکن امریکہ میں قیام اور یورپ کے اس سفر کے دوران اکثر نماز کی طرف جی راغب ہوتا تھا اور آج اپنے خدا کے سامنے سربسجود ہونے کو جی پھر مچل رہا تھا!

مسجد کا اندرونی حصہ بالکل پاکستان کی مسجدوں جیسا تھا، یہاں اللہ اور محمد ﷺ کے علاوہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے اسمائے مبارک سامنے والی دیوار پر جلی حروف میں درج تھے۔ دیوار پر آویزاں ایک کیلنڈر پر نماز کے اوقات درج تھے، ایک الماری میں قرآن مجید کے نسخے رکھے ہوئے تھے نمازیوں کی تعداد بھی اتنی ہی تھی، جتنی ہماری مسجدوں میں نظر آتی ہے، ان میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی اور جوانوں کی تعداد نسبتاً کم تھی، جب ہم مسجد میں پہنچے نماز کے لئے صفیں درست ہو رہی تھیں، کوٹ پتلون میں ملبوس ترک خدا کے حضور سجدہ ریز ہو رہے تھے۔ ہم میں اور ترکوں میں ایک قدر مشترک ہے بلکہ ترک اس معاملے میں ہم سے دو ہاتھ آگے ہیں یعنی ترکی کے بڑے شہروں میں عورتیں اور مرد مغربی تہذیب میں سر سے پاؤں تک غرق نظر آتے ہیں، عورتیں منی سکرٹ پہنتی ہیں، اخباروں میں کھلم کھلا عریاں تصویریں شائع ہوتی ہیں، بڑے شہروں میں شراب بر سر عام فروخت ہوتی اور پی جاتی ہے بلکہ ٹرینوں میں بھی دستیاب ہے، ترکی کا آئین مکمل طور پر سیکولر ہے، لیکن یہ ایک ناقابل فہم سی بات ہے کہ جو ترک مغربی تہذیب میں



سر سے پاؤں تک غرق ہیں، وہ بھی جذباتی طور پر انتہائی کٹر مسلمان ہیں اور ایسے مواقع پر یوں لگتا ہے جیسے ان جسموں میں روحیں کسی اور کی ہیں! عدنان میندریس نے اتاترک کمال پاشا کے بعض ایسے اقدامات کو ریاستی سطح پر کالعدم قرار دیا تھا جو دین کی بنیادی روح سے متصادم تھے چنانچہ وہ آج بھی ترکی کے چھوٹے شہروں اور قصبات وغیرہ میں بے حد مقبول ہے۔ واضح رہے ترکی کے بڑے شہروں اور چھوٹے شہروں کے تمدن اور فکری لہر میں بہت نمایاں فرق ہے!

امام صاحب نے سورۃ فاتحہ کے بعد انا اعطیناك الكوثر کی قرات شروع کی، ترک "ک" ادا نہیں کر سکتے، وہ "ک" کو "چ" میں تبدیل کر دیتے ہیں چنانچہ امام صاحب نے جب "انا اعطینا چل چوثر" اور "اللہ اچبر" کہا تو مجھے یہ انداز بہت بھلا لگا۔ "ک" کے ساتھ ترکوں کے تعلقات اتنے کشیدہ ہیں کہ وہ "اتاترک" کو بھی "اتاترچ" کہتے ہیں!

نماز سے فراغت کے بعد منور نے امام صاحب سے میرا تعارف کرایا، پاکستان کا نام سن کر میں نے ان کے چہرے پر وہی روشنی دیکھی جو ہر ترک مسلمان کے چہرے کو پہلے سے زیادہ خوبصورت بنا دیتی ہے!

منور کے ساتھ سارا دن استنبول کی گھاٹیاں اترنے اور چڑھنے کے بعد جب میں رات کو اپنے ہوٹل بیوک آیا صوفیہ پہنچا تو میرا جسم تھکن سے چور تھا۔ بکنگ کلرک آج صبح کے واقعے سے کچھ نادم سا لگتا تھا۔ اس نے میرے کمرے کی چابی مجھے تھماتے ہوئے بہت گرمجوشی سے ہیلو کہا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ روشنیوں سے جگمگ جگمگ کرتا استنبول میری نظروں کے سامنے تھا، اور مسجدوں کے اس شہر کے ہزاروں خوبصورت مینار میرے سامنے فخر سے سینہ تانے کھڑے تھے...... مجھے ان لمحوں میں اچانک محسوس ہوا کہ میں قسطنطنیہ میں ہوں۔ 1451ء..... سلطان محمد فاتح اپنے بحری جہازوں کو تختوں پر لگی چربی کی مدد سے دھکیل کر انہیں رومیوں کے

ناقابل تسخیر قلعے تک لے جاتا ہے۔ رومی فوج قلعے کے باہر، خشکی پر، منجنیقوں سے لیس بحری جہازوں کو دیکھتی ہے تو اسے جنوں بھوتوں کا کارنامہ سمجھ کر ان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور قلعہ فتح ہو جاتا ہے ایک اور بڑی بادشاہت کے کنگرے گر جاتے ہیں۔ اس سے قبل کتنی ہی مرتبہ یہ کوشش ناکام ہو چکی تھی اور ہزاروں سرفروش اس قلعے کے سامنے جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ جن کے دروازے پر حضور اکرمؐ کی اونٹنی پہنچ کر رک گئی تھی، اسی قلعے کی دیوار کے ساتھ مدفون ہیں! میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچتا ہوں، اپنے ہاتھ اپنے سینے پر باندھ کر مودب کھڑا ہو جاتا ہوں اور ان شہیدوں پر سلام بھیجتا ہوں! تم پر سلام ہو ان رستوں پر چلنے والو، جو رستے ہم سے روٹھ گئے ہیں، تم پر سلام ہو ان منزلوں کو چھونے والو! جو منزلیں ہم سے دور ہو گئی ہیں اور تم پر سلام ہو اس موت سے محبت کرنے والو جو ہماری زندگیوں سے ارفع و اعلیٰ ہے!

گہرے پانیوں پر تیرنے والے نیلے پرندو! تم پر سلام ہو!



# ترک ملی طلبہ

استنبول میں منور کی موجودگی نے میرے بہت سے مسئلے حل کر دیئے تھے، جن میں سے سرفہرست زبان کا مسئلہ تھا، وہ استنبول میں میرا دوست بھی تھا اور گائیڈ بھی۔ ”تمہیں پتہ ہے، آج میں تمہیں کہاں لے جا رہا ہوں؟“ منور مجھ سے پوچھ رہا تھا!

”ٹرکش باتھ کے علاوہ جہاں مرضی لے جاؤ!“ میں نے کہا ہم نے ہاتھ دے کر ایک ڈالش کو روکا اور تھوڑی دیر بعد ہم ایک جدید طرز کی بلڈنگ کے باہر کھڑے تھے۔

”یہ ترک ملی طلبہ کا صدر دفتر ہے۔ اس تنظیم کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

”تم نے سرسری طور پر اس کا ذکر کیا تھا!“

”بعض دوسرے اسلامی ملکوں کے علاوہ ترکی میں بھی دائیں اور بائیں بازو کی جنگ زوروں پر ہے۔ یہ نظریاتی تقسیم طلبہ میں بھی ہے اور ان میں تصادم بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ترک ملی طلبہ دائیں بازو کے طلبہ کی نمائندہ تنظیم ہے جو ترکی میں احیائے اسلام کے لئے کام کر رہی ہے اور اسے گزشتہ برسوں میں بہت نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ ویسے رائٹ اور لیفٹ کے سلسلے میں تمہارا موقف کیا ہے؟“

”میں رائٹ یا لیفٹ میں نہیں رائٹ یا رانگ میں یقین رکھتا ہوں!“

”ہیئر، ہیئر“ منور نے تالی بجاتے ہوئے کہا ”کومٹ منٹ سے بچنے کے لئے اس سے بہتر جواب نہیں ہو سکتا!“

”میں کومٹ منٹ سے انحراف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں!“ میں ان لمحوں میں اچانک سنجیدہ ہو گیا ”میرے نزدیک کیپٹلزم انسانیت کے لئے ہولناک ترین نظام ہے اور

سوشلزم اس ناسور کی کامیاب سرجری کرتا ہے مگر ہر آپریشن کے دوران پیٹ میں کبھی قینچی، کبھی تولیہ اور کبھی کاٹن رہ جاتی ہے، جس کے لئے ایک آپریشن اور کرنا پڑتا ہے اور یوں چیر پھاڑ کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جسے جدلیاتی عمل کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود میرے نزدیک سوشلزم، کیپٹلزم کے مقابلے میں ایک کمتر برائی ہے۔ مارکس ایک دردمند انسان تھا، اس کی تشخیص ٹھیک تھی صرف علاج میں خامیاں تھیں ویسے میں دیانتداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان دونوں نظاموں کے مقابلے میں انسانیت کو ایک تیسرے نظام کی ضرورت ہے؟"

"یہ تیسرا نظام کون سا ہو سکتا ہے!"

"یہ تو میں نہیں جانتا، لیکن میرے خیال میں اس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر استوار کی جاسکتی ہے اور اس نظام کی تفصیلات طے کرتے ہوئے ہم دوسرے نظاموں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ نظام جبر اور اختیار کی درمیانی شکل پر مبنی ہونا چاہئے اور اس کا مقصود دنیا میں فلاحی مملکتوں کا قیام ہو۔ عمر فاروقؓ کا دور حکومت میرا آئیڈیل ہے!"

"بمب، بمب، بمب، بمابمب!" منور نے اپنے پاکستانی کزن کے منہ سے بجائے ہوئے طبلے کی کیسٹ آن کر دی تھی! یہ اس کے بور ہو جانے کا سگنل تھا!

ہم اس دوران سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دوسرے فلور پر پہنچ چکے تھے! اور تھوڑی دیر بعد ہم ایک کانفرنس روم میں تھے۔ یہاں ایک بڑی میز کے گرد خوبصورت ترک نوجوان بیٹھے تھے، ان کے سامنے فائلیں دھری تھیں ان کے چہروں پر سوچ کی گہری لکیریں تھیں، وہ غالباً کسی اہم مسئلے پر میٹنگ میں مشغول تھے!

کمرے میں منور کی اچانک آمد سے وہ سب کچھ حیران سے نظر آرہے تھے، اس اثناء میں صدارتی کرسی پر بیٹھا ہوا ایک نوجوان اپنی نشست سے اٹھا اور اس نے منور سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا!



"میں آپ لوگوں کو کبھی اس طرح ڈسٹرب نہ کرتا، مگر میں آپ کو اپنے پاکستانی دوست سے ملانا چاہتا تھا جو امریکہ سے واپسی پر پاکستان کی طرف سفر کرتے ہوئے تھوڑے دنوں کے لئے یہاں رکا ہے اور اب کل ارض روم کے رستے واپس وطن جا رہا ہے!" منور کی گفتگو میں اتنے سارے مانوس الفاظ سے میں اس کے فقرے کا مفہوم سمجھ گیا تھا!

"پاکستان" کا لفظ سن کر میٹنگ میں موجود نوجوانوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے اور انہوں نے اپنی نشستوں سے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔

"پاکستان اسلام کا قلعہ ہے، ہم پاکستان سے عشق کرتے ہیں!" میٹنگ کی صدارت کرنے والے نوجوان نے گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا...... اور اس کے ساتھ ہی اس نے سب ساتھیوں سے فرداً فرداً میرا تعارف کرانا شروع کر دیا...... تعارف کرانے والا نوجوان ترک ملی طلبہ کا صدر تھا اور دوسرے ارکان میں اس ملک گیر تنظیم کے جنرل سیکرٹری کے علاوہ دیگر اہم ارکان شامل تھے!

تنظیم کے صدر نے جنرل سیکرٹری کو اجلاس جاری رکھنے کے لئے کہا اور مجھے اور منور کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

"مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ آپ ایسے وقت میں آئے ہیں۔ جب ہم بے حد مصروف ہیں، ورنہ ہم آپ کو اپنی تنظیم کے بارے میں تفصیل سے بتاتے اور اپنے کارکنوں سے آپ کی اجتماعی ملاقات کراتے" اس خوبرو نوجوان نے منور کی وساطت سے مجھے کہا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ایک آدھ دن استنبول میں رک جائیں؟" میری طرف سے معذرت پر اس نے کہا "ہم آپ سے امید کرتے ہیں کہ آپ آئندہ جب کبھی آئیں گے، ہمارے مہمان کے طور پر آئیں گے" اور وہ مجھے عمارت کے دوسرے حصے دکھانے کے لئے مختلف کمروں میں لے گیا۔

ترک ملی طلبہ کی کارکردگی میرے لئے بہت متاثر کن تھی۔ اس کمپلیکس میں نوجوانوں کی نظریاتی تربیت کے علاوہ ان کے لئے تفریحی سہولتوں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا، چنانچہ یہاں لائبریری کے علاوہ ایک چھوٹے سے ہال میں طلبہ کے لئے مختلف ان ڈور کھیلوں کا بھی انتظام تھا، جہاں نوجوان ٹیبل ٹینس وغیرہ کھیلنے میں مشغول تھے۔ ایک بڑے آڈیٹوریم میں موجود طالبات منی اسکرٹ میں نہیں بلکہ مکمل ستر پوشی کے لباس میں تھیں اور انہوں نے سروں کو سکارف سے ڈھانپا ہوا تھا! میں جسے طلبہ کی ایک تنظیم کا صرف دفتر سمجھا تھا، وہ ایک پورا سیکرٹریٹ تھا، جہاں تنظیمی امور پر بحث مباحثے کے علاوہ نئی نسل کی تربیت کے کتنے ہی عملی پہلوؤں کو مد نظر رکھا گیا تھا!

میں نہیں جانتا ان نوجوانوں کے پیش نظر محض اخلاقی انقلاب تھا یا معاشی انقلاب بھی ان کی ترجیحات میں شامل تھا، جو مسلم امہ کو سپرپاورز کی دریوزہ گری سے نجات دلا سکے مگر مجھے یہاں آ کر ایک عجیب طرح کی مسرت ہوئی تھی، ایسی مسرت جو انسان خود کو اپنوں کے درمیان پا کر محسوس کرتا ہے!



# ارض روم میں

منور مجھے استنبول یونیورسٹی بھی لے گیا اور یہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ جہاں سے میں آیا ہوں یا وہ علاقہ ترکی کی حدود میں شامل نہیں ہے اور یا یہ یونیورسٹی ترکی کی حدود سے باہر ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں ایک آزاد خیال سے آزاد خیال ترک میں بھی ملی عصبیت موجود ہے اور ایک دفعہ پھر اس کا اندازہ مجھے یہاں متعدد ”میموں“ جیسی طالبات سے گفتگو کے دوران ہوا۔

منور ابھی مجھے بہت سے مقامات دکھانا چاہتا تھا جن میں نائٹ کلبوں کے ”مقامات آہ و فغاں“ بھی شامل تھے جہاں ستر پوشی کا تصور وہ دو گلاب کے پھول بھی نہیں ہیں، جن کا اہتمام یورپ کے کئی نائٹ کلبوں میں کیا جاتا ہے...... لیکن مجھے آج بہر حال صورت ارض روم کے لئے روانہ ہونا تھا، جہاں سے تہران، مشہد اور زاہدان کے راستے میں جلد سے جلد واپس پاکستان جانا چاہتا تھا...... پاکستان جس کے در و بام سے جدا ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ میں اپنے ہم وطنوں، اپنے دوستوں اور اپنے عزیزوں کی بانہوں میں لوٹنا چاہتا تھا۔ میں ہوٹل سے نکلتے ہوئے سامان کی پیکنگ کر کے آیا تھا اور مجھے صرف اتنا کرنا تھا کہ بل ادا کر کے ریلوے اسٹیشن پہنچنا تھا ٹرین کی ٹکٹ میں خرید چکا تھا اور اب اس کی روانگی میں بہت کم وقت رہ گیا تھا!

ہوٹل کے کاؤنٹر پر بل ادا کرتے ہوئے کاؤنٹر کلرک نے میرے لئے الوداعی کلمات کہے اور اس کے ساتھ ہی ایک لفافہ مجھے تھما دیا! میں نے وہیں کھڑے کھڑے لفافہ چاک کیا۔ یہ سیوچان کا خط تھا!

عطا! مجھے افسوس ہے کہ میں ناحق تم سے خفا ہوئی۔ اس سارے معاملے میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تمہیں ملنے کے لئے آئی تھی، مگر تم ہوٹل میں موجود نہیں تھے...... میں شام کو چھ بجے آؤں گی، میرا انتظار کرنا!

سیو جان!

مسافر انتظار کی لذت سے محروم ہوتے ہیں۔ ارض روم کی طرف لے جانے والی ٹرین میں بیٹھے ہوئے میں نے سیو جان کے خط کو بوسہ دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سیو جان!

ارض روم ترکی کا مشہور قصبہ ہے اور اس کی شہرت زلزلوں کی وجہ سے بھی ہے۔

میرا یہاں قیام کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن 38 گھنٹے کے طویل سفر نے مجھے تھکا دیا تھا۔ ازمیر سے گاڑی سمندر کے ساتھ ساتھ چلنا شروع ہو جاتی ہے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف سمندر ناقابل فراموش منظر ہے۔ ٹرین ترکی کے بہت سے شہروں کے اندر سے ہو کر گزرتی ہے چنانچہ ٹرین میں بیٹھے بیٹھے انقرہ دیکھنے کا موقع بھی مل گیا تاہم 38 گھنٹے کے سفر کی تھکاوٹ اپنی جگہ تھی۔ چنانچہ ارض روم پہنچتے ہی میں نے یہاں کے سب سے بڑے ہوٹل "پولت" کا رخ کیا اور چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد قصبے کی سیر کو نکل گیا۔ میری ملاقات یہاں پاکستانی نوجوانوں سے ہوئی جن کی منزل جرمنی تھی۔ ان کا تعلق انتہائی مفلوک الحال گھرانوں سے تھا اور یہ نیم خواندہ لوگ تھے۔ ان میں سے ایک صاحب کو ان کے ہمراہی "ڈاکٹر صاحب" کہتے تھے، میں نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ احباب نے یہ ڈگری انہیں جہالت میں ڈاکٹریٹ کے حوالے سے دی ہے۔ موصوف نے سوٹ پہنا ہوا تھا جس پر اتنی سلوٹیں تھیں کہ لگتا تھا گھڑے میں سے نکال کر پہنا ہے۔ انہوں نے گلے میں ایک ازار بند باندھا ہوا تھا جسے وہ نکٹائی قرار دیتے تھے۔



انگریزی کے ایک فقرے پر انہیں عبور حاصل تھا اور یہ فقرہ "ڈو یو نو انگلش؟" تھا جو وہ ہر یورپین ٹورسٹ کے پاس بنفس نفیس پہنچ کر دہراتے تھے اور جب وہ جواب میں بیزاری سے "نو" کہتا تو ان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھتا۔ ایک ٹورسٹ سے جب انہوں نے "ڈو یو نو انگلش؟" والا سوال کیا تو اس ستم ظریف نے جواب میں "یس!" کہہ دیا، جس پر موصوف اتنے آزردہ ہوئے کہ ایک لمحے کے لئے بھی اس کے پاس رکنا گوارا نہیں کیا۔

ان سیدھے سادے پاکستانیوں میں ایک تیز و طرار شخص بھی تھا، اس کے چہرے سے عیاری ٹپکتی تھی، اس کا نام طاہر تھا۔ یہ پھیرے باز تھا۔ پھیرے باز اسمگلروں کی ایک قسم ہے اسمگلر چوری چھپے مال سمگل کرتے ہیں جب کہ پھیرے باز متعلقہ حکام سے مل کر بارڈر کے رستے کھلم کھلا مال سمگل کرتے ہیں، اس شخص کو اپنی کاروباری ضرورت کے مطابق ترکی بھی آتی تھی، یہ شراب کا رسیا تھا، جب میری اس سے ملاقات ہوئی اس وقت بھی یہ حضرت نیم مدہوش تھے!

"آپ امریکہ سے واپس کیوں آ گئے، کیا گرین کارڈ نہیں ملا؟" طاہر نے پوچھا۔ "ایک سوا ایک گرین کارڈ چھوڑ کر آ رہا ہوں کیونکہ ہر امریکی لڑکی وہاں گرین کارڈ ہے!"

"تو پھر پاکستان میں اعلیٰ ملازمت کی پیش کش ہوئی ہوگی؟"

"ہاں۔ واپس جا کر اپنی تین سو تیئیس روپے ماہوار کی نوکری جائن کر لوں گا!"

"امریکہ میں آپ کیا کرتے تھے؟"

"ایک ایگزیکٹو پوسٹ پر تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ گھر ایئر کنڈیشنڈ کار، جوانی کے دن مرادوں کی راتیں......!"

"اور پاکستان میں؟"

"بسوں میں دھکے، ٹوٹی سڑکیں گرد و غبار!"

"تو پھر آپ کیوں واپس جا رہے ہیں؟"

میں اس کی اس بات کا کیا جواب دیتا۔ میری بات اسے تو کیا، امریکہ میں مقیم دوستوں کو بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ لیکن پھر میں نے سوچا اسے اس کی سطح پر بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے یقین تھا وہ پاکستانی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتا ہوگا۔

"یاری دوستی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "یاروں کے لئے تو جان بھی قربان کی جاسکتی ہے" اس نے فلمی انداز کا ڈائیلاگ دہرایا۔

"تو بس تم یوں سمجھ لو کہ پاکستان کے ساتھ میری یاری ہے، میں زیادہ دیر تک اس سے دور نہیں رہ سکتا!"

مگر لگتا تھا اسے میری یہ بات دل کو نہیں لگی۔ چنانچہ اس نے اپنا بیگ گلے میں لٹکایا اور کہا "آئیں جی، ایک چکر ذرا بازار کا لگاتے ہیں!"

یہ بازار، "بازار حسن" تھا۔ لوہے کے پنجرہ نما کیبنوں میں مختلف عمروں کی عورتیں برہنہ بیٹھی تھیں۔ انہوں نے صرف زیر جامہ پہنا ہوا تھا۔ ان پنجروں کے باہر ایجنٹ حضرات کرسی میز پر بیٹھے رقم وصول کرنے کے بعد ایک ٹوکن ایشو کرتے تھے اور پھر گاہک کے لئے پنجرے کا دروازہ کھل جاتا تھا۔ یہ عورتیں گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہیجان انگیز حرکتوں میں مشغول تھیں یہ ایک مکروہ منظر تھا جس سے کسی "سفلے" ہی کے سفلی جذبات مشتعل ہوسکتے تھے۔ ایک فربہ عورت تماشائیوں کی طرف منہ کئے ایک بوڑھے ملازم سے اپنے جسم کے ایسے حصے کا مساج کرا رہی تھی جس کے لئے اس بزرگ کے دونوں ہاتھ ناکافی ثابت ہو رہے تھے۔ یہاں بہت سے یورپین ٹورسٹ بھی گھوم رہے تھے اور غلیظ فقرے ہواؤں میں اچھال رہے تھے۔ عورت کی یہ تذلیل دنیا کے ہر اس خطے میں ہوتی ہے جہاں کیپٹلزم کا عفریت مادی سہولتوں کے نام پر انسان کو اس کی تمام اخلاقی، سماجی اور قومی وفاداریوں سے منحرف کر دیتا ہے۔

جب میں "ڈاکٹر صاحب" اور طاہر کے ساتھ انسانوں کی اس منڈی سے باہر نکلا تو



میرا جی چاہا کہ میں سجدہ ریز ہو کر اپنے خدا سے فریاد کروں کہ اے باری تعالیٰ! تو نے انسان کو اتنا بوالہوس کیوں بنایا ہے کہ ہوس کو نظام کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور اس نظام کا رزق بننے والے رضاکارانہ طور پر اپنے گھروں کو چھوڑ کر پنجروں میں آباد ہو جاتے ہیں؟

ارض روم کی گلیوں میں گھومتے ہوئے ایک گراؤنڈ میں والی بال کھیلتے نوجوانوں سے مسجد کا پوچھا تو وہ کھیل چھوڑ کر سب کے سب ایک قافلے کی صورت میں ہمارے ساتھ چل پڑے۔ ان میں ایک تیرہ سالہ بچہ بھی تھا۔

"پاکستان؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں پاکستان!" میں نے جواب دیا!

"مسلمان!" یہ اس کا سوال نہیں تھا بلکہ اس یقین کا اظہار تھا کہ تم مسلمان ہی ہو گے، مگر اس کا اگلا سوال انتہائی دلچسپ تھا!

"حنفی؟"

"ہاں...... حنفی!" میں نے جواب دیا!

یہ سن کر اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا اور اس نے گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "الحمد للہ الحمد للہ!"

وضو کرنے کے بعد نماز کی نیت باندھنے سے پہلے میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ سب نوجوان جو ہمیں مسجد کے اندر تک لے آئے تھے بلکہ وضو میں بھی شریک ہوئے تھے، غائب ہو چکے تھے۔ ان غائب ہونے والوں میں وہ تیرہ سالہ بچہ بھی شامل تھا جس نے میرے حنفی ہونے پر وفور مسرت سے "الحمد للہ الحمد للہ" کہا تھا!

ترکی کے اس قصبے میں، انسانوں کی متذکرہ منڈی کے علاوہ استنبول سے بالکل مختلف فضا تھی، یہاں مغربی تہذیب کا غلبہ نہیں تھا۔ ارض روم کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے دریچوں میں سے جھانکتی سیاہ آنکھیں ایک جھلک دکھاتیں اور پھر کشمیری سیبوں جیسے گلاب

حیا سے تمتما اٹھتے۔ طاہر یہاں بھی میرے ساتھ تھا!۔ "استنبول جاتے ہوئے ایک دفعہ ارض روم میں میرا "دارو" ختم ہو گیا!" طاہر ارض روم کی ایک نئی جہت سے مجھے آگاہ کرنا چاہتا تھا" میں ایک دکاندار کے پاس گیا اور پوچھا کہ شراب کی دکان کہاں ہے؟ اس نے ناراضگی سے نفی میں سر ہلایا، ایک اور دکاندار سے پوچھا اس نے بھی بے رخی کا مظاہرہ کیا۔ بالآخر میں ایک تیسری دکان پر پہنچا اور دکاندار سے پوچھا کہ یہاں شراب کہاں سے مل سکتی ہے؟ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر کہا "مجھے علم ہے کہ شراب کی دکان کہاں ہے، مگر میں تمہیں اس کا پتہ نہیں بتاؤں گا کیونکہ الحمدللہ میں مسلمان ہوں!"



# آمنا وصدقنا

ارض روم سے جدائی کا لمحہ آن پہنچا تھا۔ اب میری منزل تہران تھی اور مجھے یہاں بھی قیام نہیں کرنا تھا بلکہ اب پاکستان تک میرا پڑاؤ کہیں نہیں تھا۔ یہ "سالک" اب مقامات میں نہیں کھونا چاہتا تھا لیکن کئی گھنٹے کے سفر کے بعد بازرگان کے بارڈر سے جب میں ایران میں داخل ہوا تو پتہ چلا کہ آخری بس گزر چکی ہے، چنانچہ مجھے رات رکنا پڑا اور اگلی صبح میں نے تہران کے لئے ایک طویل مسافت کا آغاز کیا۔ جب میں تہران میں داخل ہوا اس وقت صبح طلوع ہو رہی تھی مگر تہران پوری طرح "اندھیروں" میں ڈوبا ہوا تھا!

تہران میں میرا ایک روزہ قیام بلھوار الزبتھ پر واقع ایمپائر ہوٹل میں تھا جس کا شمار یہاں کے معقول ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ ہوٹل کے بل میں غالباً وہ گونگی خادمہ بھی شامل تھی جو بار بار کمرے میں آتی اور اشاروں کنایوں سے کہتی کہ کوئی بھی خدمت ہو، ارشاد فرمائیں، اس کی اس تابعداری کی وجہ سے میری کیفیت الہ دین کے چراغ کے مالک اس شریف آدمی جیسی ہو گئی جس کا جن ہر تھوڑی دیر بعد حاضر ہوتا اور "کیا حکم ہے میرے آقا؟" کہتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا، اس شریف آدمی کو جتنے کام یاد تھے، وہ اس نے کہہ دیئے لیکن جب اس نے دیکھا کہ جن کی طلب پوری نہیں ہو رہی تو اس نے کیا حکم ہے میرے آقا؟ کے جواب میں جن کو حکم دیا کہ تاحکم ثانی تم یہ سیڑھیاں چڑھتے اور اترتے رہو۔ کچھ اسی قسم کا حکم میں نے بھی اس گونگی خادمہ کو دیا یعنی میرے پاس جتنے بھی دھلے یا ان دھلے کپڑے تھے، وہ اس کے سامنے ڈھیر کر دیئے کہ میری واپسی تک انہیں

دھونے کے بعد استری کرواور پھر تہہ کر کے میرے کمرے میں رکھ جاؤ۔

اور جب میں ان ہدایات سے فارغ ہوا تو مجھے یاد آیا کہ امریکہ جاتے ہوئے تہران میں قیام کے دوران منور نے مجھے یہاں ڈائریکٹر جنرل تعلیمات سے متعارف کرایا تھا۔ میں نے ڈائری میں اس کا نمبر تلاش کیا اس کے لہجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ تہران میں میری موجودگی سے اسے مسرت ہوئی ہے، اس نے مجھے شام کو ایک کلب میں کھانے پر مدعو کیا، ابھی شام ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے میں نے سوچا کیوں نہ یہ لمحے بلا مقصد آوارہ گردی میں صرف کیے جائیں، چنانچہ شوق آوارگی مجھے تہران کی سڑکوں پر لے آیا!

یہ تہران ویسا ہی تھا جیسا میں اسے ڈیڑھ سال قبل چھوڑ کر گیا تھا۔ قدم قدم پر شراب کی دکانیں تھیں "آب جو" (بیئر) تولسی کی طرح بک رہی تھی۔ فٹ پاتھ عریاں رسالوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مغربی لباس میں ملبوس لڑکیاں سڑکوں پر ہرل ہرل پھر رہی تھیں۔ اپنے بوائے فرینڈ کے سینے پر سر رکھے وہ دنیاومافیہا سے بے خبر نظر آتی تھیں۔ اس تہران میں طوائفیں اور ان کے دلال بھی بھرے ہوئے تھے۔ یہ طوائفیں ارض روم کی طرح پنجروں میں بے لباس بھی بیٹھی تھیں اور سڑکوں پر بھی گاہکوں کو تلاش کرتی پھرتی تھیں۔ مجھے اس معاشرے کے مہذب اور ترقی یافتہ ہونے میں شبہ ہے جہاں عورت کی ذلت کو قانونی تحفظ حاصل ہو، چنانچہ میرے لئے ان ملکوں کو مہذب اور ترقی یافتہ تسلیم کرنا ہمیشہ سے مشکل رہا ہے جہاں کے مرد حکمران عورت کو آزادی کا بہانہ دے کر اسے نائٹ کلبوں کے اسٹیج پر ہزاروں مردوں کے سامنے برہنہ ہونے کی آزادی فراہم کرتے ہیں۔ سیٹیاں بجاتے ہوئے مردوں کے جم غفیر کے سامنے عورت اور مرد کے تعلق کو خلوت سے جلوت میں تبدیل کرتے ہیں، کتوں، خنزیروں اور گدھوں کے ساتھ ان کی محبت دکھاتے ہیں...... تہران بھی اس لحاظ سے دوسرے بہت سے شہروں کی طرح ایک مہذب اور ترقی یافتہ شہر تھا۔ تقریباً ایک میل کی واک کے دوران پانچ چھ دلال سیٹیاں بجا



کر مجھے اپنی طرف متوجہ کر چکے تھے۔ ایک ریستوران میں قہوہ پیتے ہوئے جب سامنے والی میز پر بیٹھی ایک لڑکی اپنا کپ اٹھا کر میرے برابر میں آن کر بیٹھ گئی تو مجھے اس کی بے باکی سے شبہ ہوا کہ شاید وہ بھی پیشہ ور ہے، مگر ایسا نہیں تھا، اسے صرف غیر ملکیوں سے ملنے کا شوق تھا۔

"تم پاکستانی ہو؟" اس تیکھے نین نقش والی لڑکی نے پورے چہرے کو مسکراہٹ میں تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ یہ سوال اس نے فارسی میں کیا تھا بلکہ جدید فارسی میں کیا تھا، چنانچہ اس کے الفاظ یہ تھے۔

"شما مال پاکستان است؟" اس "مال پاکستان" پر میں نے اپنی ہنسی بمشکل روکی اور کہا "بلے...... دشما مال ایران است؟" اس نے میرے "مال ایران" کو ایرانی ہونے کے معنوں ہی میں لیا اور بالوں کو ادائے خاص سے جھٹکتے ہوئے کہا "بلے بلے"۔

اب میری فارسی "ریزرو" کی سوئی پر تھی چنانچہ میں نے مناسب سمجھا کہ ختم ہونے سے پہلے اس کا نام پوچھ لیا جائے۔

"نام شما چیست؟"

"آمنا!" آمنہ نے ایرانی لہجے کے مطابق "آمنہ کو تشدید کے ساتھ ادا کیا!

"نام شما؟"

"وصدقنا!" میں نے جواب دیا۔

مسلمان ہونے میں ایک فائدہ یہ ہوا کہ آمنا و صدقنا" والی بات اسے سمجھ آ گئی چنانچہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے بعد اس نے کھڑ کھڑ ہنسنے کے دوران جو کچھ کہا اس میں سے مجھے "خیلے خوب" والی بات ہی سمجھ آئی!

میں نے چھٹی جماعت میں فارسی کی کتاب میں ایک جملہ پڑھا تھا "ایں تفنگ دو لولہ است!" (یہ دونالی بندوق ہے) میں نے اپنی فارسی کی استعداد ظاہر کرنے کے لئے اس کی

خوبصورت آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "ایں تفنگ دولولہ است!" میری اس تعریف پر وہ شرما گئی یا ممکن ہے اشارہ غلط ہو گیا ہو!

مجھے آمنہ کی صورت میں ایک گائیڈ تہران میں بھی مل گیا، وہ مجھے اپنے ساتھ لیے لیے پھرتی رہی، اپنے گھر بھی لے گئی۔ جب مجھے وہ واپس ہوٹل چھوڑنے کے لئے گھر سے نکلی تو ایک کار ہمارے پاس آکر رک گئی، صاحب کار کے پوچھنے پر آمنہ نے اسے بتایا کہ ہمیں ایمپائر ہوٹل جانا ہے، اس مرد شریف نے کار کا دروازہ کھولا اور کہا "بفرمائید!" (تشریف رکھیئے!)

جب ہم ہوٹل کے قریب اترے تو آمنہ نے پرس میں سے کچھ پیسے نکال کر اسے دیئے جو اس نے بہ عجلت اپنی جیب میں ڈال لئے۔ پتہ چلا کہ یہاں شرفاء پٹرول کا خرچ پورا کرنے کے لئے لوگوں کو لفٹ دیتے ہیں اور اس کا معاوضہ پورے انشراح صدر کے ساتھ قبول کرتے ہیں!

میں نے جونہی کمرے میں قدم رکھا، گونگی خادمہ دروازہ ناک کر کے کمرے میں داخل ہو گئی اور اشارے سے کہا "میرے لائق کوئی بھی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیں!" میں نے انگلی سے ایک اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ آپ تشریف لے جائیں، میں پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہوں!

ڈائریکٹر جنرل تعلیمات وقت مقررہ پر میرے کمرے میں موجود تھے، انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور کلب کی طرف چل دیئے۔ اس وقت پورا شہر روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ تاہم تہران جتنا برا ٹریفک میں نے صرف لاہور میں دیکھا ہے اور وہ بھی برانڈرتھ روڈ پر۔ کلب میں ڈنر کے بعد واپسی پر ڈائریکٹر جنرل تعلیمات پوری طرح دھت ہونے کی وجہ سے تہران کے ٹریفک کی روایات میں ایک نیا اضافہ کر رہے تھے۔ وہ پوری طرح ترنگ میں تھے اور با آواز بلند ایک پرسوز گیت گا رہے تھے۔ یہ بات انہوں نے مجھے خود بتائی



کہ جو گیت وہ گا رہے ہیں، وہ بہت پرسوز ہے!

جب میں ہوٹل کے دروازے پر پہنچا، اس وقت رات کی تاریکی چھٹ رہی تھی اور صبح کا اجالا طلوع ہو رہا تھا۔ تاریکیاں جب بہت بڑھ جائیں تو روشنی ان کی جگہ ضرور لیتی ہے!

# امامؒ کے روضے پر

ٹرین کے تقریباً چار گھنٹے کے سفر کے بعد میں مشہد میں تھا۔ یہاں میرا قیام نادری ہوٹل میں تھا جو کرائے کے لحاظ سے سستا مگر عمدہ ہوٹل تھا۔ تہران اور مشہد کے تہذیبی رویوں میں اتنا فرق تھا کہ میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ تہران اور مشہد ایک ہی ملک کے دو شہر ہیں۔ یہ تجربہ ایک کلچر سے دوسرے کلچر میں داخل ہونے کا تھا۔ یہاں عورتیں سر سے لے کر پاؤں تک چادر میں ملبوس تھیں، البتہ ان کے چہرے کھلے تھے۔ سرخ و سفید رنگ، خوبصورت خد و خال اور سیاہ آنکھیں۔

تم ناحق ناراض ہوئے ہو ورنہ میخانے کا پتہ
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

مگر یہ شہر اس قسم کے رستے پوچھنے کے لئے مناسب شہر نہیں تھا۔ یہاں فضا میں ایک پاکیزگی کا احساس ہوتا تھا مجھے احساس ہوا کہ اسلام اس شہر کے مکینوں کی روحوں میں رچا بسا ہے۔ اس شہر پر رضا شاہ پہلوی کے ایران کی کوئی پرچھائیں موجود نہیں تھی بلکہ یہاں ایک اور شہنشاہ کی حکمرانی تھی، جن کا نام حضرت امام رضاؒ تھا۔ ان کے روضے پر حاضری دی تو یوں محسوس ہوا جیسے روشنی کا ہالہ ہے، میں جس کی پناہ میں ہوں۔



# راسپوٹین

حضرت امام رضاؒ کے روضے پر حاضری دینے اور شہر کا ایک چکر لگانے کے بعد میں نے ستانے کے لئے ایک قہوہ خانے کا انتخاب کیا۔ یہ قہوہ خانہ بالکل ویسا تھا جیسے قہوہ خانے کراچی میں ایرانیوں کے ہیں۔ ویٹر ایک کپ میں قہوہ اور ایک پلیٹ میں مصری کی ڈلیاں رکھ گیا جو یہاں چینی کی جگہ استعمال ہوتی ہیں۔ میں مصری کی ایک ڈلی منہ میں رکھتا تھا اور ایک گھونٹ قہوے کا لیتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہوٹل کا مالک مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا ہے، تھوڑی دیر بعد ویٹر میرے پاس آیا اور اس نے مصری کی ڈلیوں والی پلیٹ غصے سے میرے سامنے سے اٹھائی اور ایک دوسری میز پر رکھ دی۔ اس صورت حال پر مجھے خاصی پریشانی ہوئی اور یہ جان کر میں مزید پریشان ہوا کہ قہوہ پینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دل کے بہلانے کو مصری کی ایک ڈلی منہ میں رکھی جائے اور قہوے کا پورا کپ اس ایک ڈلی کے بل بوتے پر پیا جائے، بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے پان خور ایک کلے میں گلوری رکھتے ہیں اور دوسرے کلے سے پانی، سیون اپ اور چائے وغیرہ پیتے رہتے ہیں بلکہ بعض ماہرین تو پان اور کھانا ایک ہی وقت میں کھانے کے فن کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں، جب کہ میرا حال اس پٹھان جیسا تھا جس نے ایک میٹھا پان خریدا اور اس کے لوازمات چٹ کر جانے کے بعد پان کا پتہ دکاندار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”خوچہ ایک روپے کی مٹھائی اور دو!“

میں ابھی اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کا ”تجزیہ“ کرنے میں مشغول تھا کہ گہری

سانولی رنگت کے حامل ایک عالم جن کے چہرے پر مناسب سائز کی سیاہ رنگ کی داڑھی تھی، سر پر ٹوپی، ٹخنوں سے اونچی شلوار اور کاندھے پر رومال رکھے ہوئے تھے ایک دوسری میز سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ان کے ساتھ ایک انتہائی معمر بزرگ بھی تھے، جن کی بینائی تقریباً ختم ہو چکی تھی!

"میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں" مولانا نے انتہائی شائستہ لہجے اور شستہ اردو میں کہا!

میں نے گرم جوشی سے انہیں تشریف رکھنے کو کہا، جس پر مولانا اور ان کے ہمراہی بزرگ برابر والی کرسیوں پر بیٹھ گئے!

"آپ چہرے مہرے سے پاکستانی لگتے ہیں؟" مولانا نے فرمایا!

"جی ہاں! آپ کا اندازہ درست ہے!"

"میرا نام عباس ہے، میں بھی پاکستانی ہوں، کراچی کی ایک مسجد میں خطیب ہوں"!

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی" میں نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا "میرا تعلق بھی علماء کے گھرانے سے ہے۔

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ" مولانا نے کہا "یہ تو ایک سعادت ہے کہ آپ علمی اور دینی خانوادے کے فرد ہیں!۔

"آپ مشہد میں کیسے تشریف لائے؟" میں نے پوچھا

"میں زیارتوں کے لئے گھر سے نکلا تھا" مولانا نے بتایا "یہ بزرگ میرے ایک ارادت مند کے والد ماجد ہیں: انہوں نے مجھ سے کہا کہ انہیں بھی ساتھ لے جائیں، ان بیچاروں کو نہ سنائی دیتا ہے نہ دکھائی دیتا ہے، چنانچہ میں انہیں اپنی رہنمائی میں زیارتیں کرانے کے بعد واپس پاکستان جا رہا ہوں!"

"میں بھی یہاں سے پاکستان ہی جا رہا ہوں۔ زاہدان سے کوئٹہ کے لئے ٹرین لوں گا!"



"یہ تو بہت اچھی بات ہے، آپ کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع ملے گا کیونکہ میرا ارادہ بھی زاہدان ایکسپریس سے واپس پاکستان جانے کا ہے، ویسے آپ آ کہاں سے رہے ہیں؟"

"میں امریکہ سے آ رہا ہوں"

"تو کیا آپ مستقل پاکستان واپس جا رہے ہیں؟"

"جی ہاں"

"وہاں جا کر کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں وہاں اخبار میں سب ایڈیٹر ہوں، واپس پہنچ کر دوبارہ ملازمت جائن کر لوں گا!"

"بہت خوب! تو گویا آپ کا تعلق صحافت سے ہے، پھر تو آپ ارشاد راؤ کو جانتے ہوں گے؟"

"ہاں ارشاد راؤ یونیورسٹی کے زمانے سے میرا بہت عزیز دوست ہے انتہائی پیارا آدمی ہے، مگر آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟" مجھے مولانا کی زبانی اپنے دوست کا ذکر سن کر خوشی ہوئی تھی!

"میرے ان سے بہت اچھے مراسم ہیں۔ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے، کبھی ملاقات ہو تو ان سے میرا ذکر کریں!"

"ضرور ذکر کروں گا، مگر ایک بات بتائیں اس نے ایک پرچہ "الفتح" کے نام سے نکالا تھا اور ایک خط کے ذریعے مجھے اطلاع دی تھی کہ پرچے پر تمہارا نام نمائندہ خصوصی۔ امریکہ کے طور پر لکھا گیا ہے۔ میں نے تو اس کے بعد پرچے کی شکل نہیں دیکھی، یہ پرچہ کیسا جا رہا ہے؟"

یہ سن کر مولانا کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی مسرت نمودار ہوئی۔ انہوں نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا "آپ تو اپنے ہی آدمی نکلے۔ "الفتح" نے اسلام

پسندوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے اور اس کے نتیجے میں خدا کے فضل و کرم سے کمیونسٹوں کی ایک بڑی تعداد انتخابات میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہوگئی ہے!"

مجھے پیپلز پارٹی کی کامیابی پر حیرت نہیں تھی۔ پارٹی میں کمیونسٹوں کے گھس جانے پر میں حیران نہیں تھا مگر میں پریشانی کے عالم میں ان مولانا کو دیکھ رہا تھا جن کے چہرے پر اب مجھے ایک اور چہرہ سجا ہوا لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا اس آدمی کو مزید "قریب" سے دیکھنا چاہئے! چنانچہ میں نے بھی مولانا کے ہاتھ کو گرم جوشی سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"حضرت! آپ نے تو اپنی داڑھی سے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں تو تھوڑی دیر بعد آپ سے اجازت طلب کرنے والا تھا مگر......"

"پیارے یہ ڈاڑھی واڑھی تو سب فراڈ ہے صرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے ہے ورنہ میں تو سرے سے مذہب پر یقین ہی نہیں رکھتا!"

مولانا ایک دم مجھ سے فری ہوگئے تھے اور یوں میرا کام اور آسان ہوگیا تھا؟

"بہت خوب" میں نے اس منافق شخص سے پوری طرح آگاہ ہونے کے لئے جعلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "ایک طرف مذہب پر یقین نہیں ہے دوسری طرف آپ زیارتوں کے لئے چلے آئے، یہ کیا چکر ہے؟"

"چکر کیا ہونا ہے، یہ بڈھا بیٹھا ہے۔ مولانا نے بزرگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میرے ایک مرید کا باپ ہے، سارا خرچ اسی نے ادا کیا ہے' میں نے سوچا چلو مفت کی سیر ہو جائے گی۔ میں کسی کلب میں چلا جاتا تھا جہاں بیلے ڈانس دیکھتا تھا اور بعد میں اس بڈھے کو اس کلب کے گرد ایک پھیرا لگا دیتا تھا کہ لو زیارت کرلو۔ یہ بے وقوف کلب کی دیواروں کو چومتا تھا اور اس پر رقت طاری ہو جاتی تھی!" یہ کہتے ہوئے مذہب کے نام پر انسانوں کو دھوکا دینے والے اس شیطان نما انسان نے ہنسنا شروع کردیا۔ اس کی ہنسی میں میں نے اپنی ہنسی شامل کردی اور ان لمحوں میں میں نے خود کو اس راسپوٹین کا بغل بچہ



محسوس کیا!

راسپوٹین اب مجھ سے کھلتا جارہا تھا "میں اخباروں کی فائل ساتھ لایا ہوا ہوں، زاہدان سے کوئٹہ جاتے ہوئے آپ کو دکھاؤں گا۔ اس پر بڑے بڑے کامریڈوں کے ساتھ میری تصویریں چھپی ہیں۔ جب ان پر اعتراض ہوتا تھا کہ آپ اسلام دشمن ہیں تو پریس کانفرنس میں وہ مجھے آگے کردیتے تھے اور میں بتاتا تھا کہ کمیونزم اسلام کے منافی نہیں ہے۔ میں نے انتخابات کے دوران بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کیا۔ کراچی کے اخبارات میں میرے بیانات کی چھ چھ کالمی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ شام کو مے نوشی کی محفلیں ہوتی تھیں، رات کو خطاب ہوتا تھا۔ یہ مرید بھی بڑے احمق ہوتے ہیں میرا جلال دیکھنا ہو تو کبھی میری مسجد میں آئیں میں نے سبز رنگ کا عمامہ باندھا ہوتا ہے اور مریدوں کے حلقے میں بیٹھا ہوتا ہوں جو میرے ہاتھ پاؤں چوم رہے ہوتے ہیں!"

مجھے اس شخص سے خوف سا آنے لگا تھا۔ ایک بات بتائیں میں نے پوچھا "یہ جو آپ نے بہروپ دھارا ہوا ہے، اس سے آپ کو الجھن نہیں ہوتی؟"

یہ سن کر راسپوٹین نے قہقہہ لگایا اور کہا "الجھن تو تب محسوس ہو اگر انسان جنت دوزخ پر یقین رکھتا ہو، میں تو سرے سے خدا ہی کو نہیں مانتا۔ میں نے صرف یہ چیک کرنے کے لئے کہ خدا ہے کہ نہیں، ایک دفعہ مسجد کی محراب کو...... آلودہ کیا کہ اگر خدا ہے تو مجھے اس کی سزا ملے گی...... لیکن خدا ہوتا تو مجھے کچھ ہوتا، دیکھ لیں اس واقعے کو کئی سال گزرنے کے بعد بھی آپ کے سامنے بیٹھا ہوں!"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے بجلی کے شاک دیئے جارہے ہوں!

"تو کیا آپ نے جو ایک مذہبی آدمی کا روپ دھارا ہوا ہے یہ کمیونزم کی ترویج کے لئے ہے؟" میں نے راسپوٹین سے باکراہ پوچھا۔ مجھے اب اس کے جسم سے بدبو بھبھو کے اٹھتے محسوس ہو رہے تھے۔

"کیمونزم؟" راسپوٹین نے بھرپور قہقہہ لگایا "میں کیمونزم پر لعنت بھیجتا ہوں۔ کھاؤ پیو عیش کرو جو ازم تمہیں یہ سب کچھ دے اس سے بہتر ازم کوئی نہیں ہے"۔

زاہدان سے کوئٹہ جاتے ہوئے ٹرین ایک اسٹیشن پر گھنٹوں کھڑی رہی تو راسپوٹین نے ڈبے میں بور ہوتے مسافروں کو مخاطب کیا اور گلا کھنکار کر تقریر کے لئے پر تولے:

**"نحمد و نصلی علیٰ رسوله الکریم، اما بعد......"**

اور تقریر کے اختتام پر کچھ نئے مرید اس راسپوٹین کے ہاتھوں کو بوسہ دے رہے تھے۔



# اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے؟

زاہدان ایکسپریس شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" سے کم نہ تھی رستے میں کسی لق و دق صحرا میں ستانے کے لئے کھڑی ہو جاتی اور

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے

کے مصداق پھر "اٹھنے" کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ لیکن جب یہ ٹرین پاکستان کے علاقے میں داخل ہوئی تو میں نے اس کی ساری خطائیں معاف کر دیں بلکہ شدید جذباتی کیفیت میں اس کی گندی مندی بوگیوں کو چومنا شروع کر دیا۔ کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر وہی خستہ حال قلی تھے، پریشان حال مسافر تھے۔ بدنظمی تھی، گندگی تھی مگر میں اپنے وطن واپس آرہا تھا جس کی ساری خوبصورتیاں اور بدصورتیاں میری تھیں۔ ماں اگر میلی کچیلی ہو اور اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوں، تو اسے چھوڑ کر الزبتھ ٹیلر کو ماں نہیں بنایا جا سکتا!

لاہور جانے کے لئے میں نے قریبی گاڑی کا پتہ کیا اور پھر ٹکٹ لے کر ٹرین کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ میں نے گھر والوں کو اپنی آمد سے مطلع نہیں کیا تھا اور نہ اپنے کسی دوست کو اطلاع دی تھی۔ میں انہیں اچانک خوشی دینا چاہتا تھا چنانچہ جب میں لاہور ریلوے اسٹیشن پر اترا تو میرے عزیز و اقارب میں سے کوئی میرے استقبال کے لئے موجود نہ تھا لیکن وہاں جتنے چہرے تھے وہ سب میرے اپنے تھے مجھے لگتا تھا جیسے پلیٹ فارم پر موجود سب لوگ میرے استقبال کے لئے آئے ہوئے ہیں، یہ سب میرے دوست ہیں، یہ سب میرے اپنے ہیں، انہیں دیکھ کر میری آنکھیں خوشی سے نم ہو گئیں۔

لاہور ریلوے اسٹیشن سے ماڈل ٹاؤن کی طرف جاتے ہوئے میں بچوں کی طرح کھڑکی

سے سر باہر نکالے ریڑھیوں، تانگوں، گڈوں، سائیکلوں، سکوٹروں، بھینسوں اور انسانوں کے بھنور کو محویت سے دیکھنے میں مشغول تھا۔ دیواریں اشتہاروں پر تھیں قوت مردمی کی بحالی کے لئے، سوزاک و آتشک کے علاج کے لئے، خارش دور کرنے کے لئے نیز قسمت کا حال وغیرہ جاننے کے لئے، بہت سے نجومیوں کے پتے درج تھے اکثر جگہوں پر لکھا تھا "دیکھو گدھا پیشاب کر رہا ہے"۔ یہاں جلسوں کے اعلانات تھے، جلوسوں کی اپیلیں تھیں، آمریت مردہ باد تھا، عرس تھے اور منٹو پارک میں ہونے والے شاہی دنگل کا پوسٹر تھا!...... اور ان سب عبارتوں میں چھپی ہوئی ایک تحریر تھی، "لوگو! میں وہ صبح ہوں جس نے تمہاری زندگیوں میں طلوع ہونا ہے۔ تم رات کے اندھیروں سے اپنی جنگ جاری رکھنا"

ٹیکسی جامع مسجد اے بلاک کے مین گیٹ میں سے اندر داخل ہوئی اور مسجد کا نصف راؤنڈ کاٹ کر میرے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تین چھوٹے کمروں، ایک برآمدے اور ایک برائے نام سے صحن پر مشتمل ایک مختصر سا گھر جو ہماری ملکیت بھی نہیں تھا۔ جس میں کوئی ایئر کنڈیشنر نہیں تھا، نہ ٹیلی ویژن، نہ فریج نہ ٹیلی فون نہ سوئمنگ پول۔ اس گھر کے ساتھ کوئی گیراج بھی نہ تھا کہ اس گھر کے مکینوں کے پاس کوئی کار نہیں تھی۔ لیکن یہ وہ گھر تھا جس میں میری والدہ مرحومہ رہتی تھی اور اب میرے والد اور بھائی بہنوں کا مسکن تھا اور یوں اس گھر کی بے سروسامانی کے مقابلے میں امریکہ کی ساری آسائشیں ہیچ تھیں۔

دروازہ اندر سے بند تھا، میں نے ہلکے سے ناک کیا۔

"کون؟" یہ اباجی کی آواز تھی

"شہزادہ" میری آواز رندھ گئی۔

"کڑیو! عطاء الحق آیا ہے!" اباجی نے خوشی سے کپکپاتی آواز میں ہمیشہ کی طرح میرا پورا نام لیتے ہوئے میری بہنوں کو میری آمد کی اطلاع دی!



بہنوں نے اچانک مجھے اپنے سامنے پایا تو فرط مسرت سے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ اباجی نے پیار سے میرے گالوں کو تھپتھپایا اور کہا "تم نے دنیا دیکھنے کا شوق پورا کر لیا مگر ان دو برسوں میں میں مزید بوڑھا ہو گیا ہوں" اور پھر انہوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"میں نے بلیو رنگ کی جین اور کاٹن کی ہلکے نیلے رنگ کی ایک کھلی سی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ سر کے بال اور قلمیں بڑھی ہوئی تھیں۔ اباجی نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور کہا "میں نائی لے کر آرہا ہوں، وہ استرے سے تمہاری ٹنڈ کرے گا اور یہ کیا تم نے ہپیوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ اٹھو اندر جا کر پہلے کپڑے تبدیل کرو اور دیکھو اذان ہو گئی ہے وضو کر کے سیدھے مسجد پہنچو اور اگلی صف میں کھڑے ہونا تاکہ میں تمہیں دیکھ سکوں!"

"شام کو سب رشتے دار میرے گرد ہار بنا کر بیٹھے تھے۔ میری چھوٹی بہن نے میری گردن میں اپنے بازو حمائل کئے اور کہا "بھائی جان آپ نے امریکہ جاتے ہوئے بہنوں سے ایک وعدہ کیا تھا"؟

"کون سا وعدہ؟"

"یہی کہ آپ وہاں کسی میم سے شادی نہیں کریں گے؟"

"میں نے وہ وعدہ نبھایا ہے!"

"سچ؟"

"ہاں"!

"تو اب ہماری ایک اور بات مانیں!"

"وہ کیا؟"

"اب فوراً شادی کرالیں"

"منظور۔ لڑکی کہاں ہے؟"

"وہ تو ہم ایک ہفتے میں ڈھونڈ لیں گے۔ ویسے آپ بتائیں آپ کہاں شادی کرانا چاہتے

ہیں؟"

"ہن جتھے مرضی کردیو" (اب جہاں جی چاہے کردو!) میں نے ہنستے ہوئے کہااور صحن میں بچھی بان کی چارپائی پر آکر لیٹ گیا، جہاں تاروں بھرا آسمان میری آنکھوں کے سامنے تھا!۔

---